تالیف
مولانا تقی الدین ندوی مظاہری
مقدمہ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

محدثین عظام رحمۃ اللہ

اور

اُن کے علمی کارنامے

مجلس نشریاتِ اسلام ۱-کے-۳-ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ترکتُ فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسّکتم بہما کتاب اللہِ وسُنّۃ رسولہ (رواہ مالکؒ فی المؤطا)

مُحدّثینِ عظام

اور

ان کے علمی کارنامے

ائمہؒ اربعہ وارباب صحاح ستّہ اور امام طحاویؒ کا تحقیقی تذکرہ، تاریخ تدوین حدیث اور جمع حدیث کے لئے ان کی کوششوں کا ذکر۔

اُن کی تصنیفات پر مفصل وسیر حاصل تبصرہ

مؤلفہ:

مولانا تقی الدّین صاحب ندوی مظاہری

سابق استاذ حدیث، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۵ کراچی ۱۸

جملہ حقوق طباعت و اشاعت پاکستان میں
بحق فضل ربی ندوی
محفوظ ہیں

نام کتاب ——— محدثین عظامؒ اور ان کے علمی کارنامے

مؤلف ——— تقی الدین ندوی مظاہری

کتابت ——— عبدالحفیظ

[illegible] ——— شکیل پرنٹنگ پریس کراچی

طابع و ناشر:

فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام

۱- کے - ۳ - ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱

کراچی ۱۸

فہرست مضامین محدثین عظام

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
۱	رائے گرامی حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ	۱۳
۲	مقدمہ از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ	۱۴
۳	حرف آغاز از مؤلف	۲۰
۴	حدیث کی تعریف	۲۵
۵	دین میں حدیث وسنت کا مقام	۲۵
۶	عام تاریخی ذخیروں سے فن حدیث کے امتیازات	۲۹
۷	صحابہؓ کرام کی تحصیل سنت کی کیفیت	۳۴
۸	طلب حدیث کیلئے صحابہ کی رحلت	۳۶
۹	روایت حدیث میں صحابہؓ کا طرز عمل	۳۹
۱۰	حضرت عمرؓ کی کثرت روایت سے منع کرنے کی مصلحت۔	۴۰
۱۱	کیا قبول حدیث کے لئے صحابہؓ نے مزید شرائط مقرر کئے تھے۔	۴۲
۱۲	اخبار آحاد کا درجہ	۴۴
۱۳	کتابت حدیث	۴۵
۱۴	خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا احکام وہدایات قلمبند کروانا	۴۸
۱۵	صحابہؓ کرام اور کتابت حدیث	۴۹
۱۶	عہد نبوی کا تحریری سرمایہ	۵۲
۱۷	تابعین اور کتابت حدیث	۵۴
۱۸	تدوین حدیث	۵۸
۱۹	ائمہ اربعہ اور تدوین حدیث	۶۲
	امام ابو حنیفہؒ	
۲۰	نام ونسب	۶۵
۲۱	سکونت	۶۵
۲۲	تحصیل علم	۶۶
۲۳	حرمین وغیرہ کا سفر	۶۷
۲۴	تلامذہ	۶۸
۲۵	زہد وتقوے	۶۹

نمبر شمار	موضوع	صفحہ	نمبر شمار	موضوع	صفحہ
۲۶	امام صاحبؒ کی ایک اہم فضیلت	۶۹	۴۲	شیوخ واساتذہ	۹۱
۲۷	ذکاوت وذہانت	۷۰	۴۳	مجلس درس	۹۲
۲۸	امام صاحبؒ کا علمی مرتبہ	۷۰	۴۴	تلامذہ	۹۳
۲۹	امام صاحبؒ کی تابعیت کی بحث	۷۱	۴۵	فقہ مالکؒ	۹۳
۳۰	امام صاحبؒ وامام مالکؒ	۷۲	۴۶	امام صاحبؒ کے فضل وکمال کا اعتراف	۹۴
۳۱	مآخذ علم	۷۴	۴۷	اخلاق وعادات	۹۴
۳۲	امام صاحبؒ کی وفات	۷۵	۴۸	وفات	۹۶
۳۳	امام ابوحنیفہؒ کا علم حدیث میں مقام	۷۶	۴۹	تصنیفات	۹۶
۳۴	روایت حدیث میں احتیاط	۷۸	۵۰	مؤطا	۹۶
۳۵	امام صاحبؒ کے شرائط	۷۸	۵۱	زمانہ تالیف	۹۷
۳۶	امام صاحبؒ پر ایک بے بنیاد الزام	۸۱	۵۲	وجہ تسمیہ	۹۸
۳۷	امام اعظمؒ اور فن جرح وتعدیل	۸۳	۵۳	مؤطا کی غرض	۹۹
۳۸	مسانید امام اعظمؒ	۸۳	۵۴	مؤطا کا کتب حدیث میں مقام	۱۰۰
	امام مالکؒ		۵۵	امام شافعیؒ کی شہادت	۱۰۱
۳۹	نام ونسب وولادت	۸۸	۵۶	مؤطا کی مقبولیت	۱۰۳
۴۰	مدینہ طیبہ	۸۹	۵۷	روایات کی تعداد	۱۰۴
۴۱	تحصیل علم	۹۰	۵۸	مؤطا کے مراسیل وبلاغات	۱۰۴

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
۵۹	مؤطا کی خصوصیات	۱۰۵
۶۰	مؤطا کے رُواۃ	۱۰۶
۶۱	شروح وتعلیقات	۱۰۹
	امام شافعیؒ	
۶۲	نام ونسب وابتدائی حالات	۱۱۲
۶۳	طلب علم	۱۱۳
۶۴	امام شافعیؒ پر دورِ ابتلاء	۱۱۴
۶۵	امام محمدؒ کے حلقہ میں شافعیؒ کی شرکت	۱۱۵
۶۶	رحلت علمی	۱۱۶
۶۷	امام شافعیؒ کا مصر میں قیام	۱۱۶
۶۸	وفات	۱۱۷
۶۹	شیوخ وتلامذہ	۱۱۷
۷۰	تصنیفات	۱۱۸
۷۱	مسند شافعیؒ	۱۱۸
۷۲	امام شافعیؒ و علم حدیث	۱۱۹

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
	امام احمدؒ بن حنبل	
۷۳	نام ونسب وابتدائی حالات	۱۲۲
۷۴	تحصیل علم	۱۲۳
۷۵	مجلس درس	۱۲۴
۷۶	زہد وتقوے	۱۲۴
۷۷	تواضع ومسکنت	۱۲۵
۷۸	شیوخ وتلامذہ	۱۲۵
۷۹	وفات کا حال	۱۲۶
۸۰	امام احمدؒ ابتلاء وامتحان میں	۱۲۶
۸۱	تصنیفات	۱۲۸
۸۲	مسانید کی تصنیف کا آغاز	۱۲۸
۸۳	مسانید وابواب کا فرق	۱۲۹
۸۴	مسانید احمد کی تالیف	۱۳۰
۸۵	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۳۱
۸۶	مسند کی ترتیب	۱۳۱
۸۷	تعداد روایات	۱۳۲
۸۸	زوائد مسند	۱۳۲

نمبر شمار	موضوع	صفحہ	نمبر شمار	موضوع	صفحہ
۸۹	مسند میں تخریج روایات کی شرط	۱۳۳	۱۰۴	تصنیفات	۱۴۷
۹۰	مسند کی بعض خصوصیات	۱۳۴	۱۰۵	الجامع الصحیح	۱۴۷
۹۱	مسند پر ابن جوزی وغیرہ کے اعتراضات	۱۳۴	۱۰۶	وجہ تالیف	۱۴۸
	امام بخاریؒ		۱۰۷	وجہ تسمیہ	۱۴۹
۹۲	نام ونسب	۱۳۶	۱۰۸	اس تصنیف میں اہتمام	۱۴۹
۹۳	پیدائش اور ابتدائی حالات	۱۳۷	۱۰۹	الجامع الصحیح کی مقبولیت	۱۵۰
۹۴	سماع حدیث کے لئے سفر	۱۳۷	۱۱۰	جامع صحیح کا مقصد ومقصود اعظم	۱۵۱
۹۵	اساتذہ وشیوخ	۱۳۸	۱۱۱	امام بخاریؒ کے تخریج کے شرائط	۱۵۲
۹۶	تلامذہ	۱۳۹	۱۱۲	کتب احادیث میں جامع بخاری کا مقام	۱۵۳
۹۷	غیر معمولی قوتِ حافظہ	۱۴۰	۱۱۳	تعداد روایات	۱۵۵
۹۸	امام بخاریؒ کا زہد وتقوے	۱۴۱	۱۱۴	جامع صحیح کی خصوصیات	۱۵۵
۹۹	شیوخ ومعاصرین کا اعتراف	۱۴۲	۱۱۵	صحیح بخاری کے تراجم الواب	۱۵۸
۱۰۰	امام صاحب پر دورِ ابتلا وآزمائش	۱۴۳	۱۱۶	امام دارقطنی وغیرہ کے شبہات	۱۵۹
۱۰۱	مسئلہ خلق قرآن پر امام صاحبؒ کا	۱۴۴	۱۱۷	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۶۰
	نقطۂ نظر		۱۱۸	امام اعظم ابوحنیفہؒ سے روایت نہ	۱۶۱
۱۰۲	وفات	۱۴۵		کرنے کی وجہ	
۱۰۳	امام بخاریؒ کا مسلک	۱۴۶	۱۱۹	جامع صحیح کے شروح وحواشی	۱۶۲

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
	امام مسلمؒ	
۱۲۰	نام ونسب	۱۶۷
۱۲۱	سماع حدیث کے لئے سفر	۱۶۷
۱۲۲	شیوخ وتلامذہ	۱۶۸
۱۲۳	امام موصوفؒ کے فضل کا اعتراف	۱۶۹
۱۲۴	اخلاق وعادات زہد وتقویٰ	۱۶۹
۱۲۵	امام صاحبؒ کا مسلک	۱۷۰
۱۲۶	وفات کا حال	۱۷۱
۱۲۷	تصنیفات	۱۷۲
۱۲۸	الجامع الصحیح للامام مسلمؒ	۱۷۲
۱۲۹	وجہ تسمیہ	۱۷۳
۱۳۰	غرض تصنیف	۱۷۳
۱۳۱	تعداد روایات	۱۷۴
۱۳۲	تراجم ابواب	۱۷۵
۱۳۳	زمانۂ تصنیف	۱۷۵
۱۳۴	امام صاحبؒ کا اپنی تصنیف میں اہتمام	۱۷۵
۱۳۵	صحیح مسلم کی خصوصیات	۱۷۶
۱۳۶	صحاح ستہ میں صحیح مسلم کا مقام	۱۷۹
۱۳۷	غلط فہمی کا ازالہ	۱۸۰
۱۳۸	تخریج روایت کے شرائط	۱۸۳
۱۳۹	صحیح مسلم کا سلسلۂ روایت	۱۸۴
۱۴۰	صحیح مسلم پر بعض شبہات	۱۸۴
۱۴۱	صحیح مسلم کی شروح	۱۸۶
	امام ابو داؤدؒ	
۱۴۲	نام ونسب	۱۸۹
۱۴۳	پیدائش ووفات	۱۹۰
۱۴۴	تحصیل علم کے لئے سفر	۱۹۰
۱۴۵	اساتذہ وشیوخ	۱۹۰
۱۴۶	تلامذہ	۱۹۱
۱۴۷	زہد وتقویٰ	۱۹۱
۱۴۸	امام موصوفؒ کے فضل کا اعتراف	۱۹۱
۱۴۹	ابو داؤدؒ کا مسلک	۱۹۲
۱۵۰	تصنیفات	۱۹۴
۱۵۱	سنن کا زمانہ تالیف	۱۹۴

نمبرشمار	موضوع	صفحہ	نمبرشمار	موضوع	صفحہ
۱۵۲	سنن ابوداؤد کی وجہ تالیف	۱۹۵	۱۶۷	تلامذہ	۲۱۵
۱۵۳	سنن کی مقبولیت	۱۹۶	۱۶۸	حافظہ	۲۱۵
۱۵۴	سنن ابی داؤد کا صحاح ستہ میں رتبہ	۱۹۷	۱۶۹	زہد وتقویٰ	۲۱۶
۱۵۵	تعلیم کے اعتبار سے صحاح ستہ کا مقام	۱۹۷	۱۷۰	تنبیہ	۲۱۶
۱۵۶	صحاح ستہ میں صحت کے لحاظ سے مقام	۱۹۸	۱۷۱	ایک مغالطہ کا ازالہ	۲۱۷
۱۵۷	سنن ابی داؤد کی خصوصیات	۲۰۰	۱۷۲	تصانیف	۲۱۷
۱۵۸	تعداد روایات	۲۰۳	۱۷۳	جامع الترمذی	۲۱۸
۱۵۹	صرف چار احادیث انسان کے دین	۲۰۳	۱۷۴	سنن ترمذی کے محاسن وفضائل	۲۱۸
	کے لئے کافی ہیں۔		۱۷۵	ترمذی کی غرض	۲۲۰
۱۶۰	ماسکت عنہ ابوداؤد کی حیثیت	۲۰۵	۱۷۶	ترمذی کا مسلک	۲۲۱
۱۶۱	سنن ابی داؤد پر ابن جوزی کی تنقید	۲۰۸	۱۷۷	امام ترمذیؒ کی جرح وتعدیل کی حیثیت	۲۲۲
۱۶۲	سنن کے نسخے	۲۰۹	۱۷۸	علامہ ابن حزم کی تنقید کا جواب	۲۲۴
۱۶۳	سنن ابی داؤد کی شروح	۲۱۰	۱۷۹	ملا علی قاری کا تسامح	۲۲۴
	امام ترمذیؒ		۱۸۰	جامع صحیح کی معمول بہا احادیث	۲۲۵
۱۶۴	نام ونسب	۲۱۲	۱۸۱	جامع ترمذی کی بعض کتابی خصوصیات	۲۲۶
۱۶۵	پیدائش ووفات	۲۱۲	۱۸۲	امام ترمذی کی بعض مشہور اصطلاحات	۲۳۱
۱۶۶	شیوخ	۲۱۳	۱۸۳	لفظ کراہیۃ وکراہۃ کا مفہوم	۲۳۳

نمبرشمار	موضوع	صفحہ	نمبرشمار	موضوع	صفحہ
۱۸۴	بعض اہل کوفہ سے کون لوگ مراد ہیں	۲۳۴	۲۰۰	سنن کی تالیف	۲۵۰
۱۸۵	جامع ترمذی پر علامہ ابن جوزی کی تنقید	۲۳۵	۲۰۱	سنن نسائی کی غرض	۲۵۱
۱۸۶	جامع ترمذی کی شروح	۲۳۶	۲۰۲	سنن کے محاسن وفضائل	۲۵۲
	امام نسائیؒ		۲۰۳	امام نسائی کے شرائط	۲۵۳
۱۸۷	نام ونسب	۲۳۸	۲۰۴	سنن نسائی کی ایک اہم خصوصیت	۲۵۵
۱۸۸	پیدائش وابتدائی حالات	۲۳۹	۲۰۵	سنن کے تراجم والابواب	۲۵۵
۱۸۹	سماع حدیث کے لئے سفر	۲۳۹	۲۰۶	امامؒ اعظم اور امام نسائی	۲۵۷
۱۹۰	شیوخ واساتذہ	۲۴۱	۲۰۷	ایک لطیفہ	۲۵۷
۱۹۱	تلامذہ	۲۴۱	۲۰۸	شروح وتعلیقات	۲۵۸
۱۹۲	امام نسائی کا زہد وتقوے	۲۴۲		**امام ابن ماجہؒ**	
۱۹۳	علماء ومعاصرین کا اعتراف	۲۴۳	۲۰۹	نام ونسب	۲۶۰
۱۹۴	امام نسائی پر دور ابتلا	۲۴۵	۲۱۰	پیدائش وابتدائی حالات	۲۶۱
۱۹۵	وفات	۲۴۵	۲۱۱	سماع حدیث کے لئے سفر	۲۶۱
۱۹۶	امام نسائی پر تشیع کا شبہہ غلط ہے	۲۴۶	۲۱۲	شیوخ وتلامذہ	۲۶۲
۱۹۷	امام نسائی کا مسلک	۲۴۷	۲۱۳	علماء کا اعتراف کمال	۲۶۲
۱۹۸	حلیہ شریف	۲۴۹	۲۱۴	مسلک	۲۶۳
۱۹۹	تصنیفات	۲۴۹	۲۱۵	وفات	۲۶۳

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
۲۱۶	تصنیفات	۲۶۴
۲۱۷	سنن ابن ماجہ اور اس کی خصوصیات	۲۶۴
۲۱۸	سنن ابن ماجہؒ کے متعلق امام ابوزرعہ کا ارشاد	۲۶۷
۲۱۹	سنن ابن ماجہؒ کا صحاح ستہ میں شمار	۲۶۸
۲۲۰	سنن ابن ماجہؒ کا صحاح ستہ میں مرتبہ	۲۷۰
۲۲۱	سنن ابن ماجہ کے متعلق ایک اہم غلط فہمی	۲۷۱
۲۲۲	تنبیہ	۲۷۲
۲۲۳	تعداد ابواب واحادیث	۲۷۳
۲۲۴	سلسلہ روایت	۲۷۳
۲۲۵	شروح ومتعلقات	۲۷۳
	امام طحاویؒ	
۲۲۶	نام ونسب	۲۷۶
۲۲۷	پیدائش ووفات	۲۷۶
۲۲۸	مصر	۲۷۷
۲۲۹	تحصیل علم	۲۷۸
۲۳۰	سماع حدیث کے لئے سفر	۲۷۹
۲۳۱	شیوخ واساتذہ	۲۸۰
۲۳۲	تلامذہ	۲۸۰
۲۳۳	علمی مرتبہ	۲۸۰
۲۳۴	فن جرح وتعدیل اور امام طحاویؒ	۲۸۱
۲۳۵	امام طحاویؒ کے کمالات کا اعتراف	۲۸۲
۲۳۶	امام طحاوی کے ناقدین	۲۸۳
۲۳۷	تصانیف	۲۸۳
۲۳۸	شرح معانی الآثار	۲۸۶
۲۳۹	معانی الآثار کا کتب حدیث میں مقام	۲۸۷
۲۴۰	معانی الآثار پر امام بیہقیؒ کے اعتراض کا جواب	۲۸۷
۲۴۱	معانی الآثار کی خصوصیات	۲۸۸
۲۴۲	شروح ومتعلقات	۲۸۹
۲۴۳	کتاب کے اہم مصادر ومراجع کی اجمالی فہرست	۲۹۲

اکابر علماء کی آراء

"محدثینؒ عظام" کے پہلے اڈیشن پر ملک و بیرونِ ملک کے اکابر علماء اور مجلات و جرائد نے مؤلف کی جو حوصلہ افزائی فرمائی، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پیرس سے اور مفتی محمود صاحب نے رنگون سے خطوط کے ذریعہ اظہار مسرت فرمایا، بالاختصار چند اکابر کی آراء کو نقل کیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی رائے گرامی۔

"کتاب اپنی جامعیت اور اپنی افادیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے، اس میں حجیت حدیث اور جدید فتنہ انکار حدیث و تضحیک حدیث کے جوابات بھی پوری طرح آ گئے ہیں، اور معروف و مشہور ائمہ حدیث کے علاوہ چاروں ائمہ فقہ اور امام طحاوی کی بھی خدمات کا بیان خاصی تفصیل سے آگیا ہے۔

مصنف بہ یک وقت ندوی بھی ہیں اور مظاہری بھی، اور ان کی اس دوگانہ حیثیت کی شاہدِ عدل ان کی یہ کتاب ہے، مظاہری تحقیقِ فن اور ندوی سلامت و متانت بیان۔ کتاب عالموں اور عامیوں دونوں کے حق میں مفید ثابت ہو گی۔ اور ہر دینی درسگاہ اور انگریزی کالج کے طلبہ کے ہاتھوں میں جانے کے قابل ہے۔" صدق جدید ۲۳ ستمبر ۱۹۶۷ء

"مؤلف اس کتاب کی تالیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

مولانا سعید احمد اکبر آبادی "برہان"

"پوری کتاب علمی و دینی معلومات کا خزانہ ہے، اور مغز ہی مغز ہے، مؤلف کی یہ پہلی علمی و تصنیفی کاوش پتہ دیتی ہے کہ وہ درس و تدریس کی مشغولیت میں بھی اس طرح کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔" مولانا قاضی اطہر مبارکپوری "انقلاب"

"یہ کتاب مؤلف نے بڑی محنت و جستجو سے لکھی ہے، زبان و بیان سلیس اور شگفتہ ہے"

مولانا ضیاء الدین اصلاحی "معارف"

"جس ضرورت کے پیش نظر فاضل مؤلف نے یہ کتاب مرتب کی ہے، اس کے لئے یہ مجموعہ یقیناً کارآمد و مفید ہے۔" "رسالہ زندگی"

"مولانا تقی الدین صاحب ندوی اس کتاب کی تالیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں، انہوں نے جرح کے مقابلہ میں تعدیل کی راہ اختیار فرمائی ہے، ائمہ حدیث پر جو اعتراضات وارد ہوئے ہیں، ان کو رفع کیا ہے، یا اس کی قابل قبول توجیہ و تاویل فرمائی ہے، کتاب بڑی محنت دیدہ ریزی اور دینی شغف کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، زبان و بیان میں سادگی پائی جاتی ہے۔"

"رسالہ فاران کراچی"

"یہ تالیف اہل علم کے لئے خصوصاً اور اہل ذوق کیلئے عام طور پر مفید اور نفع بخش ثابت ہوگی۔" "رسالہ دارالعلوم دیوبند"

حضرۃ الأستاذ
شیخ الحدیث مولانا محمّد زکریا صاحب قدس سرہٗ
کی
رائے گرامی

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہِ الکریم

عزیز محترم مولانا الحاج مولوی تقی الدین صاحب ندوی مدرس حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے متفرق علمی مضامین جو وقتاً فوقتاً رسائل میں شائع ہوتے رہے، اکثر سنتا رہا، ان کی کتاب "محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے" کے مضامین جو بعض رسائل میں شائع ہو رہے ہیں، اس سے بہت مسرت ہوئی، یہ ناکارہ دل سے دعا کرتا ہے، اللہ جل شانہٗ ان مضامین سے اہل علم کو زیادہ سے زیادہ متمتع فرمائے، اور مولانا موصوف کیلئے دارین کی ترقیات کا ذریعہ بنائے، مولانا موصوف کے علوم و فیوض سے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ متمتع فرمائے، اور کتاب کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے، اس ناکارہ کو اس قسم کے مضامین کی عادت نہیں، لیکن دعا سے دریغ نہیں، دل سے دعا کرتا ہوں۔ فقط۔

محمّد زکریا
مظاہر العلوم، سہارنپور
۸ رجمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ

مقدّمہ

از

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی

بِسمِ اللہ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمَ ۝

الحمد للہ رب العالمین، وَالصلوٰۃ والسّلام علےٰ سید

المرسلین محمد وّ آلہ وصحبہ اجمعین، ومن تبعھم

باحسان الیٰ یوم الدین

امّا بعد! میرے لئے یہ دوگونہ سعادت ومسّرت کا موقع ہے، کہ عزیز گرامی مولوی تقی الدین صاحب ندوی کی قابلِ قدر تصنیف "مُحدّثین عظام اوران کے علمی کارنامے" پر بطور پیش لفظ وتعارف کے چند سطریں لکھوں، دوگونہ سعادت ومسّرت اسلئے کہ یہ تصنیف ایک پاکیزہ مقصد کے ماتحت، اورایک نہایت اہم موضوع پر ہے، جس کی حوصلہ افزائی، قدرشناسی، اوراشاعت وتبلیغ دین کے ہراس خادم کے لئے جس کی زمانہ کے فتنوں پرنظرہے، موجبِ سعادت اورذخیرۂ آخرت ہے، ثانیاً اس لئے کہ مصنف عزیز کا تعلق دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بہت گہرا ہے، وہ اس درسگاہ کے فاضل بھی ہیں، اور وہیں حدیث کے درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں، بارکﷲ فی علمہ وشکرمساعیہ۔

یورپ کے مستشرقین، اوران کے مشرقی تلامذہ ومقلّدین کی ذہانت اورترک انتخاب

کی داد نہ دینا ظلم ہے کہ انہوں نے عالم اسلام میں ذہنی انتشار، تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بے علمی تعطّل، اخلاقی انارکی، اور شک وارتیاب پیدا کرنے کے لئے حدیث وسنّت کا انتخاب کیا، اور اس کی حجیّت، حفاظت، تاریخیت پر ایک منظم حملہ کیا، اور اس پورے ادارہ - انسٹی ٹیوشن (INSTITUTION) کو علمی وتاریخی حیثیت سے نہایت مشکوک ومشتبہ اور کمزور وبے بنیاد عمارت کی حیثیت سے پیش کیا، انہوں نے کبھی روایات کی اس تعداد پر جو محدثین کے حالات وتذکروں میں لکھی جاتی ہے، اپنی سخت حیرت واستعجاب کا اظہار کیا، اوراس کو خلاف فطرت بتایا، کبھی محدثین کے حافظہ کے واقعات کو خلاف عقل وقیاس ٹھہرایا، کبھی فاروق اعظمؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کے استفسارات اور انتظامات کی روایات کا سہارا لے کر مکثرین صحابہؓ حضرت ابوہریرہ وغیرہ کی کثرت روایات میں شک وشبہ پیدا کرنے کی کوشش کی کبھی حدیث کی ترتیب وتدوین کو پچھلے دور اور تیسری چوتھی صدی کی کوشش بتاکر روایت حدیث کے تسلسل، اوراس کی تاریخیت کو مجروح قرار دیا، کبھی سیاسی واعتقادی محرکات وعوامل کو نمایاں کرکے حدیث کے ایک بڑے ذخیرہ کو سیاسی وکلامی مصالح کی بناپر موضوع قرار دینے کی کوشش کی، کبھی وضع حدیث کے قصوں کو آب وتاب کے ساتھ نقل کرکے سارے سرمایہ حدیث کو مشتبہ قرار دینے کی سعی کی، کبھی تدوین حدیث کو مذاہب اربعہ کے اثبات واحقاق کا تابع وخادم ثابت کرکے احادیث کی نقل وروایت کو فقہی گروہوں، اور مکاتب خیال کے تقابل وکشمکش کا نتیجہ ثابت کرنا چاہا، واقعہ یہ ہے کہ فرق باطلہ، اور اسلام کے خلاف سازشوں کی تاریخ میں اگراس ذہانت کی کوئی نظیر مل سکتی ہے، تو صرف غُلاۃ روافض کی تاریخ میں جنہوں نے صحابہؓ کرام کی پوری جماعت کو مجروح کرکے قرآن مجید کے نقل وتواتر ہی کو مشکوک بنادیا، اور انہیں سے بہت

سے غالیوں نے قرآن مجید ہی کی تحریف اور اس میں کمی زیادتی کا دعویٰ کیا، اور اس کو اپنے مذہب کا شعار بنالیا۔

مستشرقین کی چابک دستی، مستعدی، اکثر مغربی حکومتوں کی حوصلہ افزائی وسرپرستی، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی صحیح ذہنی تربیت سے محرومی، یورپ سے مرعوبیت، اور نظام تعلیم کے غلط اثرات کی بناپر، نیز موجودہ دَور کے عمل گریز، انتشار پسند، اور مغرب پرست رجحان کی مدد سے یہ فتنہ ان ممالک میں خاص طور پر اثر انداز ہوا جنہوں نے ابھی حال میں یورپ کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کی ہے، لیکن علمی و ذہنی غلامی میں وہ پہلے سے زیادہ مبتلا ہو گئے، یا جنہوں نے سیاسی و علمی ترقی وتنظیم کے راستہ پر نیا نیا قدم اٹھایا ہے، ان میں بدقسمتی سے سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان خاص طور پر قابل ذکر ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہمارے قدیم اساتذہ و مدرسینِ حدیث کو ان مستشرقانہ اعتراضات و تشکیکات کی بہت کم خبر ہے، ان کی زیادہ تر توجہ حدیث سے اپنے مذہب کے اثبات، اور فنّی تحقیقات پر مرکوز رہتی ہے، لیکن اب خدا کے فضل سے مصر و شام، اور ہندوستان و پاکستان میں ان مستشرقین کی علمی تلبیسات کا جائزہ لینے کا کام، اور محدّثین کے کارناموں کو علمی و تحقیقی انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اس زرّیں سلسلۂ تصنیف میں دوؔ کتابیں خاص طور پر امتیاز رکھتی ہیں، ایک شام کے مشہور عالم استاذ مصطفیٰؒ السباعی مرحوم (متخصّص جامع ازہر، وسابق عمید کلیۃ الشریعۃ جامعہ دمشق) کی کتاب" السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی " ہے، جو اپنے موضوع پر۔ میری کوتاہ نظر اور محدود علم میں۔ سب سے زیادہ جامع و مؤثر کتاب ہے، اور جس نے اہل علم ودین کے حلقہ میں بھی بڑی مقبولیت حاصل کی ہے دوسری فاضل گرامی مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ کی تصنیف

"تدوین حدیث" ہے جس میں مصنف نے اپنی عادت کے مطابق بڑا بیش قیمت مواد جمع کر دیا ہے، اور بعض ۔۔۔ نئے نظریات و تحقیقات پیش کئے ہیں، ان دو جلیل القدر کتابوں کے علاوہ متعدد چھوٹی بڑی کتابیں عربی اور اردو میں شائع ہو چکی ہیں، اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

تقریباً تمام اعلیٰ دینی مدارس میں ۔جن کو اصطلاحاً مدارس عربیہ کہا جاتا ہے، حدیث کے درس و تدریس کا بڑا اہتمام ہے، مصر و شام کے بڑے بڑے دینی مدارس اور جامعات کے برخلاف، جہاں اب صرف حدیث کے منتخبات پڑھانے کا دستور ہو گیا ہے ہندوستان و پاکستان کے ان مدارس میں صحاح ستہ کی مکمل تدریس کا رواج ہے، خاص طور پر "ترمذی" و "بخاری" اور کسی حد تک "ابو داؤد" "مسلم" بحث و تحقیق کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے، کہیں کہیں "طحاوی" اور "مؤطا" کو بھی بحث و تحقیق کے ساتھ پڑھتے ہیں، لیکن ان کتابوں کی ضخامت، اور ان کی فقہی بحثوں کی مصروفیت کی وجہ سے بہت کم طلبہ و فضلاء فنِ حدیث کی تاریخ، اصحاب صحاح کے حالات زندگی، طبقات کتب حدیث و خصوصیات کتب وغیرہ سے کما حقہ، واقف ہو پاتے ہیں، حجیّت حدیث، اور اس پر جدید اعتراضات، اور ان کے تشفی بخش جوابات کا مسئلہ تو اور بھی مشکل ہے، اگرچہ کتب حدیث کے بعض جدید شروح کے مقدمہ میں ان کے فاضل مؤلفین نے بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے، لیکن ہمارے عربی مدارس کے بہت سے مدرس شاید معاصر ہونے کے قصور میں ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے، مثلاً حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے بخاری کی زیر طبع شرح "لامع الدراری" کے مقدمہ میں، اور مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبارکپوری نے اپنی ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی کے مقدمہ میں بہت کارآمد مواد جمع کر دیا ہے، ضرورت تھی کہ کوئی ایسے فاضل مدرس، جن

کوطلبہ کی ضرورت کا بھی احساس ہو، قدیم وجدید ذخیرہ پربھی نظر ہو، اور جدید اعتراضات
کی ضرورت کا بھی احساس ہو، قدیم وجدید ذخیرہ پربھی نظر ہو، اور جدید اعتراضات کی بھی خبر
ہو، سلیقہ سے اس مواد کو ضروری حد تک جمع کرکے اردو میں پیش کردیں، اور اس کو ایک ایسا
مجموعہ بنادیں جو تمام عربی مدارس کے طلبہ، نیز متوسط تعلیم یافتہ طبقہ، اور صاحبِ ذوق اردودان
حضرات کے لئے بھی مفید و دلچسپ ہو، اس سے ایک طرف ہمارے طلبہ وفضلاء کو فن حدیث
کی تاریخ، اور کتب صحاح کے مصنفین کے حالات کا علم ہو، دوسری طرف ان تعلیم یافتہ اصحاب
کو، جو عربی سے ناآشنا ہیں، علم حدیث کی ضرورت، اور محدثین عظام کے کارناموں کی
اہمیت کا اندازہ ہو، اور وہ ان کے علمی و دینی مساعی کا حال پڑھ کر اپنا ایمان بھی تازہ کرلیں
اور اپنی معلومات میں بھی اضافہ کریں،

شکر ہے کہ اللہ تعالے نے ایک ندوی فاضلِ مولوی تقی الدین صاحب کو اس کی توفیق دی
انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم کی تکمیل کے بعد ایک خاصی مدت مستقل طور پر حضرت
شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی خدمت میں قیام کیا، حضرت موصوف کے درس
حدیث میں بھی شرکت کی، جو اس عصر کا ایک ممتاز ترین درس حدیث ہے، اور ان کے مسودات
وخصوصی تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھایا، اس طرح وہ ندوی و مظاہری خصوصیات کے جامع
ہیں، اسی کے ساتھ وہ کئی سال سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کی اونچی کتابوں کا درس
دے رہے ہیں، قدیم مآخذ کے ساتھ عربی و اردو کی جدید کتابوں پر بھی ان کی نظر ہے، اس طرح
امید ہے کہ یہ کتاب بہت سی خصوصیات کی حامل ہوگی، اور نہ صرف ہمارے مدارس، بلکہ دینی
حلقہ کی بھی ایک ضرورت پوری کرے گی، کوئی انسانی کوشش بھی نقائص سے خالی نہیں، اور
ابھی تو وہ جواں سال عالم، اور صحیح معنے میں، دشت علم و تحقیق کے مسافر ہیں، ان کی عمر و مطالعہ

کے ساتھ ان کی معلومات، علم۔نظر کی وسعت، اور تصنیف وتحریر کی پختگی ترقی کرے گی، خدا ان کو علم ودین کی خدمت کی مزید توفیق عطا فرمائے، ان کی اس پہلی کوشش وخدمت کو کامیاب بنائے اور قبول فرمائے، اور طلبائے مدارس واہل دین کو ان کی کوششوں سے نفع پہونچے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی
۲۹ رجمادی الثانی ۱۳۸۶ھ

مطابق ۱۵/ اکتوبر ۱۹۶۶ء

حرفِ آغاز

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

امّا بعد! ناچیز مؤلف نے اپنے استاد و مرشد حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدفیوضہم (جن کی توجہ و برکت سے یہ کتاب پیش کی جارہی ہے) کے درس بخاری کے افادات خصوصاً ابتداء درس میں امام بخاریؒ کے حالات وجامع صحیح کی خصوصیات کی پُرمغز مدلل اور مفصل تقریر کو نہایت اہتمام سے قلمبند کیا تھا، اس کے ساتھ استاد محترم کا ایک بیش قیمت مقالہ جو امام ابوداؤدؒ اور ان کی سنن کی خصوصیات پر مشتمل ہے جو حقیقتاً بذل المجہود کیلئے لکھا گیا تھا، اس غیر مطبوعہ مقالہ کی نقل دیگر افادات کے ساتھ میرے پاس موجود ہے ان کے علاوہ جن قدیم وجدید کتابوں سے میں نے اس کتاب میں استفادہ کیا ہے، انکی فہرست آخر میں دے دی ہے۔ آج سے کئی سال بیشتر جب دارالعلوم ندوۃ العلماء نے تدریس حدیث کی خدمت اس ناچیز کے ذمے کی بالخصوص آج سے پانچ سال قبل جب پہلی مرتبہ جامع ترمذی پڑھانے کا موقع ملا تو اس ضرورت کا شدید احساس ہوا کہ حدیث پڑھنے والے طلباء کیلئے ارباب صحاح ستہ وامام طحاوی کے حالات اور انکی کتابوں کی خصوصیات کو کتابی صورت میں جمع کردیا جائے اس مقصد کے تحت مقالات لکھنے کا آغاز کیا، چنانچہ اس کتاب کے اکثر مضامین رسالہ برہان میں اور "معارف" و "الفرقان" میں شائع ہوچکے ہیں، جنکو اہل علم نے پسندیدگی کی نظر سے

دیکھا، موجودہ زمانے میں منکرین حدیث جو فی الواقع علم حدیث کی عظمت اور محدثین کے کارناموں سے ناآشنا ہیں، انہوں نے اس مقدس فن کو مشکوک و مشتبہ بنانے کی ناپاک کوشش کی اور کر رہے ہیں، جس سے ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ناواقفیت کی بنا پر متاثر نظر آتا ہے، اسلئے حجیت حدیث، علم حدیث کی ابتدائی تاریخ اور ائمہ اربعہ کے حالات اور انکی خدمات حدیث کا ذکر ناگزیر معلوم ہوا، تاکہ عہد رسالت اور ارباب صحاح ستہ کے درمیانی عہد میں علم حدیث کی حفاظت وصیانت کا تسلسل بھی معلوم ہو جائے اور ائمہ اربعہ کی خدمات حدیث سے واقفیت بھی حاصل ہو جائے، اگرچہ اس کتاب کی تالیف میں ہمارے پیش نظر تمام عربی مدارس کے طلبا رہیں، مگر اسکے ساتھ ہم نے اسکا بھی لحاظ رکھا ہے کہ ہمارے اردو تعلیم یافتہ طبقے کیلئے بھی یہ مجموعہ کارآمد و مفید ثابت ہو، اس کتاب کو بہت پہلے مکمل ہو جانا چاہیئے تھا، مگر اپنے طویل سلسلۂ علالت کی وجہ سے جو تقریباً دو سال سے قائم ہے، کتاب کی تکمیل میں تاخیر ہوئی اور مسودہ پر نظر ثانی کا موقع نہ مل سکا مگر اب بفضلہ تعالےٰ افاقہ ہوا تو نظر ثانی کا کام بھی پورا کر لیا۔

میرے مخدوم و مربی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی توجہ وہمت افزائی بھی برابر میری معاون رہی انہوں نے اس کتاب کیلئے از راہ عنایت وشفقت ایک قیمتی مقدمہ بھی تحریر فرمایا جو زینت کتاب ہے، اور یہ ناچیز تہِ دل سے ممنون ہے۔

اسی طرح میرے ایک قدیم محب ومحسن کی عنایت سے اس کتاب کی اشاعت کا مرحلہ بھی آسان ہو گیا، اللہ تعالےٰ انہیں جزائے خیر دے۔

کتابت وطباعت کی تمام دشواریوں کو عزیزی مولوی محمد قمر علی ندوی سلمہٗ نے اپنے ذمہ لے لیا، ان کے علاوہ جن دوستوں وعزیزوں نے اس میں کسی نوع کا تعاون

کیا ہے، ان کا ممنون ہوں، اور دل سے دعاگو ہوں۔

اللہ رب العزّت سے دعا ہے کہ اس کتاب کو شرف قبول عطا فرمائے اور دوام بخشے، اس ناچیز کی لغزشوں وکوتاہیوں کو اپنے فضل وکرم سے معاف فرما کر حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت واتباع نصیب فرمائے، اور حدیث پاک کی خدمت کا مزید موقع عطا فرمائے۔ وما ذالک علے اللہ بعزیز۔

تقی الدّین ندوی مظاہری

۲ر رجب یوم دوشنبہ ۱۳۸۵ھ   دار العلوم ندوۃ العلماء

عرض حال

امابعد

اللہ تعالٰی کا لاکھ لاکھ شکر ہے، کہ "محدثین عظام" کے دوسرے اڈیشن کی طباعت ہونے جارہی ہے، یہ اس ناچیز کی پہلی کتاب ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا، الحمدللہ تھوڑے عرصے میں یہ کتاب نکل گئی، مشہور رسائل واخبارات نے اس پر بہت عمدہ تبصرے کئے، اور ناچیز مؤلف کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی، دوسرے اڈیشن کے لئے مؤلف کو وقت وفرصت کا انتظار تھا کہ مزید اضافے کئے جاسکیں، مگر اس کے بعد سے علمی وتصنیفی مشاغل بڑھتے ہی گئے، ۲۵ر شعبان ۱۳۹۱ھ سے ۲۴ر شوال ۱۳۹۳ھ تک بذل المجہود کے حواشی وطباعت کے کام میں ایک سال سہارنپور حضرت اقدس شیخ الحدیث صاحب مدفیوضہم کی خدمت میں قیام رہا اور ۶ر شعبان المعظم ۱۳۹۲ھ کو سہارنپور سے قاہرہ جانے کے لئے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی، میری عدم موجودگی میں، عزیزی الحاج مولوی قمر علی ندوی سلمہٗ نے میرے

محسن و مشفق مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایمار پر پوری کتاب کی دوبارہ کتابت کرائی، جب میں واپس آیا تو اس کا علم ہوا، بیحد مسرت ہوئی، بہرحال "محدثین عظام" کا دوسرا اڈیشن ناظرین کے سامنے ہے، دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس کو قبول فرمائے، اور میرے محسنین و معاونین کو بہترین جزا رخیر عطا فرمائے، فقط والسلام۔

خادم الحدیث النبوی
تقی الدّین ندوی مظاہری
مظفر پور، قلندر پور، اعظم گڑھ۔ یو۔پی

۲۷ر نومبر ۱۹۷۳ء

بِسمِ اللہ الرّحمٰن الرَّحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰے

اَمَّا بعد

حدیث کی تعریف

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں مبلّغ ومعلّم بنا کر بھیجا گیا تھا، اور دین الٰہی کی آخری ومکمل کتاب قرآن مجید آپؐ کو عطا کی گئی تھی، اس مقدس کتاب کو آپؐ نے سنایا، سمجھایا، لکھوایا اور یاد کرایا، اور اس پر کامل طور سے عمل کر کے امت کو دکھایا، گویا آپ کی زندگی قرآن کریم کی عملی تفسیر تھی، اس لئے حدیث کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور ایسے واقعات جو آپؐ کے سامنے پیش آئے اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی (جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں) غرض پیغمبرؐ کے اقوال وافعال وتقریر کا نام حدیث ہے، بعض علماء نے صحابہؓ اور بعضوں نے ان کے شاگردوں یعنی تابعین کے اقوال وافعال کو بھی اس فن کے ذیل میں شریک کر لیا ہے۔

دین میں حدیث وسنّت کا مقام

حدیث کا بڑا حصہ متواتر نہیں ہے مگر امت میں بلاشبہہ یہ عقیدہ متواتر رہا ہے کہ حدیث نبوی، قرآن کا بیان اور اس کی شرح ہے، پس اگر قرآن کی تشریعی حیثیت تسلیم کی جاتی

ہے تو اس کے بیان و شرح کی بھی تشریعی حیثیت ماننی پڑے گی۔

قرآن مجید اور احادیث پر جن علماء کی عمیق و وسیع نظر ہے، انہیں برملا معلوم ہے کہ احادیث صحیحہ تمام تر قرآن پاک کے کلی و عمومی احکام کے تحت مندرج ہیں، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تشریح فرمائی ہے، امام شاطبی فرماتے ہیں کہ

فکانت السنة بمنزلة التفسیر و الشرح لمعانی احکام الکتاب[1]۔ — سنت کتاب اللہ کے احکام کے معانی کے لئے تفسیر و شرح کا درجہ رکھتی ہے۔

امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف الرسالہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہے، دوسری وہ جو قرآن کے مجمل حکم کی تشریح ہے تیسری وہ جس کا ذکر بظاہر قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے اور نہ اجمالاً، اس کے متعلق امام شافعیؒ نے علماء کے چار نظریے نقل کئے ہیں[2]، لیکن صحیح مسلک یہی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ اقوال بھی صحیفۂ ربانی سے مستنبط ہیں، اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقتِ نظر کا کام ہے، ان کا پتہ زبانِ نبوت اور فہمِ رسالت کے طرزِ ادا اور اسلوب سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی لگا سکتے ہیں، قرآن مجید نہایت صراحت کے ساتھ کہتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آل عمران، ۴ ۷)

بیشک اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر کہ بھیجا ان میں رسول انہیں میں سے جو پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اللہ اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن کی

---

[1] الموافقات جلد ۴ ص ۱۰

[2] الرسالہ ص ۲۸ و ص ۲۹

آیات کو پڑھ کر سنانا ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ کتاب و حکمت کی تعلیم بھی آپؐ کے فرائضِ رسالت میں داخل ہے، جمہور ائمہ لغت و علمائے قرآن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حکمت سے مراد قرآن کے علاوہ شریعت کے وہ احکام اور دین کے وہ اسرار ہیں جن پر اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو مطلع فرمایا ہے، امام شافعیؒ الرسالہ میں لکھتے ہیں :-

سمعت من ارضیٰ من اھل العلم بالقرآن یقول الحکمة سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]	میں نے قرآن کے اُن اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے۔

امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں بہت سے علماء کے اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

الصواب من القول عندنا فی الحکمة ان العلم باحکام اللہ التی لایدرك علمها الا ببیان الرسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم والمعرفة بها وما دل علیه فی نظائره وھو عندی ماخوذ من الحکم الذی بمعنے الفصل بین الباطل والحق۔[2]	ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت احکام الٰہی کے علم کا نام ہے، جو صرف رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتا ہے، ان کی اور جو ان کی نظیریں و مثالیں ہیں ان کی معرفت کو کہتے ہیں، اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

معلوم ہوا کہ حکمت سے مراد سنت ... ہے، کیونکہ اس کا عطف کتاب پر ہو رہا ہے، جو مغایرت کا مقتضی ہے، نیز اس سے یہ معلوم ہوا کہ کتاب کے ساتھ سنت کی اتباع بھی

---

[1] الرسالہ ص۳۲ [2] تفسیر ابن جریر بقرہ۔

واجب ہے۔

سنن ابی داؤد میں مقدامؓ بن معدیکرب سے روایت ہے :۔

الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ[1]۔ سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کی مثل مزید برآں۔

ظاہر بات ہے کہ مثلہٗ معہٗ سے مراد سنت ہی ہے۔

اس حکمت کو کتاب اللہ کے ساتھ یاد رکھنے کا تاکیداً حکم بھی دیا گیا، فرمایا :۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى[ع] فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ۔ (احزاب ع ۴) اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔

ازواجِ مطہراتؓ کو آیات الٰہی کے علاوہ کس حکمت کو یاد رکھنے کا حکم دیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس سے مراد خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور احوال ہیں جن کے مجموعے کو حدیث یا سنت کہتے ہیں۔

قرآن مجید کے مجملات ومشکلات کی تفصیل اور عملی تشکیل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال اور آپؐ کے احوال جانے بغیر نہیں ہوسکتی، کیونکہ آپ مراد الٰہی کے مبیّن یعنی بیان کرنے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ اور آپؐ پر بھی ہم نے یہ یادداشت نازل کی

---

[1] باب فی لزوم السُّنّۃ، ابوداؤد، جلد ۲۔

[ع] لفظ یتلیٰ سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کیلئے خاص ہے، کیونکہ آنحضرت صلے اللہ وسلم کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سناتے تھے، بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔

مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔ (النحل، ۴ ۶) تاکہ جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ آپ اس کو کھول کر لوگوں سے بیان کر دیں ۔

قرآن مجید میں وضو، غسل، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، درود، دعا، جہاد، ذکرالٰہی اسی طرح نکاح، طلاق، بیع وشرار، اخلاق و معاشرت، سیاسیات ملّت اور فصل قضایا وخصومات غرض جملہ احکام دین کے متعلق کلّی احکام موجود ہیں، اوران کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ مگر ان احکام کی تشریح اور ان کے جزئیات کی تفصیل آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، اسی لئے آپؐ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، چنانچہ قرآن کریم میں صاف تصریح ہے :-

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (النساء، ۴ ۱۱) جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے بلاشبہ اللہ ہی کی اطاعت کی ۔

آپؐ کی اطاعت اور سنت کا اتباع جس طرح آپؐ کے دَورِ سعید میں کیا جاتا تھا اسی طرح آپؐ کے بعد بھی ضروری ہے، قرآن و حدیث میں اس کی بکثرت تاکید کی گئی ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بہما کتاب اللہ وسنتی۔[۱] میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، کتاب اللہ اور میری سنت۔

عام تاریخی ذخیروں سے فنِ حدیث کے امتیازات

حدیث وہ مقدس فن ہے کہ اس کی اہمیت و

---

[۱] جامع بیان العلم جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ بحوالہ مستدرک ۔

خصوصیت کی وجہ سے اس کی حفاظت کیلئے ہزاروں نہیں لاکھوں، کروڑوں انسانوں کی کوششیں صرف ہوئی ہیں، حافظ ابن حزم تحریر فرماتے ہیں کہ پہلی امتوں میں کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اپنے رسول کے کلمات کو صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کرسکتے، یہ صرف اس امت کا طغرائے امتیاز ہے کہ اس کو اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کی صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کرنے کی توفیق عطا ہوئی[۱]، اس عظیم کارنامے کا اعتراف غیروں کو بھی ہے، ڈاکٹر اسپنگر کہتا ہے کہ مسلمانوں نے علم حدیث کی حفاظت کیلئے اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا جس سے پانچ لاکھ انسانوں کے حالات محفوظ ہو گئے[۲]۔

افسوس منکرین حدیث جو اس فن سے بالکل ناآشنا ہیں، تاریخ کی جھوٹی شہادتوں اور روایتوں کو تو قابلِ قبول سمجھتے ہیں، جس کے نہ راویوں کا پتہ ہے، نہ ان کے حالاتِ زندگی معلوم ہیں، اور حدیث جس کی حفاظت کیلئے وہ سارے ذرائع استعمال کئے گئے جو کسی واقعے کی حفاظت کے لئے اس دنیا میں ممکن ہیں، اس کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ تاریخ کا روایتی سرمایا اس دَورِ شباب میں بھی چند مخطوطات ہیں، جو کہنہ الواح یا بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں دستیاب ہو گئے ہیں، یا وہ محفوظات ہیں جو محض سنی سنائی افواہوں پر بلا سند کے زیر ترتیب آگئے ہیں، یہاں سند کا فقدان تاریخی واقعات کے ثبوت کیلئے کوئی عیب ہی نہیں سمجھا جاتا، اس پر نقد و تبصرہ صرف عقل کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اور انسانی دماغ ہی اس کو مرتبۂ یقین تک پہنچاتا ہے[۳]، جیسا کہ ایک انگریز مؤرخ کا بیان ہے، کہ کسی زمانے کے حالات قلم بند کئے جاتے ہیں، تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کرلی جاتی ہیں، جن کے راویوں کے نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتے، ان

---

[۱] الملل والنحل جلد ۳ ص ۲۶ [۲] خطبات مدارس بحوالہ مقدمہ اصابہ [۳] اسلامی تاریخ اس سے مستثنیٰ ہے۔

افواہوں سے وہ واقعات انتخاب کرلئے جاتے ہیں، جو قرائن وقیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑے زمانے کے بعد یہی ایک دلچسپ تاریخ بن جاتی ہے[۱]، ان کمزوریوں کے باوجود دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، حدیث جس کی حفاظت وصیانت کیلئے ایسے قدرتی عوامل ہیں جو اس دنیا میں کسی تاریخی واقعہ کے لئے نہ میسر ہیں اور نہ آئندہ آسکتے ہیں۔

اب فن حدیث کے بعض امتیازات وخصوصیات کی طرف ہم مختصراً اشارہ کررہے ہیں جو اس کو دوسرے تاریخی ذخیروں سے ممتاز کرتے ہیں[۲]۔

(۱) عام تاریخی ذخیروں سے اس کا پہلا امتیاز یہ ہے کہ تاریخ کے عام ذخیرے عموماً ایسے ہی ہیں کہ اس کا تعلق کسی قوم یا حکومت یا کسی عظیم الشان جنگ سے ہوتا ہے، بخلاف حدیث کے کہ اس کا تعلق براہ راست حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے ایک قوم، ایک ملک، ایک حکومت، ایک جنگ کے حالات بیان کرنے میں جس قدر غلطی کا امکان ہے اسی قدر شخص واحد کی زندگی کے حالات بیان کرنے میں عقلاً صحت وواقعیت کی توقع کی جاسکتی ہے۔

(۲) دوسرا امتیاز جو پہلے سے اہم ہے وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام کا باہمی تعلق ہے، ان بزرگوں کو آپؐ سے وہ تعلق تھا جو ایک امتی کو اپنے پیغمبرؐ سے ہوتا ہے، وہ اپنے باپ، ماں، عزیز واقارب، مال و دولت سب کچھ آپؐ پر قربان کرنے کیلئے تیار تھے، یقیناً یہ ایسا امتیاز ہے، جو کسی تاریخی واقعہ کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہیں۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ان چشم دید راویوں اور گواہوں یعنی صحابہؓ کرامؓ

---

[۱] سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۲۶ [۲] تدوین حدیث از مولانا گیلانیؒ۔

نے بیعت ہی آپؐ کے دستِ مبارک پر اس لئے کی تھی کہ آپؐ کی حیات طیبہ کے ہر ہر جزو، ایک ایک خدو خال کے زندہ نقوش اپنے اندر پیدا کریں گے ۔

مَآ اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا ۔ (سورہ حشر ۲ ، ۷)
رسولؐ نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اسے پکڑے رہو، اور جس سے انہوں نے روکا اس سے رک جاؤ ۔

(۴) اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی اضافہ کرلینا چاہیئے کہ صرف حضورؐ کی اطاعت و اتباع ہی ان بزرگوں کے لئے ضروری نہ تھی، بلکہ انہیں دعوت و تبلیغ کا حکم بھی دیا گیا تھا قرآن کہتا ہے :- کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ ۔
تم ایک بہترین امت ہو، انسانوں کی بہی خواہی کے لئے ظاہر کئے گئے، تاکہ اچھی باتوں کا لوگوں کو حکم دو اور بری باتوں سے روک دو ۔

اس کی تفسیر مختلف انداز میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا کرتے تھے منیٰ کا میدان ہے خَیف کی مسجد ہے، ایک لاکھ سے اوپر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کا مجمع ہے سب کو مخاطب کرکے فرمایا جا رہا ہے :-

نضّر اللہ عبدًا سمع مقالتی فوعاھا ثم اداھا الی من لم یسمعھا [1]
تروتازہ رکھے اللہ اس بندے کو جس نے میری بات سنی، پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک پہونچا دیا ۔

یہی منیٰ کا میدان ہے، مجمع سے دریافت فرمانے کے بعد کہ کیا میں نے پہنچا دیا؟ آسمان کی طرف انگلیاں اٹھا کر اللّٰھم ھل بلّغت، اللّٰھم ھل بلّغت ، اللّٰھم ھل بلّغت، کے ارشاد فرمانے کے بعد آخری رخصت کے اس خطبہ کو مشہور و متواتر فقرہ پر ختم کیا جاتا ہے ۔

---

[1] بخاری کتاب العلم ۔

الاَ فلیبلغ الشاھد الغائب[1]۔ چاہیئے کہ جو حاضر ہے وہ غائب تک پہنچاتا جائے، جس دردناک واثر انگیز ماحول میں اس کے خاتمہ کا اعلان ہوا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن جذبات وہیجانات سے مخاطب مجمع بھرا ہوا تھا، اس پر کیا اثر ہوا ہوگا، اور کن کن طریقوں سے اس دعوت کو پہنچانے کی کوششیں کی ہوں گی۔

(۵) اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جو کچھ صحابہؓ کرام کو سناتے تھے یا کرکے دکھاتے تھے، اس کے متعلق صرف یہی حکم دے کر نہیں رہ جاتے تھے کہ تم بھی اس کو یاد رکھنا، بلکہ باضابطہ نگرانی فرماتے تھے، کہ اس حکم کی تعمیل کس حد تک کی جاتی ہے، اس کا اندازہ ایک معمولی بات سے ہوتا ہے یعنی ایک صحابیؓ کو یہ بتاتے ہوئے کہ جب سونے لگو تو یہ دعا پڑھ کر سویا کرو۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کو بتانے کے بعد فرمایا اچھا میں نے کیا کہا؟ اسے دہرادو! صحابیؓ نے آخری فقرہ امنت بکتابك الذی انزلت وبنبیك الذی ارسلت میں لفظ نبی کو "رسول" سے بدل دیا، جو تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں، ارشاد ہوا کہ وہی کہو جو میں نے بتایا[2] ہے۔ یاد رہے کہ قانونی طور پر سونے کی دعا کی حیثیت اُن شرعی حقائق کی نہیں جنہیں فرض وواجب کے ذیل میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۶) ان تمام امور کے ساتھ اسکو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ صحابہؓ کرام نے حضورؐ کی مشہور حدیث سنی تھی، من کذب علی متعمدًا فلیتبوأ مقعدہٗ من النار (جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرلے) یوں بھی جس

---

[1] بہ حوالۂ مذکور جلد ۲ ص ۸۳۳ [2] اخرجہ الترمذی وابو داؤد فی کتاب الادعیہ والبخاری فی باب فضل مقامات علی الوضوء۔

ایمان ویقین سے وہ سرفراز تھے، جس اعلیٰ کردار کے مالک تھے، اس سے غلط بیانی کا شبہہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

صحابہ رضؓ کرام کی تحصیل سنت کی کیفیت

صحابہ رضؓ کرام جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کیساتھ سفر وحضر، بازار ومسجد میں ساتھ رہتے تھے، اور آپؐ کی حیات طیبہ میں اپنی زندگی کو رنگنے کا ان میں بے پناہ جذبہ تھا، ایک امتی جس طرح پیغمبر کو دیکھتا ہے، اسی نظر سے دیکھتے تھے، جن صحابہؓ نے آپؐ کو دیکھا اور آپ سے کوئی نہ کوئی روایت کی ان کی تعداد حافظ ابوزرعہ جو حدیث کے مشہور امام ہیں، ان کی زبانی سنئے "آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے آپؐ کو دیکھا اور آپؐ سے سنا ایک[ع] لاکھ سے زیادہ تھی، ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں، سب حضورؐ سے سُن و دیکھ کر روایت کرتے تھے[۱]" ظاہر بات ہے کہ یہ صحابہؓ کی تعداد جو حافظ ابوزرعہ نے بیان کی ہے، بیک وقت اور ہر جگہ آپؐ کے ساتھ نہیں رہتی تھی، اگرچہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے زائد مجمع آپؐ کے ساتھ ہوگیا تھا، ورنہ عموماً مدینہ منورہ میں جو تعداد صحابہؓ کی رہتی تھی، غزوات واسفار میں جو آپؐ کے شریک رہے انکی تعداد اتنی کبھی اکٹھی نہیں رہتی تھی، گردوپیش کے ان ہزاروں مردوں اور عورتوں کے آنے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضورؐ کے کسی نہ کسی قول وفعل کے محفوظ کرنے کا انہیں

ع لیکن خطیب نے ابوزرعہ سے ایک لاکھ کے بجائے ایک لاکھ چودہ ہزار کی روایت نقل کی ہے، حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ حالات صحابہؓ پر جو کتابیں موجود ہیں ان میں دس ہزار سے زائد تعداد نہیں پائی جاتی، تدریب ص۴۰۶، ۴۰۰

۱ اصابہ جلد ۳ ص ۲

موقع ملا، اوراسکی اہمیت کے پیش نظر بعض صحابہؓ نے خدمت اقدس میں حاضری کے لئے باری مقرر کرلی تھی، بخاری میں حضرت عمرؓ سے یہ روایت مروی ہے:-

کنت وجارلی من الانصار فی بنی	میں اور میرا پڑوسی ہم دونوں امیہ بن زید والوں
اُمیّة بن زید وھی من عوالی المدینة	کی بستی میں رہتے تھے جو مدینہ کی عوالی کی بستیوں
وکنا نتناوب النزول فاذا نزلت	میں سے ہے ہم دونوں آنحضرت صلی اللہ
جئتہ بخبر ذلك الیوم من الوحی	علیہ وسلم کی خدمت میں باری باری سے
وغیرہ واذا نزل فعل مثل ذلك۔[1]	حاضر ہوتے تھے پس جب میں حاضر ہوتا تو اس
	دن وحی وغیرہ کی خبر اسکے پاس لاتا اور جب وہ
	حاضر ہوتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتا۔

چونکہ حضورؐ کی اتباع کو صحابہؓ کرام تمام اوامر ونواہی میں واجب سمجھتے تھے، اس لئے مدینہ طیبہ سے دور کے قبائل اپنے نمائندوں کو بارگاہ رسالت میں اسلام کے احکام سیکھنے کے لئے بھیجتے تھے تاکہ یہ وفد واپس آکر تعلیم وارشاد کی خدمت انجام دے سکے، چونکہ صحابہؓ کرام میں تاجر بھی تھے، کاشتکار بھی اور مدینہ میں مقیم بھی اور باہر رہنے والے بھی مشہور تابعی مسروق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

"میں صحابہ رسولؐ کی صحبت میں بیٹھا ہوں، میں نے ان کو حوض کی طرح پایا، بعض حوض ایسے ہوتے ہیں، جو صرف ایک آدمی کو سیراب کرسکتے ہیں۔ بعض دوؔ کو بعض دسؔ آدمیوں کو بعض ایک سوؔ کو اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر سب اہل زمین پانی پینے آجائیں تو سب کو سیراب کردیں۔"

---

[1] صحیح بخاری باب التناوب فی العلم۔

اس لئے ظاہر بات ہے کہ سنت کا علم ان حضرات کو جنہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی ہے جیسے خلفاء راشدینؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ یا جنہیں آپؐ کی خدمت میں زیادہ رہنے کا موقع ملا ہے جیسے حضرت ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ وغیرہ ہیں، ان لوگوں کو حضورؐ کے اقوال و احوال دوسرے صحابہؓ کی بہ نسبت زیادہ معلوم تھے پھر ان میں کا ہر شخص اپنی کمی کو دوسرے صحابیؓ سے پورا کرتا تھا۔

طلب حدیث کیلئے صحابہؓ کی رحلت

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جن لوگوں کو آپؐ کی جن باتوں کا علم براہ راست نہ ہوتا تھا، اس کو وہ اپنے دوسرے بھائیوں یا ساتھیوں سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، اور اس میں چھوٹے بڑے کی تخصیص نہیں تھی، حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میری وابستگی کا حال چونکہ لوگوں کو معلوم تھا، اس لئے آنحضرتؐ کی حدیثیں مجھ سے پوچھا کرتے تھے، ان پوچھنے والوں میں عمرؓ بھی ہیں اور عثمانؓ بھی، علیؓ بھی اور طلحہؓ و زبیرؓ بھی[1]، علم حدیث کی تکمیل کے شوق میں ایک صحابیؓ نے دوسرے صحابیؓ کے پاس اپنی علمی کمی کو پورا کرنے کے لئے سفر بھی کئے ہیں،

امام بخاری نے الادب المفرد میں اور امام احمد و طبرانی نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ جو مدینہ منورہ میں مقیم تھے، ان کا بیان نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں، کہ مجھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں ایک صاحب کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ انہوں نے آنحضرتؐ کی ایک حدیث سنی ہے، میں نے اسی وقت ایک اونٹ خریدا، اور اس پر اپنا کجاوہ کس کر ایک ماہ تک چلتا رہا اور ملک شام پہنچا، وہاں عبداللہ بن انیسؓ (جن سے حدیث

---

[1] تدوین حدیث بحوالہ طبقات ابن سعد۔

پہنچی تھی) کے گھر پہنچا اور اندر آدمی بھیجا کہ جا کر کہو کہ دروازہ پر جابرؓ کھڑا ہے، انہوں نے سننے کے ساتھ ہی پوچھا جابر بن عبداللہ؟ کہا جی ہاں! وہ فوراً باہر آئے اور گلے ملے پھر میں نے پوچھا کہ مجھے آپ کے ذریعہ ایک حدیث پہنچی ہے، میں ڈرا کہ کہیں مجھے موت آجائے اور اس حدیث مبارک کے سننے سے محروم رہ جاؤں، یہ سن کر حضرت عبداللہ بن انیس نے وہ حدیث بیان کر دی[1]۔ وہ حدیث آخرت میں قصاص کے متعلق ہے۔

اسی طرح کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز واقعہ حضرت ابوایوبؓ انصاری کا ہے، ایک حدیث انہوں نے براہ راست آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے خود سنی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس میں کچھ تردد پیدا ہوا، اس حدیث کے سننے کے وقت حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی بھی دربار رسالت میں موجود تھے، لیکن وہ مصر میں قیام پذیر ہو گئے تھے، سن کر حیرت ہوتی ہے کہ صرف ایک حدیث میں معمولی تردد مٹانے کیلئے حضرت ابوایوبؓ مصر روانہ ہوتے ہیں، اور عقبہؓ بن عامر کے پاس حاضر ہو کر فرماتے ہیں، مجھ سے اس حدیث کو بیان کرو جو تم نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی پردہ پوشی کے متعلق سنی ہے، اس حدیث کے سننے والوں میں میرے اور تمہارے سوا کوئی باقی نہیں رہا، حضرت عقبہؓ بن عامر اس حدیث کو ان کے سامنے دہراتے ہیں، حدیث تھی من ستر مؤمنا فی الدنیا علے خزیۃ سترہ اللہ یوم القیامۃ' وہ سنتے ہیں، اس کے بعد کیا ہوتا ہے، وہ اس سے بھی عجیب ہے، حضرت ابوایوبؓ سنتے ہی فوراً اپنی سواری کی طرف پلٹے اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے، واپسی میں اتنی جلدی کی کہ حضرت مسلمہؓ (والی مصر) نے جو نذرانہ ان کو بھیجا تھا، وہ بھی عریش مصر میں ان کو ملا[2]۔

---

[1] الادب المفرد ص ۲۵۲ [2] جامع بیان العلم ص ۸۴

امام دارمی نے اپنی سنن میں عبداللہ بن بریدہ سے روایت کی ہے، کہ ایک صحابی سفر کرکے حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے پاس مصر پہنچے، اس وقت وہ اپنی اونٹنی کو چارہ کھلا رہے تھے، ان کو دیکھ کر فرمایا، مرحبا! صحابی مذکور نے حضرت فضالہؓ سے کہا، " لم اٰتك زائرا " میں آپ کی زیارت کیلئے نہیں آیا ہوں، بلکہ میں نے اور آپ نے ایک حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، مجھے امید ہے کہ وہ آپ کے حافظہ میں ہو گی، حضرت فضالہؓ نے پوچھا کون سی حدیث؟ صحابیؓ مذکور نے کہا " کذا وکذا " جس میں یہ ہے[1]۔

یہ صحابہؓ کے واقعات ہیں دور تابعین اور اس کے بعد کے عہد میں اس سلسلہ کو اور ترقی ہوئی، علم حدیث کی طلب میں سیکڑوں میل پا پیادہ طے کرلینا، براعظموں اور سمندوں کو پار کرلینا محدثین کے نزدیک معمولی بات بن گئی۔

مسلمانوں کے عہد عروج میں محدثین کرام خصوصیت سے جن ممالک وشہروں کی طرف رحلت کرتے تھے، علامہ ذہبی نے ان ملکوں اور شہروں کے بیان میں مستقل ایک رسالہ تحریر کیا ہے، جس کا نام " الامصار ذوات الآثار " یعنی " حدیثوں کا شہر " رکھا ہے یہ پورا رسالہ حافظ سخاوی نے الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ میں نقل کر دیا ہے محدثین کرام کے ان علمی اسفار کا اعتراف اسلام کے دشمنوں اور مستشرقین یورپ نے بھی کیا ہے، چنانچہ مشہور مستشرق گولڈزیہر (GOLDZIHER) جس نے علم حدیث پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں، وہ بھی اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہے، کہ جو اعتراض، ائمہ حدیث کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ انہوں نے علم حدیث کے لئے چار چار مرتبہ مشرق ومغرب کا سفر

---

[1] سنن دارمی ص۷۵

کیا۔ وہ میری نگاہ میں نہ دور از قیاس ہے، اور نہ ہی ان میں مبالغہ ہے[1]۔"

روایت حدیث میں صحابہؓ کا طرزِ عمل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ کرام دین کی امانت کو لے کر مختلف شہروں میں پھیل گئے، جہاں جاتے تھے، وہاں تابعین کا مجمع کثیر ان کے گرد جمع ہوجاتا اور لوگ مختلف جگہوں سے رخت سفر باندھ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اس طرح حدیث کے سلسلے کو بڑی اشاعت ہوئی۔ مگر جس طرح ان صحابہؓ نے حضورؐ کے ان ارشادات کو سن رکھا تھا، ہر حاضر، غائب کو پہنچائے[2]، اور اللہ تر و تازہ رکھے اس شخص کو جس نے میری بات سنی، پس یاد کیا اور محفوظ رکھا اور اس کو پہنچایا جیسا کہ سنا ہے[3]، اسی طرح حضورؐ کی یہ حدیث: کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع[4] اور من کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار' یہ سب روایات ان کے سامنے تھیں، اس لئے صحابہؓ کرام میں حدیث کے سلسلے میں دو طرح کے حضرات تھے، مقلین (کم روایت بیان کرنے والے) جیسے زبیرؓ، زیدؓ بن ارقم و عمرانؓ بن حصین، چنانچہ بخاری میں عبداللہؓ ابن زبیر سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے والد حضرت زبیرؓ سے کہا میں آپ کو اس طرح حدیث بیان کرتے ہوئے نہیں پاتا جیسا کہ فلاں فلاں صاحب بیان کرتے ہیں حضرت زبیرؓ نے جواب دیا: سنو میں حضورؐ سے جدا نہیں ہوا، لیکن میں نے آپؐ سے من کذب علیّ متعمدًا فلیتبوأ مقعدہٗ من النار، سن رکھا ہے، دوسری جماعت مکثرین کے لقب سے مشہور ہے، جیسے ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، عائشہؓ، جابر بن عبداللہ، ابن مسعودؓ۔

---

[1] علوم الحدیث و مصطلحہ ص۵۶ [2] صحیح بخاری کتاب العلم [3] ابوداؤد ص۲۹ [4] صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ

مکثرین صحابہؓ جن کی روایات کی تعداد ہزار سے زیادہ ہے، ان میں حضرت ابن عباسؓ کے متعلق امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اخیر زندگی میں روایت کے سلسلے کو کم کر دیا تھا، فرماتے تھے کہ جب لوگوں نے نیک و بد میں تمیز نہیں رکھی تو ہم بھی اب صرف ان حدیثوں کو سنتے ہیں، جن کو ہم خود بھی جانتے ہیں[۱]

اسی طرح ابوہریرہؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اسی طرح حدیثیں بیان کرتے تھے؟ تو فرمایا کہ اگر عمرؓ کے زمانے میں ایسا کرتا تو مجھے دُرّے مارتے[۲]۔

مگر مکثرین صحابہؓ میں حضرت ابوہریرہؓ کے سوا اور کسی سے حضرت عمرؓ نے تعرض نہیں کیا، بلکہ روایت میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت ابوہریرہؓ کثرت سے حدیثیں بیان کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ کیا تم ہمارے ساتھ موجود تھے جب حضورؐ فلاں مقام پر تشریف رکھتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ ہاں! میں نے حضورؐ کی حدیث من کذب علیّ متعمّداً فلیتبوأ مقعدہ من النار، سن رکھی ہے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا جب واقعہ یہ ہے تو "فاذھب فحدث" جاؤ، حدیث بیان کرو[۳]۔

حضرت عمرؓ کے کثرت روایت سے منع کرنے کی مصلحت

حافظ ابن عبدالبر مالکی نے لکھا ہے کہ کثرت روایت سے ممانعت اور قلت روایت کا حکم حضرت عمرؓ نے اس لئے دیا تھا کہ کثرت کی صورت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف

[۱] جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۲۰ [۲] حوالۂ مذکور جلد ۱ ص ۱۲۱ و تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۷ [۳] السنۃ و مکانتہا

غلط بات کے منسوب ہو جانے کا اندیشہ تھا، نیز اس کا بھی خوف تھا کہ جو حدیثیں لوگوں کو اچھی طرح محفوظ نہ ہوں، اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے پر لوگ جری ہو جائیں گے۔[۱]

مگر علامہ ابن حزم نے یہ روایت درج کی ہے کہ روی عن عمرؓ انہ حبس ابن مسعودؓ من اجل الحدیث عن النبیؐ واباالدرداء واباذر[۲] حضرت عمرؓ نے حدیث بیان کرنے سے ابن مسعودؓ، ابو درداؓ، ابوذرؓ کو قید کر دیا تھا، یا روک دیا تھا۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ اس روایت کا حضرت عمرؓ کی طرف انتساب صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے راوی ابراہیم بن عبدالرحمٰن کا سماع حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں، کیونکہ ابراہیم کی ولادت حضرت عمرؓ کے اخیر دورِ خلافت ۲۰ھ میں ہوئی ہے، اس لئے ان سے سماع کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ ابن عبدالبر نے "جامع بیان العلم" میں اس طرح کی بعض دوسری روایتوں کو درج کر کے لکھا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے: جن لوگوں کو واقعات کا صحیح علم نہیں تھا، اور بدعات (نئی باتوں) کے پیدا کرنے کا جن میں زیادہ شوق پایا جاتا تھا سنت یعنی حضورؐ کی حدیثوں سے جن کے قلوب میں گرانیاں تھیں، انہوں نے مذکورہ بالا روایتوں سے جو حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں، یہ نتیجہ پیدا کرنا چاہا ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں کے دین سے حدیثوں کو بالکلیہ خارج کرنا چاہیئے تھے، آخر میں حافظ نے لکھا ہے کہ ان روایتوں کی صحت مشکوک ہے[۳] اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو بالآخر اجازت دے دی تھی، پھر ان تینوں حضرات کو کس طرح روک سکتے تھے، کیونکہ ابو درداء و ابوذر سے روایات زیادہ مروی نہیں ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو

---

[۱] جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۲۲ [۲] احکام لابن حزم جلد ۲ ص ۱۹۳ [۳] جامع بیان العلم جلد ۲ ص ۱۲۱

کوفہ کا معلم بنا کر بھیجا تھا۔

کیا قبول حدیث کیلئے صحابہؓ نے مزید شرائط مقرر کئے تھے؟

شیخین حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں نے حدیث کو قبول کرنے کیلئے دو راوی کا ہونا ضروری قرار دیا ہے، اسی طرح حضرت علیؓ قسم لیتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کا مسلک جمہور صحابہؓ کے خلاف نہیں تھا، ہر صحابیؓ دوسرے پر اعتماد کرتا تھا۔

حافظ ذہبی نے تذکرہ الحفاظ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جدہ (دادی) کی وراثت کے مسئلے میں حضرت ابوبکرؓ نے تنہا حضرت مغیرہؓ کی حدیث سنی تو دریافت فرمایا ھل معك احدٌ کیا تمہارے ساتھ اس خبر کے بیان کرنے میں کوئی دوسرا بھی شریک ہے، تو محمدؓ بن سلمہ نے بھی اس کی شہادت دی، اس مسئلے کے سوا اور کہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ثابت نہیں کہ انہوں نے کسی صحابیؓ کی روایت سن کر اس پر شہادت طلب کی ہو، اس روایت کی سند کو علامہ ابن حزم نے منقطع قرار دیا ہے[1]، اگر روایت کی صحت کسی درجے میں تسلیم کرلی جائے، تو امام غزالی فرماتے ہیں کہ یہاں پر توقف کے مختلف احتمالات ہوسکتے ہیں[2]، کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ خبر واحد کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قبول فرمایا ہے، اسی طرح حضرت علیؓ کا قسم لینا مزید اطمینان کی ایک تدبیر تھی، بجنسہٖ یہی حضرت ابوبکرؓ کا طرز عمل ہے، اسلئے آپ نے چاہا کہ اور کوئی صاحب جانتے ہوں تو بیان کردیں، چنانچہ رازی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دو صحابیوں کے درمیان فیصلہ کیا، جب حضرت بلالؓ نے بتایا کہ حضورؐ کا فیصلہ اس کے خلاف ہے تو رجوع کرلیا، اسی طرح مذی کے مسئلہ میں بغیر قسم لئے ہوئے حضرت مقدادؓ

---

[1] الاحکام لابن حزم جلد ا ص۱۴۱ [2] المستصفٰی للغزالی جلد ا ص۱۵۴

کی روایت کو حضرت علیؓ نے قبول کیا ہے[1]، حضرت عمرؓ کے متعلق صرف دو واقعات ایسے ملتے ہیں جس میں انہوں نے ایک راوی پر مزید دوسرے کی گواہی طلب کی۔

(۱) حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کا دلچسپ واقعہ ہے جس کو حضرت ابو سعید خدریؓ نے بیان کیا کہ ابو موسیٰؓ نے حضرت عمرؓ کو دروازے کے باہر سے تین مرتبہ سلام کیا، جب تیسری مرتبہ جواب نہ ملا تو واپس لوٹ آئے، حضرت عمرؓ نے ان کے پیچھے آدمی بھیجا اور ان کو واپس بُلایا، اور یہ فرمایا کہ کیوں واپس لوٹ گئے تھے؟ ابو موسیٰؓ اشعری نے جواب دیا کہ میں نے حضورؐ کو فرماتے سنا ہے: اذا سلم احدکم ثلاثا فلم یجب فلیرجع، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس پر شہادت پیش کرو ورنہ تمہارے ساتھ میں کچھ کروں گا، پس ابو موسیٰؓ ہمارے پاس (انصار کا ایک مجمع تھا) آئے، ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا، ہم نے کہا کہ کیا حال ہے؟ ہمارے سامنے پورا واقعہ سنایا اور دریافت کیا کہ کیا آپ لوگوں میں سے کسی نے یہ حدیث سنی ہے؟ ہم سب نے سنی ہے، پس لوگوں نے اس مجمع میں سے ایک صاحب کو بھیجا تو انہوں نے جاکر حدیث سنائی (رواہ مسلم) اس روایت میں اتنا اضافہ ہے، اما انی لم اتھمک ولکنی خشیت ان یتقول الناس علی رسول اللہ[2]، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ غلط بیانی میں تم کو مُتّہم نہیں کرنا چاہتا، بلکہ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ رسولؐ اللہ کی طرف لوگ جھوٹی باتیں منسوب نہ کرنے لگیں، بعض روایات میں ہے کہ حضرت اُبیؓ نے حضرت عمرؓ پر اعتراض بھی کیا تھا، بعض میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرا مقصود تثبت تھا۔

(۲) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ دیت جنین کے متعلق جب حضرت مغیرہؓ نے حدیث

---

[1] السنۃ ومکانتہا ص ۸۵ بحوالہ المحصول للرازی۔ [2] مؤطا مالک ص ۳۸۰

سنائی تو حضرت عمرؓ نے ان سے شہادت طلب کی، پس محمدؓ بن مسلمہ نے شہادت دی۔

بہرحال حضرت عمرؓ کا مقصود بھی اس طرز عمل سے یہی تھا کہ روایت حدیث میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، ورنہ بہت سے مواقع پر حضرت عمرؓ نے صرف ایک صحابی کی روایت پر عمل کیا ہے، سفر شام میں جب مقام سرغ پر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہاں طاعون ہے، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے جب حضور کی حدیث سنائی، تو سن کر واپس آ گئے[1] خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کرام مسلسل ایک راوی کی روایت پر اعتماد کرتے رہے ہیں، اس کے بکثرت واقعات ہیں، اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے، چنانچہ خطیب بغدادی نے ان روایتوں کو الکفایہ میں مستقل ایک باب میں جمع کر دیا ہے۔

اخبار آحاد کا مرتبہ اصطلاح میں خبر واحد اس خبر کو کہتے ہیں، جو متواتر[ع] نہ ہو، اگر تواتر کا عدد کسی طبقے میں پورا نہ ہو تو اس کو خبر واحد ہی کہا جائے گا، خواہ وہ کتنے ہی افراد سے روایت کی گئی ہو، حضورؐ و صحابہؓ کرام نے اس کو قابل اعتماد سمجھا ہے، اور ہر زمانے کے علماء و فقہا نے واجب العمل قرار دیا ہے، امام شافعی نے اپنی تصنیف الرسالہ میں بہت سی آیات و احادیث سے ثابت کیا ہے کہ اخبار آحاد قابل اعتماد اور واجب العمل ہیں۔

حضورؐ نے مختلف جگہوں پر لوگوں کو دعوت و تبلیغ کے لئے بھیجا تھا، اس میں

---

[1] الرسالہ از شافعی ص۱۴۲ [ع] منکرین حدیث نے نادانی سے یہ سمجھ لیا ہے، کہ احادیث متواترہ بہت محدود و قلیل ہیں، حالانکہ تواتر کی چار قسمیں ہیں، دین کا بہت بڑا حصہ تواتر و توارث کی راہ سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (نیل الفرقدین از مولانا انور شاہ کشمیری)

عدد کا کوئی لحاظ نہیں فرمایا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ خبر واحد حجت شرعی ہے، اگرچہ اس کے اندر خطا کا امکان عقلی موجود ہے، مگر عقل وفطرت انسانی کے نزدیک اس قسم کے احتمال عقلی کا کوئی اعتبار نہیں، اور عرفاً اس کا لحاظ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

معتزلہ وغیرہ جو اخبار آحاد کی افادیت کے منکر ہیں ان پر شیخ الاسلام علامہ بزدوی کی بات پورے طور سے صادق آتی ہے، من انکر الخبر الواحد فانه رجل سفيه لا يعرف نفسه ولا دينه ولا دنياه ولا امه ولا اباه[1]، جس نے خبر واحد کا انکار کیا وہ دراصل ایک بے وقوف آدمی ہے، اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتا، نہ اپنے دین کو نہ دنیا کو، نہ اپنی ماں کو، نہ اپنے باپ کو۔

محدثین نے اخبار آحاد کے متعلق جو یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ قرائن نہ ہوں تو ظن کا فائدہ دیتی ہے، جس طرح خبر متواتر یقین کا فائدہ دیتی ہے، مگر وہ ظن جس کا فائدہ اخبار آحاد دیتی ہے، وہ یقین سے زیادہ قریب ہے محدثین نے اس کو ظنی اصطلاحی معنی میں قرآنیات کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے، کہاں وہ ظنی اصطلاح اور کہاں یہ بول چال والا گمان جو شک وشبہ اور بے اعتباری کے موقع پر بولا جاتا ہے، دونوں کو ایک درجہ کی چیز سمجھنا نہایت ہی جہالت ہے جیسے کوئی قیاس کو محض اٹکل کے معنی میں لے کر قیاس منطقی کی جو استدلال کی مستقل شکل ہے، ہنسی اڑانے لگے، یہ تمسخر فن منطق پر نہ ہوگا، بلکہ اپنی بے علمی پر ہوگا، اگر خبر واحد پر اعتماد نہ کیا جائے تو بہت سے دنیاوی معاملات معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

کتابت حدیث حدیث کے متعلق بے اعتمادی پھیلانے والوں کی طرف سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ حدیثیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] ظفر الامانی ص ۲۲

زمانے میں قلم بند نہیں کی گئی تھیں، بلکہ لکھنے کی خود آپؐ نے ممانعت فرمادی تھی، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث ہے، لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہٗ من النارؔ[1]، مجھ سے کچھ نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہے وہ اسے چاہیئے کہ مٹا دے اور مجھ سے حدیثیں بیان کرو، اس میں کچھ حرج نہیں، اور جس نے میرے متعلق قصداً جھوٹ بولا اسے چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنالے۔

امام بخاری وغیرہ دیگر محدثین کے نزدیک اس روایت پر کلام ہے، انکی تحقیق میں یہ الفاظ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہیں، بلکہ خود ابوسعیدؓ خدری کے ہیں، جن کو غلطی سے راوی نے مرفوعاً نقل کردیا[2]، لیکن بالفرض اگر اس حدیث کو موقوف نہیں بلکہ مرفوع ہی تسلیم کرلیا جائے، تب بھی یہ ممانعت وقتی وعارضی تھی، جو اس زمانے میں خاص طور سے حفاظت قرآن کے سلسلے میں دی گئی تھی، چونکہ حق تعالےٰ شانہ نے حضورؐ کو "جوامع الکلم" عطا فرمائے تھے، اس لئے اندیشہ تھا کہ یہ نئے نئے لوگ جو ابھی ابھی قرآن سے آشنا ہورہے ہیں، کہیں دونوں کو خلط ملط نہ کردیں، اِدھر آپؐ کو اپنی قوم کے حافظے پر اعتماد تھا، مگر جب قرآن سے اشتباہ کا اندیشہ جاتا رہا تو کتابت حدیث کی اجازت دیدی گئی، بلکہ روایات سے آپ کا خود لکھوانا واملا کرانا ثابت ہے۔

(۱) جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک انصاریؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں بیٹھتے، آپ کی باتیں سنتے اور بہت پسند کرتے مگر یاد نہ رکھ پاتے، آخر انہوں نے اپنی یادداشت کی خرابی کی شکایت

---

[1] مسلم جلد اوّل باب التثبت [2] فتح الباری جلد ۱ ص۱۷۵

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کی کہ یا رسولؐ اللہ میں آپ سے حدیث سنتا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہے، مگر میں اسے یاد نہیں رکھ سکتا، اس پر آپؐ نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ "إستعن بيمينك واومأ بيده للخط" [۱] اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو، اور اپنے دست مبارک سے لکھنے کی طرف اشارہ کیا۔

(۲) حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بارگاہ نبوی میں شکایت کی کہ یا رسول الله انا نسمع منك اشياء فنكتبها؟ یا رسول اللہ ہم آپؐ کی زبانی بہت سی باتیں سنتے ہیں اور اس کو لکھ لیتے ہیں تو اس کی نسبت کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لکھتے رہو اس میں کوئی حرج نہیں [۲]۔

حضرت رافعؓ بن خدیج کے بیان سے معلوم ہوا کہ متعدد اشخاص کا دستور تھا کہ وہ حدیثیں سن کر لکھ لیتے تھے۔

(۳) حاکم صاحب مستدرک نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ "قيدوا العلم بالكتاب" علم کو قید کتابت میں لے آؤ [۳]۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ مسلّم ہے کہ قرآن مجید کی طرح حدیث کی تدوین کی طرف توجہ نہیں کی گئی، چونکہ نہی و اجازت دونوں روایات سے ثابت ہے، اس لئے اکثر لوگوں نے نہی کو منسوخ سمجھا، البتہ بعض علمار کا خیال تھا کہ نہی ان لوگوں کے لئے ہے، جن سے قرآن و سنت میں التباس و غلطی کا امکان تھا، اور جن کے متعلق اطمینان

---

[۱] جامع ترمذی باب ماجاء فی الرخصۃ فی کتابۃ العلم جلد ۲ صد ۹۱ [۲] مجمع الزوائد جلد اول صد ۱۵۱ بحوالہ طبرانی [۳] منتخب کنز العمال جلد ۴ صد ۶۹

تھا انہیں لکھنے کی اجازت تھی، مگر واقعہ یہ ہے کہ دونوں طرح کی روایات میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ قرآن مجید کی طرح حدیث کی کتابت میں زیادہ اہتمام وعمومیت کا رنگ نہیں دیا گیا، بلکہ انفرادی وشخصی طور پر لکھنے کی اجازت تھی، اس کے مطابق بعض لوگوں نے لکھا، اسکی تائید ضحاک کے قول سے بھی ہوتی ہے، انہوں نے فرمایا:
"لا تتخذوا للحديث كراريس ككراريس المصاحف"۔ تم لوگ حدیث کیلئے کاپیاں نہ بناؤ جس طرح کی مصاحف کی کاپیاں ہیں۔[۱]

خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا احکام وہدایات کو قلم بند کروانا

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ کتابت حدیث کی اجازت دی تھی بلکہ بہت سے مواقع پر آپؐ کا لکھوانا اور املا کرانا بھی ثابت ہے۔

(۱) فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ ابوشاہ یمنیؓ ایک صحابی کی درخواست پر آپؐ نے یہ خطبہ لکھ کر ان کے حوالہ کرنے کا حکم دیا تھا۔[۲]

(۲) ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجمع سے پوچھا کہ کسی کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے شوہر کی دیت میں بیوی کو کیا دلایا ہے؟ ضحاکؓ بن سفیان نے کھڑے ہو کر کہا کہ مجھے معلوم ہے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ لکھوا کر بھیجا تھا۔[۳]

(۳) حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جب ۱۰ھ میں آپؐ نے نجران پر

---

[۱] السنة ومكانتها في التشريع الاسلامي ص ۴۴۷ [۲] صحیح بخاری باب کتابۃ العلم

[۳] سنن دارقطنی جلد ۲ ص ۴۸۵

عامل بناکر بھیجا، توایک تحریر لکھواکر ان کے حوالے کی تھی، حافظ ابن عبد البر مالکی لکھتے ہیں:

وکتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الصدقات والدیات والفرائض والسنن لعمرو بن حزم وغیرہ[۱]، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عمرو رضؓ بن حزم کیلئے صدقات، دیات، فرائض وسنن کے متعلق ایک کتاب تحریر کروائی تھی، محمد بن شہاب زہری کا بیان ہے کہ یہ کتاب چمڑے پر تحریر تھی، اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے پوتے ابوبکر بن حزم کے پاس موجود تھی، وہ یہ کتاب میرے پاس بھی لے کرآئے تھے، اور میں نے اسکو پڑھا تھا[۲]۔

علامہ زیلعی بعض حفاظ سے ناقل ہیں کہ عمرو رضؓ بن حزم کی کتاب کے نسخہ کو ائمہ اربعہ نے قبول کیا ہے، اور یہ نسخہ بھی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے نسخے کی طرح متوارث ہے[۳]،

(۵) حضرت عبد اللہ بن حکیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے ایک ماہ پیشتر قبیلہ جہینہ کی طرف یہ لکھواکر بھیجا تھا کہ مردار کی کھال اور پٹھوں کو کام میں نہ لایا جائے، جامع ترمذی میں وفات سے دو ماہ قبل مذکور ہے[۴]۔

ہم نے ان چند تحریروں کو بطور مثال پیش کیا ہے، ورنہ مختلف قبائل وافراد کے نام خطوط وتحریری احکام اور صلحنامے ودعوت نامے وغیرہ جو آپ نے وقتاً فوقتاً لکھوائے ہیں، انکی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، اس موضوع پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

صحابہ رضؓ کرام اور کتابت حدیث

چونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کتابت حدیث کی عام اجازت دے دی

---

[۱] جامع بیان العلم باب الرخصۃ فی کتابۃ العلم [۲] سنن نسائی [۳] نصب الرایہ جلد ۳ ص ۳۴۲

[۴] سنن ابی داؤد باب من روی ان لا یستنفع باہاب المیتۃ وجامع ترمذی جلد ا ص ۴۳

گئی تھی،[۱] اس لئے بہت سے حضرات صحابہؓ نے انفرادی و شخصی طور پر حدیثوں کے مجموعے تحریری شکل میں تیار کئے تھے، اور بعض حضرات نے اپنے تلامذہ کے ذریعہ قلم بند کرایا تھا۔

مگر واقعہ ہے کہ دورِ صحابہؓ میں کتابت حدیث کا عام رواج نہ ہوا، اسکے مختلف اسباب ہیں، (۱) صحابہؓ کرام کی جماعت مختصر تھی، انہیں دین سارے عالم میں پہنچانا تھا، تصنیف و تالیف کے لئے سکون و اطمینان کی ضرورت ہے (۲) وہ حافظے کے نہایت قوی تھے، انہیں کتابت کی چنداں ضرورت نہ تھی (۳) عام طور پر عربوں میں لکھنے کا رواج نہیں تھا اسلئے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہؓ بن عمرو بن العاص کے سوا مجھ سے زیادہ کسی کو حدیث یاد نہیں، مجھ سے زیادہ ان کے پاس حدیث کا سرمایہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے اس کو لکھتے جاتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا،[۲] ابوداؤد و مسند احمد میں ہے کہ بعض صحابہؓ نے عبداللہؓ بن عمرو ابن العاص سے کہا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوش ہوتے ہیں اور تم سب لکھ لیتے ہو، عبداللہؓ بن عمرو نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آپؐ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو! اس سے جو کچھ نکلتا ہے، حق نکلتا ہے[۳]، عبداللہؓ بن عمرو نے اپنے اس صحیفہ کا نام صادقہ رکھا تھا[۴] اور کہا کرتے تھے، کہ مجھے زندگی کی آرزو صرف دو چیزوں نے پیدا کر رکھی ہے، جس میں ایک صادقہ ہے اور صادقہ وہ صحیفہ ہے جو آنحضرت صلے

---

[۱] فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۱۸۲ [۲] صحیح بخاری باب کتابۃ العلم [۳] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۳۵ [۴] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۲۵

اللہ علیہ وسلم سے سن کر میں نے لکھا ہے[1] یہ صحیفہ حضرت عبداللہؓ بن عمرو کی وفات پر ان کی پوتے شعیب بن محمد بن عبداللہ کو ملا تھا اور شعیب سے ان کے صاحبزادے عمرو روایت کرتے ہیں[2]، چنانچہ حدیث کی کتابوں میں جتنی روایتیں اس سلسلہ سے منقول ہیں وہ سب صحیفہ صادقہ کی حدیثیں ہیں۔

(۲) سعید بن ہلال کا بیان ہے کہ ہم جب حضرت انسؓ سے زیادہ پوچھ گچھ لگاتے تو وہ اپنے پاس سے ایک نوشتہ نکالتے اور فرماتے کہ یہ ہیں، وہ حدیثیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنیں اور انکو لکھا اور لکھ کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر پیش کرچکا ہوں[3]۔

(۳) امام ترمذی نے کتاب العلل میں عکرمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے، اور ان کے سامنے ان کی کتابوں کو پڑھنے لگے[4]۔

(۴) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس ایک صحیفہ تھا، جس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بجز قرآن کے اور جو کچھ اس صحیفہ میں درج ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھا، یہ صحیفہ چمڑے کے ایک تھیلہ میں تھا، جس میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار بمع نیام کے رکھی رہتی تھی[5]۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمن ایک کتاب نکال کر لائے اور قسم کھا کر کہا کہ یہ خود حضرت عبداللہ بن مسعود کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے[6]۔

---

[1] سنن دارمی جلد ۱ ص ۲۹ [2] جامع ترمذی جلد ۱ ص ۴۳ [3] مستدرک حاکم [4] جامع ترمذی کتاب العلل [5] صحیح مسلم باب تحریم الذبح لغیر اللہ [6] جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۱۷

(٦) حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں امام حسن بصری کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت سمرہؓ بن جندب سے حدیث کا ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا ہے، جس کی بیشتر حدیثیں سنن اربعہ میں منقول ہیں، علی بن المدینی اور امام بخاری دونوں نے تصریح کی ہے کہ اس نسخہ کی سب حدیثیں ان کی مسموعہ تھیں، لیکن یحییٰ بن سعید القطان اور دیگر علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ سب نوشتہ سے روایت ہیں، اس نسخہ کو امام حسن کے علاوہ حضرت سمرہؓ بن جندب کے صاحبزادے سلیمان بن سمرہ بھی ان سے روایت کرتے ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

روی عن ابیه نسخة کبیرة۔[1]

ہم نے صحابہؓ کرام کی چند مشہور تحریروں کا یہاں ذکر کیا ہے، ورنہ ان کے تمام نوشتے جس میں کسی حدیث کے لکھنے کا ذکر ہے، اس پر مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

عہدِ نبوتؐ کا تحریری سرمایہ

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد نبوتؐ اور دورِ صحابہؓ میں کس قدر احادیث کا سرمایہ تحریری شکل میں آچکا تھا؟ اگر غور و فکر وتحقیق و جستجو سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ حدیث نبویؐ کی اشاعت جس طرح تواتر علمی و روایت دونوں ذریعوں سے مسلسل ہوتی رہی ہے اسی طرح آج ہمارے پاس جو حدیث کا سرمایہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے، اس کا غالب ترین حصہ دورِ نبوتؐ ہی میں قلم بند ہو چکا تھا، حاکم صاحب مستدرک جو نقد روایت میں تساہل مشہور ہیں، وہ اپنے تلاش و جستجو کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کی صحیح حدیثوں کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے انکے الفاظ یہ ہیں:" والاحادیث

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۹۸

التی فی الدرجة الاولیٰ لا تبلغ عشرة الاف[۱] ۔ اعلےٰ درجے کی حدیثوں کی تعداد دس ہزار تک نہیں پہنچ پاتی۔

ہر طرح کی روایات جو مسانید و جوامع، سنن و معاجم اور فوائد و رسائل میں موجود ہیں، انکی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے بھی کم ہے[۱]، ان تمام کتابوں سے چھان بین کر جو تعداد حاکم نے اعلیٰ درجے کی حدیثوں کی پیش کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس بیان کو بھی سامنے رکھئے کہ عبد اللہؓ بن عمرو بن العاص کو مجھ سے زیادہ حدیثیں اس لئے یاد تھیں کہ وہ لکھتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا، محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ۵۳۷۴ ہے، اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کی حدیثوں کی تعداد یقیناً پانچ ہزار تین سو چوہتر ۵۳۷۴ سے زائد ہونی چاہیئے، جو قید تحریر میں آچکی تھیں، حضرت عبد اللہؓ بن عمرو کے علاوہ دیگر صحابہؓ کرام کے نوشتے اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سیکڑوں احکامات و ہدایات جو آپؐ نے املا کرایا تھا، ان سب کی مجموعی تعداد اگر جوڑ لی جائے تو اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ دس ہزار سے زیادہ حدیثیں دورِ نبویؐ اور عہد صحابہؓ میں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں۔

البتہ ایک شبہہ یہاں یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ جہاں حفاظ حدیث کی روایات کی تعداد ذکر کی جاتی ہے، وہاں ان کی تعداد بہت زائد بتائی گئی، مثلاً کہا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو سات لاکھ سے زائد قابل اعتماد حدیثوں کا حصہ محفوظ تھا، حافظ ابو زرعہ رازی کی حدیثوں کی تعداد سات لاکھ بتائی گئی ہے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں، امام مسلم کا دعوےٰ ہے کہ میں نے اپنی جامع صحیح

---

[۱] توجیہ النظر ص ۹۳

کو تین لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا ہے، حافظ ابن الجوزی ان اعداد کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں،" ان المراد بھذا العدد الطرق لا المتون"[1]، یعنی ان اعداد سے مراد حدیثوں کے متون نہیں بلکہ طرق واسانید مراد ہیں، مثلاً ایک ہی حدیث کو کسی شخص نے دس شاگردوں سے بیان کیا تو محدثین کی اصطلاح میں اس کے دس طرق و دس اسانید ہوگئے، اور ایک کے بجائے ان مختلف طریقوں سے اس کا شمار کیا جائے گا، جیسے "انما الاعمال بالنیات" کی حدیث سات سو طریقوں سے روایت کی گئی ہے اس لئے اس ایک حدیث کی تعداد سات سو ہو جاتی ہے، یہی حال اکثر وبیشتر حدیثوں کا ہے، صحیح بخاری جس کے غیر مکرر روایات کی تعداد دو ہزار چھ سو دو ۲۶۰۲ اور صحیح مسلم کی چار ہزار ۴۰۰۰ ہے، ان دونوں کتابوں کی اکثر روایات میں اشتراک بھی ہے، محدث جوزقی نے ان دونوں کتابوں کی احادیث کا اتخراج دیگر کتب سے کیا تو اسانید کی تعداد پچیس ہزار چار سو اسی ۲۵۴۸۰ ہوگئی۔

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ صحابہؓ کرام کے اقوال وفتاوے بلکہ تابعین وتبع تابعین کی چیزوں کو بھی لوگوں نے حدیث کے نیچے درج کیا، اس لئے بھی قدرتاً حدیثوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔[2]

تابعینؒ اور کتابت حدیث

ایک غلط فہمی یہ پیدا کی جارہی ہے کہ احادیث کی تدوین وتحریر کا کام تابعین نے شروع کیا اور تابعین ان کو کہتے ہیں، جنہوں نے صحابہؓ کو دیکھا اور ان سے فیض پایا اور صحابہؓ کا زمانہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد تقریباً سو سال تک رہا، گویا تابعین کا عہد سو سال بعد شروع ہوا، اسطرح تدوین وتحریر کے سلسلہ کا آغاز سو سال بعد ہوا، حالانکہ یہ تمام تر غلط ہے،

---

[1] تلقیح فہوم اہل الاثر ص ۱۸۷ [2] توجیہ النظر ص ۹۳

تابعین ان کو کہتے ہیں، جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل نہیں کیا اور صحابہؓ کی زیارت کی اور ان سے مستفید ہوئے عام اس سے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ہوں مگر زیارت کا موقع نہیں ملا یا عہد نبویؐ کے اخیر میں پیدا ہوئے اس لئے آپؐ سے فیضیاب نہیں ہو سکے یا آپؐ کی وفات (۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ) کے بعد پیدا ہوئے، وہ سب تابعین میں داخل ہیں، اس طرح دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تابعین کا عہد آپؐ کی زندگی ہی میں اور کم سے کم یہ کہ ۱۱ھ سے شروع ہو گیا تھا، اس لئے ۱۱ھ سے جو کام شروع ہوا اس کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ تابعین نے اس کام کا آغاز کیا، تابعین کا کارنامہ ہونے کے لئے ایک ایک صحابیؓ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی سو برس کا زمانہ گزارنے کی حاجت ہے، وہ تو تابعیت کا آخری عہد ہے، جس کے بعد تابعیت کے شرف کا خاتمہ ہوتا ہے کیونکہ یہی صحابہؓ کے عہد کا خاتمہ ہے، جن کے دیدار سے تابعی بنتے تھے، الغرض اس تفصیل سے ثابت ہوا، کہ یہ کہنا کس درجہ کا دھوکا ہے کہ مسلمانوں میں احادیث کی تدوین و تحریر کا کام سو برس بعد شروع ہوا[1] تابعین کے ذریعے کتابت حدیث کو اور زیادہ رواج ہوا، اب ہم یہاں ان کے بعض نوشتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

(۱) حضرت ابوہریرہؓ کے مشہور شاگرد بشیر بن نہیک نے ایک نسخہ خود ان کی حدیثوں کا تیار کر کے ان کو پڑھ کر سنایا تھا روایت کے الفاظ یہ ہیں، عن بشیر بن نہیک قال کنت اکتب ما اسمع من ابی ھریرۃؓ فلما اردت ان افارقہ اتیتہ بکتابتہ فقرأتہ علیہ وقلت اھٰذا ما سمعت منک قال نعم[2]" میں حضرت ابوہریرہؓ

[1] خطبات مدراس و توجیہ النظر ص۱۷۳ [2] سنن دارمی باب من رخص کتابۃ العلم۔

سے جو حدیثیں سنتا تھا لکھ لیتا تھا، پھر جب میں نے ان سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا تو اس کتاب کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اس کو ان کے سامنے پڑھ کر سنایا اور پھر ان سے عرض کیا کہ یہ سب وہی حدیثیں ہیں، جو آپ سے میں نے سنی ہیں، فرمانے لگے "ہاں!"

(۲) حضرت ابوہریرہؓ کے دوسرے شاگرد ہمام بن منبہؒ ہیں جو یمن کے امراءمیں سے تھے، ایک زمانے تک ان کی خدمت میں رہے، اور ان کی حدیثوں کو جمع کیا جو صحیفہ ہمام کے نام سے مشہور ہے، امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کا بہت بڑا حصہ اپنی مسند میں داخل کر دیا ہے، شیخین نے بھی متفرق طور پر اس سے روایت کیا ہے[1]، آج یہ صحیفہ حیدرآباد سے چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔

(۳) سعید بن جبیر مشہور تابعی فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا صحیفہ میں لکھتا رہتا تھا[2]۔

(۴) سنن دارمی میں مسلم بن قیس کا بیان مذکور ہے۔ رأیت ابان یکتب عند انس "میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں[3]۔"

(۵) عمرۃ بنت عبدالرحمٰن جنہوں نے حضرت عائشہؓ کی گود میں پرورش پائی تھی، اور حدیث عائشہؓ کے باب میں ان کا شمار تقریباً عروہ کے برابر ہے، ان ہی عمرۃ بنت عبدالرحمٰن کے علم کو ان کی بہن کے لڑکے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے مشہور فرمان کی بنیاد پر (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) جمع کر لیا تھا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ان یکتب لہ فی العلم ما عندہ من عمرۃ بنت عبدالرحمٰن والقاسم بن محمد[3]۔

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ ہمام بن منبہؒ۔ [2] سنن دارمی [3] تہذیب التہذیب ترجمہ ابوبکر بن حزم۔

یہ کہ وہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے علم (احادیث) کو ان کیلئے تیار کریں۔

قاسم بن محمد حضرت صدیقہؓ کے بھتیجے تھے، ان کے پروردہ و تربیت یافتہ تھے۔ جنہوں نے سب کچھ ان سے سیکھا تھا، بہرحال حضرت عائشہؓ کی احادیث ان ہی دونوں کے ذریعے ابوبکر بن محمد نے جمع کیں۔

ہم نے تابعین کرام کی چند تحریروں اور صحیفوں کے ذکر پر اکتفا کیا ورنہ یہ حضرات مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، انہوں نے صحابہؓ کی زندگی ہی میں ان کی تمام مرویات و واقعات و حالات کو ایک ایک سے پوچھ کر، ایک ایک کے دروازہ پر جاکر بوڑھے، جوان عورت و مرد ہر ایک سے تحقیق کرکے ہمارے لئے فراہم کر دیا تھا، محمد بن شہاب زہری جو حدیث و سیرت کے بڑے امام ہیں، انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک چیز کو لکھا۔ ابوالزناد کہتے ہیں کہ ہم صرف حلال و حرام لکھتے رہتے تھے، زہری جو کچھ سنتے تھے، وہ سب لکھتے جاتے تھے[۱]، احادیث کو قید تحریر میں لانے والے سیکڑوں تابعین تھے جن میں صرف امام زہری کی تحریروں کا اتنا انبار تھا کہ ولید بن یزید کے قتل کے بعد زہری کے یہ دفتر جانوروں پر بار کرکے خزانہ سے لائے گئے تھے[۲]۔

اگرچہ حفاظت حدیث کے لئے کتابت و حفظ ان دونوں طریقوں کو اختیار کیا گیا تھا، مگر پہلی صدی تک علماء عام طور پر کتابت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ جو کچھ لکھتے تھے اس سے مقصود زبانی یاد کرنا ہوتا تھا۔

امام مالک سلف یعنی بہت سے تابعین کا یہ دستور بیان کرتے ہیں کہ ان میں بعض لوگ حدیثوں کو لکھ کر یاد کرتے تھے اور جب یاد ہو جاتی تھیں تو مٹا دیتے تھے[۳]، یہ دستور ایک

---

[۱] جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۳۷ [۲] طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۱۳۵ [۳] جامع بیان العلم جلد ۱ ص ۶۴

زمانے تک رہا، محمد بن سیرین کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کا بھی قاعدہ تھا کہ حدیثوں کو لکھ لیتے تھے۔ فاذا حفظہ محاہ[1]۔ یعنی جب یاد کر لیتے تھے تو مٹا دیتے تھے، اس کی وجہ یہی ہے کہ عربوں کا حافظہ فطرۃً نہایت ہی قوی تھا، علامہ ذہبی نے ابن خزیمہ کے متعلق یہ الفاظ ابو علی نیشاپوری کے حوالہ سے نقل کئے ہیں کہ "کان ابن خزیمۃ یحفظ الفقہیات من حدیثہ کما یحفظ القرآن[2]"۔ فقہی حدیثوں کو ابن خزیمہ اسی طرح یاد کرتے تھے، جیسے کہ قاری قرآنی سورتوں کو یاد کرتا ہے۔

قتادہ تابعی فرماتے ہیں کہ "اعطی اللہ ھذہ الامۃ من الحفظ مالم یعط احداً من الامم خاصۃً خصھم بھا وکرامۃ اکرمھم بھا[3]" یعنی حق تعالےٰ شانہ نے اس امت (امت محمدیہ) کو حفظ و یادداشت کی غیر معمولی قوت سے سرفراز فرمایا ہے کہ دنیا کی قوموں اور امتوں کے درمیان (امت اسلامیہ) کا یہ خاص امتیازی سرمایہ ہے جس کے ساتھ خدا نے اس کو مختص کیا اور یہ نوازش ہے جس کے ذریعے نوازا گیا۔

تدوین حدیث پہلی صدی کے اختتام تک کتابت حدیث کا مسئلہ نہایت مختلف فیہ رہا مگر قرآن مجید کی اس قدر اشاعت ہو چکی تھی کہ اب اس سے التباس و اشتباہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، اور اسلام عرب سے باہر عجم کے بہت سے ملکوں پر حکمران تھا، بکثرت لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، نئے مسائل اور نئے حالات سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، اس وقت فوری ضرورت تھی کہ حدیث و سنّت کے سرمایہ کو جو صحابہؓ و تابعین سے منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا، مدون کیا جائے اور وہ علم جو محدثین کے سینوں اور منتشر سفینوں میں تھا اس کو محفوظ کیا جائے۔

---

[1] ابن سعد جلد ۷، ص ۱۰۸ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۶۱ [3] زرقانی جلد ۵ ص ۳۹۵

ادھر وہ متبرک نفوس جنہوں نے براہ راست زبان نبوت سے احادیث سنی تھیں اور آپؐ کی زندگی کے ہر خد و خال کو محفوظ کئے ہوئے تھے، یعنی صحابہؓ کرام ان کے وجود سے بزم عالم خالی ہو رہی تھی۔

جب خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ صفر ۹۹ھ میں منصب خلافت پر فائز ہوئے جن کی ذات سرتاپا اسلام کا اعجاز تھی، اور خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، انہوں نے دیکھا کہ روافض و خوارج اور قدریہ وغیرہ نئے نئے فرقے سر اٹھا رہے ہیں، اس لئے حدیث و سنت کے باقاعدہ تدوین کی ضرورت ہے۔

قاضی ابوبکر بن حزم خزرجی انصاری المتوفی ۱۲۰ھ جو بڑے پایہ کے عالم تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں جس قدر قضا کا ان کو علم تھا اور کسی کو نہیں تھا حضرت عمرؓ ابن عبد العزیز کے زمانے میں مدینہ کے قاضی آپ ہی تھے، اس لئے ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا "انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فاکتبہ لی فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء"[۱] آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ علم مٹ جائے گا اور علماء رخصت ہو جائیں گے۔

خاص طور سے تعین کے ساتھ عمرہ بنت عبد الرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد کے ذخیرہ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کیا جائے[۲]، خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے جو فرمان بھیجا تھا امام محمد نے اپنی مؤطا میں زیادہ تفصیل سے نقل کیا ہے، "ان عمر ابن عبد العزیز کتب الیٰ ابی بکر بن عمرو بن حزم ان انظر ما کان من حدیث

---

[۱] صحیح بخاری باب کیف یقبض العلم [۲] تہذیب التہذیب ترجمہ ابوبکر بن حزم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوسنۃ اوحدیث عمرؓ او نحو ھٰذا فاکتبہ لی فانی خشیت دروس العلم و ذھاب العلماء[۱]" حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن عمرو بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور سنت نیز حضرت عمرؓ کی حدیثیں اور اسی قسم کی جو روایات مل سکیں ان سب کو تلاش کر کے مجھے لکھو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علمار کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حدیث وسنت کے ساتھ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ کے آثار کو بھی جمع کرنے کا حکم دیا تھا، مگر افسوس کہ قاضی صاحب کے کام کی ابھی تکمیل نہ ہوسکی تھی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ۲۵ رجب ۱۰۱ھ میں رحلت فرماگئے، آپ کی مدت خلافت ۲ سال ۵ ماہ تھی، حافظ ابن عبدالبر مالکی التمہید میں امام مالک کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ابن حزم نے متعدد کتابیں لکھیں قبل اس کے کہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں بھیجیں خلیفہ راشد وفات پا چکے تھے[۲]، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے عمال سلطنت اور مشاہیر علمار کو بالخصوص اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا اور گشتی فرمان جاری کیا کہ" انظروا الی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ[۳]" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کرو، خلیفہ راشد کا یہ فرمان تو تمام ذمہ داروں کے نام تھا مگر خصوصیت سے ابوبکر بن حزم کے علاوہ امام محمد بن شہاب الزہری المتوفی ۱۲۵ھ کو بھی اس خدمت پر مامور کیا تھا، امام زہری کا حال ان کے رفیق درس صالح بن کیسان سے سنئے، کہتے ہیں کہ ہم اور زہری دونوں طلب علم میں ساتھ تھے، زہری نے آثار صحابہؓ

---

[۱] مؤطا باب اکتساب العلم [۲] مقدمہ تنویر الحوالک [۳] فتح الباری باب کیف یقبض العلم۔

کو بھی لکھا اور ہم نے نہیں لکھا وہ کامیاب ہوئے اور ہم ضائع ہ[۱] یہ امام موصوف کے دورِ طالب علمی کا حال تھا، خود عمر بن عبدالعزیز شہادت دیتے ہیں کہ" لم یبق احد اَعلم بسنة ماضية من الزهرى[۲] " گزشتہ سنت کا زہری سے بڑھ کر کوئی عالم باقی نہیں رہا۔

حافظ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں امام زہری کا بیان نقل کرتے ہیں،" امرنا عمر بن عبد العزيز بجمع السنن فكتبنا ها دفتراً دفتراً فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفتراً[۳] " ہم کو عمر بن عبدالعزیز نے سنن کے جمع کرنے کا حکم دیا ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے، اور پھر انہوں نے ہر اس زمین پر کہ جہاں ان کی حکومت تھی ایک دفتر بھیج دیا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام موصوف نے قاضی ابوبکر ابن حزم سے پہلے اس فن کی تدوین کر لی تھی، چنانچہ ان کی جمع کردہ کتابوں کو مختلف شہروں میں عمر بن عبدالعزیز نے بھیج دیا تھا، اس لئے حافظ ابن عبدالبر مالکی فرماتے ہیں کہ اولیت کا سہرا امام زہری کے سر ہے، چنانچہ جامع بیان العلم میں امام مالک اور امام عبدالعزیز دراوردی دونوں کا قول نقل کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ اس علم کے سبب سے پہلے مدون ابن شہاب ہیں[۴]، حافظ ابن حجر کی بھی یہی رائے ہے، فرماتے ہیں"۔ اول من دون الحديث ابن شهاب[۵] " علامہ سیوطی نے بھی محمد بن مسلم بن شہاب زہری کو پہلا مدون بتایا ہے[۶]۔

محققین کی ایک جماعت نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، البتہ امام بخاری کا رجحان

---

[۱] تہذیب التہذیب [۲] تذکرہ [۳] جامع بیان العلم باب ذکر الرخصة فی کتابة العلم ۔ [۴] حوالہ مذکور [۵] فتح الباری جلد ۸ صـ ۸۱۵ وجلد ا باب کتابت الحدیث [۶] تدریب۔

قاضی ابوبکر بن حزم کی طرف ہے، جیسا کہ تعلیقاً صحیح بخاری میں مذکورہ بالا روایت سے ظاہر ہے، چونکہ تدوین کا کام مختلف علماء نے شروع کیا تھا، اس لئے حدیث کا اول مدون مختلف حضرات کو کہا گیا ہے، مگر یہ اولیت کسی خاص شہر کے لحاظ سے ہو سکتی ہے، یا یہ حضرات ایک ایک باب کی احادیث جمع کرتے تھے، لیکن امام زہری کو مطلقاً (تمام بلاد اسلامیہ اور مختلف ابواب کی روایت جمع کرنے کے لحاظ سے) اولیت کا شرف حاصل ہے۔[1]

ائمہ اربعہ اور تدوین حدیث

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالے نے جمع وتدوین کا دروازہ کھولا اور آئندہ چل کر اس سلسلے کو بہت ترقی ہوئی، قاضی ابوبکر بن حزم اور امام زہری کے علاوہ مختلف ائمہ تابعین نے تصنیف وتالیف میں توجہ ودلچسپی لی، چنانچہ دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے، ابن جریج مکی المتوفی ۱۵۰ھ ابن اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ سعید بن عروبہ المتوفی ۱۵۶ھ معمر یمنی المتوفی ۱۵۳ھ ربیع بن صبیح المتوفی ۱۶۰ھ کے مجموعے خاص طور پر مشہور رہیں، امام ابوحنیفہ المتوفی ۱۵۰ھ امام مالک المتوفی ۱۷۹ھ امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ امام احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ -- چار دبستان فکر کے مالک ہیں، جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں مقبول وزندہ ہے، یہ اللہ کا بڑا فضل اور اسلام کی اقبال مندی تھی کہ اس کار عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے جو وقت کے نئے حالات ومسائل سے آگاہ، اسلام کی تاریخ وروایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت رکھتے تھے، عہد صحابہؓ اور اسلام کے پورے ذخیرے (قرآن وحدیث اور لغت وقواعد) پر کامل عبور رکھتے تھے، ان ائمہ اربعہ کا تدوین حدیث

---

[1] مقدمہ شرح قسطلانی۔

میں بھی عظیم کارنامہ ہے، کتاب الآثار و مؤطایہ دونوں حدیث کی ایسی کتابیں ہیں جو پہلے فقہی تربیت کے لحاظ سے مرتب کی گئیں۔

امام شافعی کی اگرچہ فن حدیث پر کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے مگر اس مقدس فن کی جو خدمت ان سے انجام پائی اس کو تاریخ تدوین حدیث میں فراموش نہیں کیا جا سکتا، اور امام احمد کی مسند تو معروف و مشہور ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کتاب الاستغاثہ میں جو بکری کے رد میں تحریر فرمائی ہے، لکھتے ہیں، ائمہ میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں، جو محدثین میں بھی امام ہیں، اور فقہاء میں بھی اور ان دونوں جماعتوں میں شامل ہیں، گو ان میں سے ایک جماعت کی طرف ان کا انتساب زیادہ موزوں ہے، اس سے آگے یہ عبارت ہے:" واکثر ائمة الحدیث والفقه کمالك والشافعی واحمد واسحٰق بن راھویه وابی عبید وکذلك [illegible] والثوری واللیث ھؤلاء وکذلك لابی یوسف صاحب ابی حنیفة لابی حنیفة ایضًا ماله من ذلك ولکن لبعضهم فی الامامة فی الصنفین مالیس للآخر وفی بعضهم من ضعف المعرفة باحد الصنفین مالیس فی الأخر فرضی الله عن جمیع اھل العلم والایمان[1]۔"

اور حدیث و فقہ کے اکثر امام جیسے کہ امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق بن راہویہ، ابو عبید اور اسی طرح اوزاعی، ثوری اور لیث ایسے ہی تھے، اور اسی طرح امام ابو یوسف صاحب امام ابی حنیفہ اور خود امام ابو حنیفہؒ کا بھی وہی مرتبہ ہے، جو ان کے شایان ہے، لیکن ان میں بعض کو دونوں صنف میں وہ مقام حاصل ہے جو دوسرے کو نہیں ہے اور

---

[1] کتاب الاستغاثہ ص۲۴

بعض کو ایک صنف کی معرفت میں وہ ضعف بھی ہے کہ جو دوسرے میں نہیں ہے، پس اللہ تعالے تمام اہل علم وایمان سے راضی ہو۔

حافظ ابن تیمیہ نے بھی ائمہ اربعہ کو محدثین کا امام قرار دیا ہے، اس لئے آئندہ صفحات میں ارباب صحاح ستہ کے ذکر سے پہلے ان کے حالات اور علم حدیث میں انکی تصنیفات وخدمات پیش کی جارہی ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ ان حضرات ائمہ نے اس مقدس فن کی خدمت کو کس طرح زیادہ علمی وترقی یافتہ شکل میں انجام دیا۔

○

امام اعظم ابوحنیفہؒ

نام ونسب نعمان نام، کنیت ابوحنیفہ، امام اعظم لقب، شجرۂ نسب یہ ہے، نعمان بن ثابت بن زوطی، عام طور پر امام صاحب کا عجمی النسل ہونا مسلّم ہے، خطیب بغدادی اور مورخ ابن خلکان نے امام صاحب کے پوتے اسماعیل کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے کہ ہم پر کبھی غلامی کا دور نہیں آیا، ہم لوگ فارسی نسل کے ہیں، ہمارے دادا امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے، ثابت بچپن میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، انہوں نے ان کے اور ان کے خاندان کے لئے دعا کی تھی، ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہ ہوئی،[1] سن پیدائش کو ۶۱ھ بھی بتایا گیا ہے[2]۔

سکونت کوفہ امام صاحب کا مولد ومسکن ہے جو اسلام کی وسعت دامن کا دیباچہ تھا، علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں، حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد علم نبوت کے تین مراکز تھے، مکہ، مدینہ اور کوفہ، مکہ معظمہ کے صدر معلم حضرت ابن عباس تھے اور مدینہ کے

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۰۷   [2] مقدمہ اوجز المسالک ص ۵۶

حضرت ابن عمرؓ اور کوفہ کے حضرت عبدؓ اللہ بن مسعود تھے[1]، حضرت علیؓ نے اس شہر کو دار الخلافہ بنایا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں،" کان اغلب قضایاہ بالکوفۃ[2]" حضرت علیؓ کے بیشتر فیصلے کوفہ سے صادر ہوئے تھے، کوفہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے عہد فاروقی میں قرآن وسنت کا دار العلوم بن چکا تھا، حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:" ولما ذھب (علیؓ) إلی الکوفۃ کان اھل الکوفۃ قبل ان یاتیھم قد اخذوا الدین عن سعد بن ابی وقاص وابن مسعود وحذیفۃ وعمار وابی موسیٰ وغیرھم ممن ارسلہ عمر الی الکوفۃ[3]" جب حضرت علیؓ کوفہ تشریف لے گئے ہیں، تو اہل کوفہ آپ کے وہاں آنے سے پیشتر حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت عمار، حضرت ابوموسیٰ وغیرہ (رضی اللہ عنہم) سے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ روانہ کیا تھا، دین حاصل کر چکے تھے۔

صحابہؓ کرام میں سے ایک ہزار پچاس حضرات جن میں چوبیس وہ بزرگ ہیں جو غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے تھے، وہاں گئے اور سکونت اختیار کی[4]۔

اور امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ عجلی (م ۲۶۱ھ) نے اس سے زیادہ تعداد بتائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ آکر اترے[5]، علامہ نووی نے کوفہ کو دار الفضل والفضلاء کا لقب دیا ہے[6]۔

تحصیل علم

امام صاحبؒ بیس سال کی عمر میں تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے سب سے پہلے ادب وانساب اور اس کے بعد خصوصاً علم کلام حاصل

---

[1] اعلام الموقعین [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ا ص ۱۳۲ [3] منہاج السنۃ جلد ۴ ص ۱۵۷

[4] فتح المغیث ص ۳۸۳ [5] فتح القدیر جلد ا ص ۴۲ [6] شرح مسلم باب القراۃ فی الظہر والعصر

کیا کچھ عرصہ کے بعد فقیہ وقت امام حماد کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے، حضرت حماد جو مشہور امام اور استاد وقت تھے، بڑے بڑے تابعین سے استفادہ کر چکے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث وفقہ کا جو سلسلہ چلا آرہا تھا، اس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا، حضرت حماد کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا[1]،

امام صاحب نے اگرچہ مختلف اساتذہ سے فقہ وحدیث کی تحصیل کی ہے، لیکن خصوصیت سے حضرت حماد کے تربیت یافتہ ہیں، کوفہ میں کوئی محدث باقی نہ تھا، جس کے سامنے امام صاحب نے زانوئے شاگردی تہ نہ کیا ہو، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے امام صاحب کے شیوخ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے[2]، علامہ سیوطی نے تبییض الصحیفہ میں اور کردری نے مناقب ابی حنیفہ میں امام صاحب کے بہت سے شیوخ واساتذہ کے نام گنائے ہیں، اور مولانا عبدالحیؒ صاحب نے بھی التعلیق الممجد میں بہت سے شیوخ کا تعارف کرایا ہے۔

امام صاحب کے شیوخ کی یہ خصوصیت ہے، جیسا کہ علامہ شعرانی کہتے ہیں کہ امام صاحب نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے، اس کو خیار تابعین سے حاصل کیا ہے، جس کی سند میں کوئی بھی راوی متہم بالکذب نہیں ہے، اگر امام صاحب کے مسلک کے دلائل میں کوئی ضعف بیان کیا گیا ہے تو وہ مابعد کے رواۃ کے لحاظ سے ہے، امام صاحب کے شیوخ فقہ وحدیث دونوں کے جامع تھے[3]۔

حرمین وغیرہ کا سفر | اس زمانے میں حج استفادہ وافادہ کا بڑا ذریعہ تھا، تمام

---

[1] السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی از مصطفےٰ اسباعی۔ [2] شرح سفر السعادت ص ۲۰۔

[3] مسند امام از خوارزمی۔

ممالک اسلامیہ کے گوشے گوشے سے اہل کمال آکر جمع ہو جاتے تھے، اور درس و افتار کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، امام ابوالحسن مرغینانی نے بسند نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے پچپن ۵۵ حج کئے تھے[۱] حرمین کے شیوخ میں سے عطار ابن رباح سے مکہ معظمہ میں اور سالم بن عبداللہ اور سلیمان سے مدینہ طیبہ میں خصوصیت سے حدیثیں روایت کی ہیں، امام باقر کی خدمت میں ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے حاضر رہے ہیں[۲]، علاوہ ازیں ۱۳۰ھ سے لے کر منصور عباسی کے زمانۂ خلافت تک جس کو چھ سال کا عرصہ ہوتا ہے، آپ کا مستقل طور پر قیام مکہ معظمہ ہی میں رہا[۳]۔ بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ کا سفر کیا، اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب نے مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، غرضکہ عراق و حجاز دونوں جگہوں کی روایات کو حاصل کیا۔

تلامذہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ کا احصار دشوار ہے واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ بعض ائمہ نے کہا ہے کہ ائمہ اسلام میں اتنے شاگرد و تلامذہ کسی اور امام کے نہیں ہوئے، علامہ کروری نے آٹھ سو فقہار و محدثین کو آپ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے، ابن حجر مکی کہتے ہیں کہ جس طرح فقہار میں امام ابویوسف و امام محمد و امام زفر و امام حسن بن زیاد وغیرہ ہیں، اسی طرح محدثین میں عبداللہ بن مبارک، لیث ابن سعد، امام مالک اور مسعر بن کدام اور صوفیار میں فضیل بن عیاض، داؤد طائی جیسے ائمہ کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے[۴]، امام صاحب نے اپنے اصحاب و تلامذہ کی ایک مجلس مرتب کی تھی، جس میں مختلف مسائل پیش کئے جاتے تھے، غور و فکر کے

۱؎ مناقب الامام از موفق جلد ۱ ص۲۵۳ ۲؎ عقود الجمان ۳؎ مناقب الامام جلد ۲ ص۲۴

۴؎ مقدمہ اوجز ص۶۸

بعد جب کسی نتیجہ پر سب لوگ متفق ہو جاتے تھے، تو اس کو قلم بند کیا جاتا، یہ مجلس چالیس ارکان پر مشتمل تھی۔[۱]

زہد و تقویٰ

عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ پہنچ کر دریافت کیا کہ یہاں پر سب سے زیادہ پارسا کون ہے؟ تو لوگوں نے کہا ابو حنیفہؒ خود انہیں کا بیان ہے کہ میں نے امام حنیفہؒ سے بڑھ کر کسی کو پارسا نہیں دیکھا، حالانکہ مال و دولت سے ان کی آزمائش کی گئی تھی، زربجزی امام صاحب کے حالات بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب حضرت ابو بکر صدیقؓ کے افعال و اقوال اور اخلاق اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے، کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صحابہؓ میں افضل اور علم و فقہ، پرہیز گاری اور سخاوت میں سب سے آگے تھے، اسی طرح امام صاحب تابعین کی جماعت میں ہیں۔[۲]

امام صاحب کی ایک اہم فضیلت

بخاری و مسلم اور ابو نعیم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے، طبرانی و احمد نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا "لو کان العلم بالثریا لتناولہ اناس من ابناء فارس[۳]"، اگر علم ثریا کے پاس ہو تو فارس کے کچھ لوگ اس کو حاصل کریں گے، آپ کی اس پیشین گوئی کے اولین مصداق علامہ سیوطی ابن حجر مکی اور عام طور پر علماء نے امام ابو حنیفہؒ کو قرار دیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں "فقیر گفت امام ابو حنیفہؒ دریں حکم داخل است[۴]"، فقیر یعنی شاہ صاحب نے فرمایا کہ امام ابو حنیفہؒ اس حکم میں داخل ہیں۔

---

[۱] حسن التقاضی از علامہ زاہد کوثری ص۱۲ [۲] مقدمہ اوجز المسالک ص۵۹

[۳] مسند امام احمد جلد ۲ ص۲۹۶ [۴] کلمات طیبات ص۱۶۸

ذکاوت و ذہانت

امام صاحب کی ذہانت ۔ طباعی مشہور ہے، علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں" کان من اذکیاء بنی آدم" یعنی اولاد آدم میں جو ذکی گزرے ہیں، امام صاحب ان میں شمار کئے جاتے ہیں، امام صاحب کی ذہانت وفراستِ عقل کو سب نے تسلیم کیا ہے، محمد انصاری کہتے تھے کہ امام ابوحنیفہ کی ایک ایک حرکت حتیٰ کہ بات چیت میں دانشمندی کا اثر پایا جاتا تھا، علی بن عاصم کا قول تھا کہ اگر آدھی دنیا کی عقل ایک پلّے میں اور دوسرے پلّے میں حضرت امام ابوحنیفہ کی عقل رکھی جائے تو امام صاحب کا پلّہ بھاری ہوگا ۔

امام صاحب کا علمی مرتبہ

امام وکیع فرماتے ہیں کہ میں کسی عالم سے نہیں ملا جو امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ فقیہ ہو اور ان سے بہتر نماز پڑھتا ہو[1]، نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ فقہ سے لوگ غافل تھے تو امام صاحبؒ نے بیدار کیا، اس کو مرتب وملخص کیا، سفیان ثوری نے ایک شخص سے فرمایا جو امام صاحب کی مجلس سے واپس آیا تھا کہ" روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے واپس آرہے ہو، خارجہ بن مسیب اور عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ علم وعقل میں امام ابوحنیفہؒ کی نظیر نہیں (علم سے مراد اس دور میں علم حدیث ہی ہوتا تھا) سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ اپنے زمانے کے عالم تھے، اور اس کے بعد امام شعبی اپنے زمانے کے عالم ہوئے اور اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ یعنی یہ تینوں اپنے اپنے دور میں بے مثال تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کی نظیر میری آنکھوں نے نہیں دیکھی[2]، امام شافعی فرماتے تھے کہ جس کو فقہ کی معرفت منظور ہو وہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کو لازم پکڑے ۔

---

[1] حدائق جلد ۱ ص ۱۹۷ [2] موفق جلد ۲ ص ۱۵

امام صاحب کی تابعیت کی بحث

امام صاحب کے آغاز شباب تک چند صحابہ کرامؓ زندہ تھے جیسے حضرت انسؓ بن مالک جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے، ۹۳ھ میں وفات پائی، ابو الطفیلؓ عامر بن واثلہ نے ۱۰۲ھ میں، عبداللہؓ بن بسر المازنی نے ۹۶ھ میں وفات پائی، بہرحال جمہور محدثین و محققین کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ امام صاحب نے جن آنکھوں سے پیغمبرؐ کا جمال دیکھا تھا، ان کے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کی تھیں، بعض حضرات نے امام صاحب کی تابعیت کا انکار کیا ہے لیکن جمہور محدثین کا اس پر اتفاق ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ حضرت انسؓ کو بار بار دیکھا ہے[۱]، شیخ الاسلام حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ میں کوفہ میں کئی صحابہ کرامؓ جمع تھے، لہٰذا امام صاحبؒ کا طبقہ تابعین میں ہونا ثابت شدہ حقیقت ہے یہ فضیلت دیگر ائمہ میں سے کسی کو حاصل نہیں ہوئی جیسے امام مالکؒ و امام اوزاعی وغیرہ[۱]، صاحب اکمال بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب نے چھبیس ۲۶ صحابہ کرامؓ کو دیکھا ہے، اسلئے تمام محدثین کبار مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی، علامہ ذہبی، علامہ نووی، زین عراقی، ابن جوزی، امام دارقطنی وغیرہ نے امام صاحب کی تابعیت کو تسلیم کیا ہے[۲]۔

البتہ بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آیا امام صاحب کا کسی صحابیؓ سے روایت کرنا ثابت ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے صحابہؓ سے امام صاحب کی روایات کا انکار کیا ہے، امام دارقطنی المتوفی ۳۸۵ھ نے کہا کہ "لم یلق ابو حنیفة احداً من الصحابةؓ انه رأی انساً بعینه ولم یسمع منه[۳]" ابو حنیفہؒ نے کسی صحابی سے ملاقات نہیں کی مگر حضرت

---

۱ تہذیب التہذیب ۲ مقدمہ اوجز ص ۵۶ ۳ تبییض الصحیفہ ص ۵

انسؓ کا دیدار کیا ہے لیکن ان سے سماع حاصل نہیں، خطیب بغدادی نے بھی امام دارقطنی سے پورا اتفاق کیا ہے لکھتے ہیں" لا يصح لأبی حنيفة سماع عن انس بن مالك"[1] اسلئے عام طور پر علمار نے انہیں کی تقلید کی ہے، تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر جیسے محقق نے بھی ان سے اختلاف نہیں کیا، حالانکہ لسان المیزان میں ترجمہ عائشہ بنت عجرد کے تحت یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ" ان اباحنيفة صاحب الرأی سمع عائشه بنت عجرد تقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم اكثر جند الله الجراد لا أكله ولا احرمه[2]" بیشک ابوحنیفہ صاحب الرائے نے حضرت عائشہؓ بنت عجرد کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ روئے زمین پر اللہ کا بہت بڑا لشکر ٹڈیاں ہیں، جس کو نہ میں کھاتا ہوں اور نہ حرام کہتا ہوں، یہاں امام صاحبؒ کا حضرت عائشہؓ بنت عجرد سے سماع واضح طور پر ثابت ہے، ان کے علاوہ متعدد صحابہؓ کرام سے امام صاحب نے حدیثیں سنی ہیں، بظاہر ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ امام مسلم کے نزدیک ایک معاصر اگر اپنے معاصر سے بطریق عنعنہ روایت کرے تو روایت متصل سمجھی جاتی ہے، اور امام بخاریؒ کے نزدیک صرف ایک مرتبہ ملاقات کا ہوجانا بھی اتصال کے لئے کافی ہے، اس لئے دونوں کی شرطوں پر امام صاحب کا صحابہؓ سے روایت کرنا اتصال پر محمول ہوگا، اسلئے عبدالقادر قرشی، ملا علی قاری، حافظ بدرالدین عینی وغیرہ نے اس کو تسلیم کیا ہے۔

امام صاحبؒ اور امام مالکؒ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں امام مالک

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۹ ص۱۱۱ [2] لسان المیزان میں یہ عبارت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوجاتی ہے، حدیث کا متن کنزالعمال سے نقل کیا گیا ہے۔

کے بہت سے اقوال جرح امام صاحبؒ کے متعلق نقل کئے ہیں، مگر شارح مؤطا ابوالولید باجی مالکی فرماتے ہیں کہ ان کا انتساب امام مالکؒ کی طرف صحیح نہیں، بلکہ سعدی صمیری، موفق اور خوارزمی نے بیان کیا ہے کہ امام مالکؒ امام صاحبؒ کی کتابوں (یعنی انکے تلامذہ کی کتابوں) سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔[1]

بعض علمار نے جہاں امام مالکؒ سے رواۃ کے سلسلہ میں ان کے بعض مشائخ کا نام لیا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے متعلق بھی تصریح کی ہے کہ یہ امام مالک سے بھی روایت حدیث کرتے ہیں، حافظ ذہبی نے اشہب کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ" رأیت ابا حنیفة بین یدی مالك كالصبی بین یدی ابیه[2] " میں نے ابوحنیفہ کو امام مالک کے سامنے اس طرح دیکھا جس طرح بچہ اپنے باپ کے سامنے بیٹھتا ہے، اگرچہ امام صاحب کیلئے یہ بات کوئی عار نہیں ہے بلکہ یہ تو غایت تواضع وانکسار کی دلیل ہے، امام صاحب نے تو اپنے تلامذہ تک سے حدیثیں روایت کی ہیں، مگر امام صاحبؒ کا امام مالکؒ سے روایت کرنا محتاج ثبوت ہے، علامہ زاہد کوثری نے اقوم المسالک میں اشہب کی روایت کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں" فمایرویه الذهبی فی ترجمة مالك فی طبقات الحفاظ عن اشهب لا یصح الا اذا كان فی حق حماد عن ابی حنیفة دون ابیه لان میلاد اشهب (۱۴۵ھ) كما یقول ابن یونس ان لم یكن لدة الشافعی ومثله لا یمكن ان یرحل من مصر الی المدینة المنورة ویری ابا حنیفة عند مالك اصلاً[3] " طبقات الحفاظ میں امام مالک کے ترجمہ میں جو کچھ ذہبی اشہب سے نقل کرتے ہیں، وہ صحیح نہیں البتہ یہ بیان حماد بن ابی حنیفہ کے

---

[1] تانیب الخطیب ص۲۳ [2] تذکرۃ الحفاظ [3] اقوم المسالک ص۷

متعلق ہوسکتا ہے، کیونکہ اشہب کا سن ولادت ۱۴۵ھ ہے، جیسا کہ ابن یونس نے بیان کیا، جبکہ امام شافعی کا ہم سن تسلیم نہ کیا جائے، اور اس عمر کے بچہ کیلئے ممکن نہیں کہ وہ مصر سے سفر کر کے مدینہ منورہ جائے اور امام ابوحنیفہ کو امام مالک کے یہاں دیکھ سکے، یہ یاد رہے کہ امام صاحبؒ کا سن وفات ۱۵۰ھ ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رقم طراز ہیں "ان اباحنيفة لم تثبت روايته عن مالك وانما اورده الدارقطني ثم الخطيب في الرواة عنه لروايتين وقعتا لهما باسنادين فيهما مقال وهما لم يلتزما في كتابيهما الصحة[1]"، بیشک امام ابوحنیفہ کا امام مالک سے روایت کرنا ثابت نہیں ہے، دارقطنی اور ان کے بعد خطیب نے امام مالک کے رواۃ میں صرف دو روایتوں کی وجہ سے امام ابوحنیفہ کا شمار کیا ہے اور دونوں کی صحت میں کلام ہے خود دارقطنی اور خطیب نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا ہے.

ماخذ علم خطیب بغدادی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ امیر المومنین ابوجعفر نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے کن صحابہؓ کا علم حاصل کیا تو امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن عباس حضرت عبداللہ بنؓ مسعود کے شاگردوں سے علم حاصل کیا۔[2]

حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب فرماتے ہیں کہ مذہب حنفی کی بنیاد عبداللہ بن مسعود کے فتاوے، حضرت علیؓ کے فیصلے وفتاوے اور قاضی شریح وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فتاوے پر ہے، امام ابوحنیفہؒ نے ان حضرات کے آثار کو سامنے رکھ کر استنباط واستخراج مسائل کیا، نیز امام ابوحنیفہؒ، ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ کے مسلک سے بہت کم انحراف کرتے

---

[1] تدریب ص۳۴۷ [2] تاریخ بغداد جلد ۱۳ ص۳۳۴

تھے، ابراہیم نخعی کے مذہب پر تخریج مسائل میں امام صاحبؒ کو بڑا ملکہ حاصل تھا، فروعی مسائل کی تخریج میں بہت دقیق النظر واقع ہوئے تھے، اگر تم ہمارے قول کی حقیقت سمجھنا چاہتے ہو تو ابراہیم نخعی کے اقوال کتاب الآثار لمحمد اور جامع عبدالرزاق و مصنف ابوبکر بن شیبہ سے نکال لو اور ملا کر دیکھو، شاید ہی کسی جگہ اختلاف پاؤ گے، اور اگر کسی جگہ اختلاف ہے تو فقہائے کوفہ کے خلاف نہ پاؤ گے[1]۔

امام صاحبؒ نے فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، وہ محتاج بیان نہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحب نے جس قدر مسائل مدون کئے ہیں، ان کی تعداد بارہ لاکھ ستر ہزار سے زائد ہے[2]۔

امام صاحب کی وفات

خاندان نبوت میں واقعہ کربلا کے بعد متعدد افراد نے انقلاب حکومت کی کوشش کی، محمد ذوالنفس الذکیہ نے مدینہ طیبہ میں اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، امام صاحبؒ نے برملا ان کی تائید کی، مشہور ہے کہ منصور نے امام صاحب کے سامنے منصب قضا کی پیشکش کی تھی، مگر امام صاحب نے انکار کر دیا، جس کے نتیجے میں منصور نے ۱۴۷ھ میں قید کرا دیا، مورخین کا خیال ہے کہ منصور نے ان کے خلاف جو سخت کارروائی کی اس کی وجہ عہدۂ قضا سے انکار نہ تھا، بلکہ محمد و ابراہیم کی حمایت تھی، جس کا منصور کو علم تھا، بہر حال بے خبری میں منصور نے آپ کو زہر دلوا دیا، جب اس کا اثر امام صاحب نے محسوس کیا تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں رجب ۱۵۰ھ میں قضا کی[3] انا للہ وانا الیہ راجعون، اولادمیں

---

[1] الانصاف فی سبب الاختلاف [2] النکت الطریفہ ص۱۵۱ از کوثری [3] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص۱۰۷

صرف ایک صاحبزادے حماد تھے۔

امام ابوحنیفہؒ کا علم حدیث میں مقام

مشہور ہے کہ امام صاحب کی فن حدیث میں کوئی تصنیف نہیں ہے اور صحاح ستہ میں بجز ایک دو جگہ کے ان کا نام تک نہیں پایا جاتا، سب سے زیادہ یہ کہ ان کی شہرت اہل الرائے کے لقب سے ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث سے امام صاحبؒ کو تعلق کم تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ کچھ دانستہ اور کچھ نادانستہ طور پر یہ ایسی غلط فہمی ہے کہ جس کا پردہ چاک کرنے کی ضرورت ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور علمائے محققین نے مجتہد کی تعریف یہ کی ہے کہ مجتہد وہی شخص ہو سکتا ہے، جو قرآن، حدیث، آثار، تاریخ، لغت و قیاس ان پانچ چیزوں پر کافی عبور رکھتا ہو[1]۔

امام صاحبؒ کے مجتہد مطلق ہونے پر امت کا اجماع ہے، اس کے بعد ان پر قلت حدیث کا طعن نادانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، اسلئے ہم ائمہ حدیث کے اقوال نقل کرتے ہیں تاکہ حقیقت آشکارا ہو جائے، حافظ ذہبیؒ نے مسعر بن کدام جو امام صاحبؒ کے عہد طالب علمی کے رفیق رہ چکے ہیں، ان کا بیان نقل کیا ہے "طلبت مع ابی حنیفۃ الحدیث فغلبنا واخذنا فی الزھد فبرع علینا وطلبنا معہ الفقہ فجاء منہ ما ترون[2]" میں نے اور امام ابوحنیفہ نے ساتھ ساتھ علم حدیث حاصل کیا، تو وہ ہم پر غالب رہے، اور زہد میں بھی وہ ہم پر فائق رہے، فقہ ان کے ساتھ شروع کی، تو تم دیکھتے ہو کہ کیا کمال ان سے ظاہر ہوا، یحییٰ بن سعید قطان جو جرح و تعدیل کے امام ہیں وہ فرماتے ہیں "انہ واللہ لاعلم ھذہ الامۃ بما جاء عن اللہ ورسولہ[3]"

---

[1] عقد الجید [2] مناقب ابی حنیفہ ص۲۷ از ذہبی [3] ما تمس الیہ الحاجۃ

واللہ امام ابوحنیفہ اس امت میں خدا و رسولؐ سے جو کچھ وارد ہوا ہے اس کے سب سے بڑے عالم ہیں، مکی بن ابراہیم نے امام صاحبؒ کو اعلم اہل زمانہ بتایا ہے[۱]۔

ابو المحاسن شافعی نے اپنی کتاب عقود الجمان میں مستقل ایک --- باب قائم کیا ہے، جس میں امام صاحبؒ کی روایت حدیث کی کثرت اور ان کا اعیان حفاظ حدیث میں ہونا بیان کیا ہے امام ابوحنیفہؒ بایں وسعت نظر ہمیشہ اس کے لئے کوشاں رہے کہ کوفہ میں جب بھی کوئی محدّث آتا تو اس سے استفادہ کرتے، امام صاحبؒ کے مشہور شاگرد محدّث عبدالعزیز بن رِزمہ کے بیان کو علامہ موفق نے بہ سند نقل کیا ہے : وذکر علم ابی حنیفۃ بالحدیث فقال قدم الکوفۃ محدث فقال ابوحنیفۃ لاصحابہ انظروا هل عنده شئ فی الحدیث لیس عندنا قال وقدم علینا محدث اٰخر فقال لاصحابہ مثل ذلک[۲] عبدالعزیز بن رزمہ نے امام ابوحنیفہ کے علم حدیث کا تذکرہ کیا اور اس سلسلے میں یہ بتایا کہ ایک بار کوفہ میں ایک محدث آئے تو امام ابوحنیفہؒ اپنے اصحاب سے فرمانے لگے دیکھو تو ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے پاس نہ ہو، عبدالعزیز کا بیان ہے کہ دوبارہ ایک اور محدث ہمارے پاس آئے جب بھی آپ نے اپنے اصحاب سے یہی فرمایا! امام حسن بن زیاد کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ چار ہزار حدیثیں روایت کیا کرتے تھے جن میں دو ہزار حماد کی حدیثیں تھیں اور دو ہزار بقیہ دیگر مشائخ کی[۳]، صاحب عقود الجمان لکھتے ہیں کہ امام صاحب سے روایات کی قلت کی وجہ حفظ حدیث کی وسعت کے باوجود استنباط مسائل سے اشتغال ہے، اور اسی طرح مالک و شافعی سے ان کی مسموعات

---

[۱] مقدمہ اوجز صفحہ ۶۰ [۲] مناقب للامام الاعظم جلد ۱ صفحہ ۸۳ از ذہبی صدر الائمہ مکی [۳] ایضاً جلد ۱ صفحہ ۹۶ از موفق بن مکی ۔

کی بہ نسبت کم روایات منقول ہیں، جیسے صحابہؓ میں حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ سے ان کی معلومات کی کثرت کے باوجود دیگر صحابہؓ کے مقابل میں کم روایات پائی جاتی ہیں[۱]۔

روایت حدیث میں احتیاط امام صاحبؒ روایت حدیث میں بہت محتاط واقع ہوئے تھے، جس کا اعتراف بڑے بڑے محدثین تک کو ہے، یحییٰ بن معین کا قول ہے"، کان ابو حنیفة ثقة لایحدث الا مایحفظ ولایحدث بما لایحفظ[۲]"۔ امام صاحب ثقہ ہیں جو حدیث ان کو حفظ ہوتی ہے وہی بیان کرتے ہیں، جو یاد نہیں ہوتی اس کو بیان نہیں کرتے، امام صاحب کی اس احتیاط کا اندازہ امام وکیع کی اس شہادت سے ہوتا ہے، جو انہوں نے دی ہے، فرماتے ہیں کہ جیسی احتیاط امام صاحب سے حدیث میں پائی گئی کسی دوسرے سے نہیں پائی گئی[۳]۔

امام صاحب کے شرائط امام صاحبؒ کو ایک دوسری حیثیت سے بھی اپنے معاصرین اور بعد کے ائمہ پر خصوصیت حاصل ہے، امام صاحب کے زمانے تک بہت سے احادیث کے دفتر تیار ہو چکے تھے، لیکن ضرورت تھی کہ احادیث کے قبول ورد کے قاعدے مرتب کئے جائیں، چنانچہ امام صاحب نے اس کی بنیاد ڈالی اور بہ لحاظ ثبوت احکام ان کے مراتب کی تفریق کی، ان کے اصول تنقید بہت سخت تھے اسلئے تشدد فی الروایۃ کا لقب دیا گیا[۴]۔

امام صاحب کے قلیل الروایۃ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے، علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں والامام ابو حنیفة انما قلت روایته لما شدد فی شرط

---

[۱] عقود الجمان [۲] تاریخ بغداد جلد ۱۳ ص ۴۱۹ [۳] مناقب للامام ازموفق جلد ۲ ص ۱۹۷

[۴] اصول السرخسی جلد ۱ ص ۲۶۴

الروایة والتحمل" یعنی امام ابوحنیفہؒ سے روایت کم ہے، اس لئے کہ انہوں نے روایت اورتحمل کی شرطیں سختی کی ہے وہ شرائط کیا ہیں؟ امام طحاوی نقل کرتے ہیں: حدثنا سلیمان بن شعیب حدثنا ابی املا علینا ابو یوسف قال قال ابو حنیفة لا ینبغی للرجل ان یحدث من الحدیث الا بما حفظه من یوم سمع الی یوم یحدث[1] یعنی امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کو اسوقت تک حدیث نہیں بیان کرنا چاہیئے، جب تک کہ سننے کے دن سے بیان کرنے کے دن تک یاد نہ ہو، امام صاحبؒ کا عمل اسی اصول پر تھا چنانچہ عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں: "وقد کان الامام ابو حنیفة یشترط فی الحدیث المنقول عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قبل العمل به ان یرویه عن ذلك الصحابیؓ جمع اتقیاء عن مثلهم وهکذا[2]"۔ جو حدیث حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اس کے متعلق امام صاحب عمل سے پہلے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت اس صحابیؓ سے مسلسل نقل کرتی چلی آئی ہو، عمل بالحدیث کی جس شرط کا علامہ شعرانی نے تذکرہ فرمایا ہے اس کو علامہ ذہبی نے خود امام صاحب سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: "اٰخذ بکتاب اللہ فما لم اجد فبسنة رسول اللہ والاٰثار الصحاح عنه التی فشت فی ایدی الثقات عن الثقات فان لم اجد فبقول اصحابه اٰخذ بقول من شئت واما اذا انتهی الامر الی ابراهیم والشعبی والحسن و عطأ فاجتهد کما اجتهدوا[3]" میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپؐ کی ان صحیح حدیثوں سے جو ثقات کے ہاتھوں میں

---

[1] الجواہر المضیئة امام ابوحنیفہ [2] المیزان الکبریٰ جلد ا صـ ۶۲ [3] مناقب ابی حنیفہ صـ ۲۰ از ذہبیؒ

ثقات ہی کے ذریعہ شائع ہوئی ہیں، پھر اگر یہاں نہ مل سکے، تو آپؐ کے صحابہؓ میں سے جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں، لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعی وشعبی، حسن وعطا تک پہنچ جاتا ہے، تو پھر اجتہاد سے کام لیتا ہوں جیسا کہ ان حضرات نے اجتہاد کیا، امام صاحبؒ کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ وہ صرف ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں، جو صحیح ہیں اور جن کی اشاعت ثقات کے ذریعہ سے ہوئی ہے علامہ سیوطی کو بھی اعتراف ہے کہ صحیحین کے سب رواۃ بھی اس معیار پر کامل طور سے نہیں اتر سکتے، فرماتے ہیں کہ:
"هذا مذهب شديد قد استقر العمل علىٰ خلافه فلعلّ الرواة فی الصحيحين من يوصف بالحفظ لايبلغون النصف[۱]" یہ سخت مذہب ہے اور عمل اس کے خلاف قرار پایا ہے، کیونکہ غالباً صحیحین کے اُن رواۃ کی تعداد جو حفظ سے موصوف ہیں نصف تک نہیں پہنچتی" امام صاحبؒ کا یہ طرز عمل قابل قبول تھا، مگر بعض محدثین جنکا عمل ظاہر حدیث پر ہے بہت سے فروعی مسائل میں امام صاحبؒ پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگاتے ہیں۔

حافظ ابن عبدالبر مالکی اسکا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں "کثیر من اهل الحديث قد استجاز والطعن علیٰ ابی حنيفة لرده كثيراً من الاخبار الآحاد للعدول لانه كان يذهب فی ذلك الیٰ عرضها علیٰ ما اجتمع عليه من الاحاديث ومعانی القرآن فما شذّ من ذلك ردّه وسمّاه شاذاً[۲]" بہت سے محدثین نے امام ابوحنیفہؒ پر اسلیے طعن کیا ہے کہ انہوں نے بہت سے ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا، اصل بات یہ ہے کہ امام صاحبؒ کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری احادیث و قرآن سے ملا کر دیکھتے تھے، اگر اس کا مضمون ان سے

---

[۱] تدریب الراوی ص۱۶۰ [۲] الموافقات جلد ۳ ص۲۶

مطابقت کھاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث سمجھتے، امام صاحب کے ان شرائط و احتیاط کی وجہ سے جن روایات سے وہ استدلال کرتے ہیں وہ صحت کے لحاظ سے اعلیٰ مقام پر ہوتی ہیں، علی بن جعد جوہری جو امام بخاری اور امام ابوداؤد کے استاد ہیں بیان کرتے ہیں کہ "ابوحنیفة اذجاء بالحدیث جاء بمثل الدر" امام اعظمؒ جس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، وہ موتی کی طرح چمکتی ہوتی ہے، اس کا صحیح اندازہ امام صاحبؒ کی مسانید بالخصوص کتاب الآثار اور صاحب قاموس علامہ سید مرتضیٰ زبیدی کی کتاب الدرر المنیفه فی ادلة مذهب ابی حنیفة سے لگایا جاسکتا ہے۔

امام صاحبؒ پر ایک بے بنیاد الزام

امام صاحبؒ نے قیاس و اجتہاد کی جو دقیق راہ کھولی تھی، اسکی بنا پر عوام محدثین جو ظاہر حدیث ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور جدید مسائل میں غور وخوض کو معیوب سمجھتے تھے، انہوں نے امام صاحبؒ پر یہ الزام لگایا کہ امام صاحبؒ قیاس کے مقابلے میں حدیث کو قبول نہیں کرتے (معاذ اللہ) مگر امام صاحبؒ سے جو اقوال منقول ہیں وہ خود اس دعوے کی تکذیب کرتے ہیں، امام صاحبؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ہر وہ بات جسکے ذریعہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہم نے سُنا ہو یا نہ سنا ہو بسر وچشم قبول ہے، ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ آپؐ نے فرمایا ہے۔[1]

حافظ ابن عبدالبر مالکی نے الانتقاء میں امام صاحبؒ سے یہ روایت بیان کی "لعن اللہ من یخالف رسول اللہ صلے اللہ علیه وسلم به اکرمنا اللہ وبه

---

[1] تانیب الخطیب ص۸۶

استنقذنا[1]"۔ یعنی اللہ کی لعنت ہو اس پر جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہے، آپ ہی کے ذریعہ ہمیں اللہ نے عزت بخشی اور آپ ہی کے ذریعہ ہمیں (کفر و شرک سے) بچایا۔

علامہ شعرانی نے میزان میں امام صاحبؒ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا: واللہ ہم پر جھوٹ و افتراء ہے، جو شخص یہ الزام لگاتا ہے کہ ہم نص پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں، کیا نص کے بعد بھی قیاس کی ضرورت ہو گی۔؟

البتہ تابعین کے متعلق امام صاحبؒ فرماتے تھے، "ھم رجال ونحن رجال[2]" کیونکہ امام صاحبؒ بھی تابعی ہیں۔

امام محمد نے المبسوط میں بالتفصیل لکھا ہے کہ امام صاحبؒ حدیث صحیح کے مقابل میں کسی بھی رائے کا اعتبار نہیں کرتے تھے، بلکہ علامہ ابن حزم نے فقہاء عراق کا اجماع نقل کیا ہے کہ وہ حدیث ضعیف کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔

ایسے ہی حافظ ابن قیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ "ان ضعیف الحدیث عندہ (ای ابی حنیفۃؒ) اولیٰ من القیاس" اور اس کی بکثرت مثالیں مذہب حنفی میں موجود ہیں، حدیث وضوء بالقہقہہ فی الصلوٰۃ، حدیث وضوء بنبیذ التمر وغیرہ کو باوجود ضعیف ہونے کے امام صاحبؒ نے قیاس پر مقدم کیا ہے اس کی تفصیل کرتے ہوئے حافظ ابن قیم فرماتے ہیں "فتقدیم الحدیث الضعیف و آثار الصحابۃ علی القیاس والرأے قولہ (ای قول الامام ابی حنیفۃؓ) و احمد" یعنی امام ابوحنیفہ و امام احمد دونوں کے نزدیک حدیث ضعیف و آثار صحابہؓ کو قیاس و رائے پر مقدم رکھا

---

[1] السنۃ ومکانتہا از مصطفیٰ السباعی ص۴۰ [2] المیزان الکبریٰ جلد ۱ ص۵۱

گیا ہے، البتہ حدیث ضعیف کی تعریف میں علمار سلف ومتاخرین کا اختلاف ہے، متاخرین جس حدیث کو حسن کہتے ہیں اسے متقدمین اپنی اصطلاح میں ضعیف کہتے تھے،[۱]

علامہ ابن حزم وحافظ ابن قیم ان دونوں نے امام صاحبؒ کے مسلک پر بکثرت تنقیدیں کی ہیں مگر انہیں بھی اعتراف ہے کہ امام صاحب کے نزدیک حدیث ضعیف قیاس پر مقدم ہے، حدیث مرسل کو قبول کرنا اور قیاس ورائے پر مقدم کرنا حنفیہ کا مشہور ومعروف ضابطہ ہے، حالانکہ امام شافعیؒ نے اس کو قبول کرنے کے لئے شرائط مقرر کئے ہیں، اور محدثین کی ایک جماعت نے بالکل ہی ترک کر دیا۔

امام اعظم اور فن جرح وتعدیل

اگرچہ اس فن کا آغاز دور صحابہؓ وتابعین میں ہو چکا تھا، مگر تابعین کے دور اخیر میں باقاعدہ اس فن کی ابتدا ہوئی، حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ جب تابعین کا آخری دور آیا یعنی ۱۵۰ھ کے قریب قریب تو ائمہ کی ایک جماعت نے توثیق وتضعیف کے لئے زبان کھولی، امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ "مارأیت اکذب من جابر الجعفی" میں نے جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا نہیں دیکھا[۲]، امام ترمذی نے بھی اس کو کتاب العلل میں نقل کیا ہے۔

مسانید امام اعظمؒ

امام صاحبؒ کی متعدد تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو ان کے حالات کے ساتھ مذکور ہیں، مگر ہمیں یہ بتانا ہے کہ آیا فن حدیث پر کوئی مجموعہ موجود ہے یا نہیں؟ عام طور پر یہ غلط فہمی ہے کہ امام صاحب کی کوئی تصنیف نہیں ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب نے جس طرح فقہ کو باقاعدہ مرتب ومدون

---

[۱] الثقۃ ومکانتہا ص۴۷ [۲] فتح المغیث ص۴۷۹

کرایااس کو امام صاحب کے تلامذہ بالخصوص قاضی ابویوسف و امام محمد نے اپنی تصانیف میں جمع کر دیا ہے، امام شافعیؒ نے بالکل صحیح فرمایا ہے" الناس عیال لابی حنیفۃ فی الفقہ" بعد کے سب آنے والے فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے خوشہ چین ہیں، اسی طرح حدیث کا سرمایہ جو منتقل ہوتا چلا آرہا تھا، اس کو بھی باقاعدہ فقہی ترتیب پر مرتب کرایا، علامہ سیوطی لکھتے ہیں: "من مناقب ابی حنیفۃ التی انفرد بھا انہ اول من دون علم الشریعۃ ورتبہ ابوابا ثم تبعہ مالک بن انس فی ترتیب الموطا ولم یسبق اباحنیفۃ احد[1]" امام ابوحنیفہؒ کے ان مناقب خصوصی میں سے جن میں وہ منفرد ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت کو مدون کیا اور ان کو ابواب پر ترتیب دیا، پھر امام مالکؒ نے موطا کی ترتیب میں انہیں کی پیروی کی اور اس سلسلے میں امام ابوحنیفہؒ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں، علامہ کوثری نے ان مسانید کی تعداد اکیس ۲۱ بتائی ہے، اور فرماتے ہیں کہ ان سب کی مسانید متصل ہیں، ان مسانید کو امام صاحبؒ کے تلامذہ نے جمع کیا تھا، محدث خوارزمی المتوفی ۶۶۵ھ جو ان مسانید کے جامع ہیں، ابتدا رکتاب میں لکھتے ہیں کہ "میں نے شام کے بعض جاہلوں سے سنا کہ وہ امام اعظمؒ کی تنقیص کرتے ہیں، اور ان پر قلت روایت حدیث کا الزام لگاتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ مسند شافعیؒ اور موطا مالک تو مشہور ہیں، مگر امام ابوحنیفہؒ کی کوئی مسند نہیں، بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صرف چند احادیث کی روایت پر اکتفا کیا ہے، اس لئے میری دینی حمیت نے آمادہ کیا کہ امام صاحبؒ کی ان پندرہ مسانید کو یکجا جمع کر دوں جن کو بڑے بڑے علماء حدیث نے جمع کیا ہے"۔ ان جامعین

---

[1] تبییض الصحیفہ ص۳۶

کے حالات بھی خوارزمی نے بیان کر دیئے ہیں، ان کی فہرست حسب ذیل ہے :۔

(۱) امام صاحبؒ کے صاجزادے حماد کی مسند۔

(۲) امام ابویوسف کی کتاب آلاثار۔

(۳) مسند حسن بن زیاد لؤلوی۔

(۴) امام محمد کی کتاب الآثار۔

ان حضرات نے براہ راست امام صاحبؒ سے روایت کی ہے۔

(۵) مسند حافظ ابو محمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب حارثی بخاری جو عبداللہ الاستاد کے لقب سے مشہور ہیں، اور ابو حفص کبیر کے شاگرد ہیں۔

(۶) مسند حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی صاحب کتاب الحلیہ۔

(۷) مسند ابوالقاسم طلحہ بن محمد بن جعفر۔

(۸) مسند حافظ ابواحمد عبداللہ بن عدی بن جرجانی۔

(۹) مسند عمرو بن حسن اشنانی۔

(۱۰) مسند ابوالحسن محمد بن جعفر۔

ان چھ حضرات کا شمار حفاظ حدیث میں ہے۔

(۱۱) مسند ابوبکر احمد بن محمد کلاعی۔

(۱۲) مسند حافظ ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری۔

(۱۳) مسند حافظ سعدی۔

(۱۴) مسند حسین بن محمد خسروی۔

(۱۵) مسند موسیٰ بن زکریا حصفکی، ان کی مسند کی شرح ملا علی قاری نے لکھی ہے۔

ان مسانید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اکثر روایات صرف دو واسطے سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں، اس سے اس کی صحت وقوت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ائمہ اربعہ میں صرف امام مالکؒ اس خصوصیت میں شریک ہیں، مگر ان کی مرویات میں سب سے عالی یہی روایات ہیں جب کہ امام اعظمؒ کی مردیات میں وحدانیات بھی موجود ہیں۔

علامہ شعرانی نے بڑے فخر و مسرت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ میں امام اعظمؒ کی مسانید ثلاثہ کے صحیح نسخوں کی زیارت و مطالعہ سے مشرف ہوا، جن پر حفاظ حدیث کے دستخط تھے[1]، علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے مسانید کو محدثین سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے[2]۔

اگرچہ امام صاحبؒ کے فقہی مسائل کے مقابلے میں ان کو زیادہ شہرت نہیں ہوئی مگر واقعہ ہے کہ بعد والوں کے لئے بہت بڑا نمونہ چھوڑ گئے۔

محدث خوارزمی نے ان کو مسانید کے نام سے موسوم کیا ہے، اسلئے بعد کے علماء بھی ان کو مسند کہنے لگے، مگر بہت سے اہل علم نے کتاب الآثار وسنن کے نام سے بھی یاد کیا ہے، بلکہ قاضی ابویوسف کی مسند کتاب الآثار کے نام سے چھپ بھی گئی ہے، امام محمد کی مسند تو کتاب الآثار کے نام سے مشہور ہے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانی نے بھی اس کو بدائع الصنائع میں "ذکر آثار ابی حنیفہؒ"، ہی کے نام سے یاد کیا ہے[3]۔

کتاب الآثار لمحمد کے متعلق حافظ ابن حجر تعجیل المنفعۃ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں: والموجود من حدیث ابی حنیفۃ مفردا انما ھو کتاب الآثار

---

[1] مقدمہ اوجز المسالک [2] تانیب الخطیب [3] بدائع الصنائع جلد ۱ صفحہ ۱۳۰

التی رواھا محمد بن الحسن عنہ" امام ابوحنیفہ کی حدیث میں مستقل طور پر جو کتاب موجود ہے وہ کتاب الآثار ہے، جس کو امام محمد نے ان سے روایت کیا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ قاسم بن قطلوبغا نے اس کے رجال پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، حافظ ابن حجرؒ کی کتاب کا نام "الایثار بمعرفۃ آلاثار" ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

امام مالکؒ

نام ونسب وولادت

مالک نام، کنیت ابوعبداللہ، امام دارالہجرہ لقب، باپ کا نام انس تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: مالک ابن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمر بن الحارث بن غیمان بن جثیل بن عمرو بن الحارث ذی اصبح[1]، امام مالک خالص عرب خاندان سے تھے، جو جاہلیت واسلام دونوں میں معزز تھا، بزرگوں کا وطن یمن تھا، سب سے پہلے ان کے پردادا ابو عامر نے مدینۃ النبیؐ میں آکر سکونت اختیار کی، چونکہ یمن کے خاندان شاہی یعنی حمیر کی شاخ اصبح سے تعلق رکھتے تھے، امام صاحب کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے، اسلئے ذااصبح کے لقب سے وہ مشہور ہیں[2]، آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا ابوعامر مشرف باسلام ہوئے، قاضی ابوبکر بن علا قشیری نے ان کو جلیل القدر صحابیؓ بتایا ہے، مگر محدثین کے

---

[1] تذکرہ ص۱۸۶ وغیاث الاعیان جلد۳ ص۲۲۴ البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص۱۷۴

[2] مدارک ومقدمہ تنویرالحوالک۔

نزدیک یہ ثابت نہیں، محدث ذہبی فرماتے ہیں: "لم أر أحدًا ذکرہ فی الصحابة" حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں ذہبی کی عبارت نقل کر دی[1]، اس سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے شرف لقا ثابت نہیں البتہ امام صاحب کے دادا مالک جلیل القدر تابعی اور صحاح ستہ کے رواۃ میں ہیں، مالک بن عامر کے تین بیٹے تھے، انس امام مالکؒ کے والد بزرگوار، ربیع و ابوسہیل نافع ایک بلند پایہ محدث تھے، صحیح و معتبر روایت کی بنا پر امام مالکؒ کی پیدائش ۹۳ھ ہے[2]۔

مدینہ طیبہ

امام مالکؒ کے خاندان کا جس طرح دینی و علمی لحاظ سے ایک ممتاز مقام تھا، اسی طرح آپ کا مولد و مسکن مدینۃ الرسولؐ علمار و فضلار کا مخزن تھا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سیکڑوں صحابہؓ دور دراز مقامات میں نکل گئے تھے لیکن معدن، سونا نکلنے کے بعد بھی معدن ہے۔

عہد نبویؐ سے لے کر حضرت علیؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے تک ساری دنیائے اسلام کا مرکز یہی تھا، بعد کو دار الخلافہ کے کوفہ اور پھر دمشق منتقل ہونے کے بعد اس کی وہ علمی حیثیت باقی نہیں رہی، تاہم امام مالکؒ کے دور تک اس کا امتیاز مسلّم تھا، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں: "باید دانست کہ مدینہ مشرفہ در زمان او بیشتر از زمان متاخر بلاشبہہ مرجع فضلار محط رجال علمار بودہ است[3]" جاننا چاہیئے کہ مدینہ شریف امام مالکؒ کے زمانے میں اخیر دور سے پہلے بلاشبہہ فضلار کا مرجع اور اہل علم کی فرودگاہ تھا، البتہ امام مالکؒ کے طبقے کے بعد وہاں علمی انحطاط آگیا تھا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں: "ثم تناقص العلم جدًا بہا فی الطبقة التی بعدھم ثم تلاشی" پھر ان کے بعد والے طبقے میں وہاں علم

---

[1] الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ جلد ۳ ص ۹۹ [2] ماخوذ از مقدمہ شرح موطا از زرقانی [3] مصفی شرح موطا

بہت ہی کم ہوگیا اور اس کے بعد تو بالکل جاتا رہا، لیکن امام مالکؒ کے زمانے تک مدینہ منورہ کی فضا علم و دین سے معمور تھی، امام مالکؒ کو اپنے یہاں کے علماء پر اتنا وثوق تھا کہ ان کے نزدیک عمل اہل مدینہ مستقل حجت[عہ] ہے۔

تحصیل علم امام صاحبؒ نے آنکھ کھولی تو مدینہ باغ و بہار تھا، ان کا گھر خود علوم کا مرجع تھا، انہوں نے قرآن مجید کی قرأت و سند مدینہ کے امام القراء نافع بن عبدالرحمن المتوفی ۱۶۹ھ سے حاصل کی[۱] جن کی قرأت پر آج تمام دنیائے اسلام کی بنیاد ہے، امام صاحب حدیث کی تحصیل کے وقت کم عمر تھے، خود فرماتے ہیں "کنت اٰتی نافعا وانا غلام حدیث السن[۲]" میں نافع کے پاس آتا تھا تو ایک کم سن لڑکا تھا، نافع حضرت ابن عمرؓ کے غلام ہیں، جو حدیث و روایت کے استاد و شیخ تھے، انہوں نے کامل تیس ۳۰ برس حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی ہے، حضرت ابن عمرؓ کے علاوہ اور دیگر صحابہؓ سے بھی روایت کی ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے نافع کو اہل مصر کی تعلیم کیلئے بھیجا تھا، ۱۱۷ھ میں نافع نے وفات پائی[۳]

حضرت نافع جب تک زندہ رہے امام مالکؒ ان کے حلقۂ درس میں موجود رہے، محدثین روایت مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کو سلسلۃ الذہب (سونے کی زنجیر) قرار دیتے ہیں[۴]۔

نافع کے علاوہ امام صاحب نے دیگر شیوخ سے بھی حدیث سیکھی تھی، امام مالکؒ نے طلب علم کیلئے مدینہ سے باہر قدم نہ نکالا کیونکہ اس وقت مدینہ دارالعلوم تھا اور تمام ممالک اسلامیہ کے شیوخ و اساتذہ خود آستانۂ نبوی پر حاضر ہوتے تھے۔

---

[۱] وفیات جلد طبع جدید ۲ص [۲] تذکرہ جلد ا ص۸۸ [۳] حسن المحاضرہ ص۱۶۶ [۴] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص۱۷۴

[عہ] حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین جلد ا ص۲۹۸ میں عمل اہل مدینہ پر جو بحث کی ہے وہ قابل دید ہے۔

شیوخ واساتذہ امام مالکؒ نے صرف انہیں شیوخ سے استفادہ کیا جو صدق وطہارت میں مصروف اور حفظ وفقہ میں ممتاز تھے، امام صاحب نے جن شیوخ سے موطا میں روایت کی ہے ان کی تعداد پچانوے ہے یہ سب اساتذہ مدنی ہیں، اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا، وہ اب صرف ایک سینہ میں مجتمع ہوگیا، اسی لئے امام دارالہجرۃ آپ کا لقب ہوا، ان کے شیوخ میں صرف چھ حضرات غیر مدنی ہیں، یہ صرف موطا کے شیوخ کی تعداد ہے، ورنہ علامہ زرقانی نے نوسو۹۰۰ سے زائد ان کی تعداد بتائی ہے۔

امام مالکؒ جس شیخ سے روایت کرتے ہیں وہ ثقاہت وعدالت وحفظ میں نشان سمجھا جاتا تھا، احمد بن حنبل سے کسی شخص نے ایک راوی کی نسبت پوچھا انہوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک وہ اچھا ہے کیونکہ امام مالکؒ نے اس سے روایت کی ہے[1]۔

امام مالکؒ فطرۃً قوی الحافظہ تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ کوئی چیز میرے خزانۂ دماغ میں آکر پھر نہ نکلی[2]۔

مؤطا میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبداللہؓ بن عباس کی بہت کم روایات ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہارون رشید نے امام صاحبؒ سے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ "لم یکونا ببلدی ولم ألق رجالهما" یعنی یہ دونوں بزرگ میرے شہر میں نہ تھے، اور میری ان کے اصحاب سے ملاقات نہ ہوسکی، اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ کی روایات ان دونوں حضرات سے بھی کم ہیں۔

---

[1] مقدمہ زرقانی ومقدمہ اوجز المسالک [2] مقدمہ اسعاف المؤطا۔

مجلس درس مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بعد ان کی علمی درسگاہ کے جانشین نافع ہوئے، کم از کم بارہ[۱۲] برس امام مالکؒ ان کے درس میں شریک رہے، ان کی وفات کے بعد امام مالکؒ ان کے جانشین ہوئے، امام صاحبؒ کی مجلس درس ہمیشہ پرتکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، جب حدیثِ نبوی کے املار کا وقت آتا پہلے وضو یا غسل کرکے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے اور اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لئے باہر تشریف لاتے۔[۱]

مولانا سید سلیمانؒ ندوی نے مجلس درس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے، جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکا ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا اژدحام، امرار کا ورود، علمار کی تشریف آوری، سیاحوں کا گزر، حاضرین کی مؤدب نشست، درِخانہ پر سواریوں کا انبوہ، دیکھنے والوں پر رعب و قار طاری کر دیتا تھا۔[۲]

امام صاحبؒ صاحبِ حکومت نہ تھے، لیکن صاحب حکومت اس آستانہ پر آکر جھکتے تھے پوری دنیائے اسلام امام صاحبؒ کی شہرت سے معمور ہوگئی تھی، ایشیا، افریقہ، یورپ ہر سہ براعظم سے مسافران علم کے کارواں بلاانقطاع مدینہ کا رخ کرنے لگے اور اس طرح پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی: "عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم يوشك ان يضرب الناس اكباد الابل فلا يجدون احدا اعلم من عالم المدينة"[۳] حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلب علم کیلئے اونٹ ہنکائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ

---

[۱] تزیین الممالک نقلاً عن ابونعیم ص۱۳و۱۶ [۲] حیات مالک ص۳۱ و مدارک ص۶۱ [۳] جامع ترمذی جلد۲ ص۹۳

وہ کسی کو نہ پائیں گے، سفیان بن عیینہ وعبدالرزاق نے اس پیشین گوئی کا مصداق حضرت امام مالکؒ کو قرار دیا۔

تلامذہ امام صاحبؒ کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: "حدّث عنه خلق من الائمة[۱]" حافظ ذہبی تحریر فرماتے ہیں: "وحدّث عنه امم لایکادون یحصون[۲]" امام صاحبؒ سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے، امام مالکؒ تقریباً باسٹھ[۶۲] سال مسلسل فقہ وفتاوے، درس وتدریس میں مشغول رہے، ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد تیرہ سو[۱۳۰۰] سے زیادہ بتائی گئی ہے[۳]، امام زہری شیخ ابوالاسود، ایوب سختیانی، ربیعۃ الرائی یحیٰی بن سعید انصاری وغیرہ ائمہ وحفاظ حدیث جو امام صاحبؒ کے شیوخ میں ہیں، انہوں نے بھی امام صاحبؒ سے روایت کی ہے، امام محمد وامام شافعی، امام ابویوسف بھی امام صاحبؒ کے تلامذہ میں ہیں[۴]۔

فقہ مالکؒ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں، "جو شخص کہ ان مذاہب (یعنی ائمہ اربعہ کے مذاہب) کے اصول وامہات پر اطلاع رکھتا ہے، اس بارے میں شک نہیں کریگا کہ ان مذاہب کی اصل حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے اجماعی مسائل ہیں اور یہ ان تمام مذاہب کے درمیان مشترک سی چیز ہے، اس کے بعد اہل مدینہ میں سے فقہا صحابہؓ جیسے کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ اور کبار تابعین مدینہ میں سے فقہار سبعہ اور صغار تابعین مدینہ میں سے زہری اور ان جیسے حضرات پر اعتماد مالکؒ کے

---

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص۱۷۴ [۲] تذکرہ جلد ۱ ص۱۸۷ [۳] مقدمہ اسعاف الموطا۔

[۴] مقدمہ اوجز ص۱۸ بحوالہ مدارک۔

مذہب کی بنیا ہے کہ جس سے ان کے مذہب کی ایک خاص صورت پیدا ہوگئی[1]، فقہاء سبعہ حسب ذیل حضرات ہیں سعید بن المسیب م ۹۴ھ عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود م ۹۸ھ عروہ م ۹۴ھ قاسم بن محمد بن ابی بکر م ۱۰۸ھ ابوبکر بن عبد الرحمٰن بن الحارث ابن ہشام م ۹۴ھ سلیمان بن یسار م ۱۰۹ھ خارجہ بن زید م ۱۰۹ھ[2] یہ حضرات اپنے زمانہ میں مدینہ طیبہ میں علم فقہ وحدیث کا مرجع تھے، ان کا متفقہ فیصلہ مدینہ کی عدالت کا حکم فقہی تسلیم ہوتا تھا، امام مالکؒ کے فقہ وفتاوے کی بنیاد اسی فقہ پر ہے۔

امام صاحب کے فضل وکمال کا اعتراف

یحیٰ بن معین جو حدیث ورجال کے ناقد ہیں، کہتے ہیں مالکؒ امیر المومنین فی الحدیث ہیں سفیان بن عیینہ کہتے تھے "ہم لوگ مالکؒ کے سامنے کیا چیز ہیں، ہم لوگ تو ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں"۔ عبد الرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ روئے زمین پر امام مالکؒ سے بڑھ کر حدیث نبویؐ کا کوئی امانت دار نہیں" امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے جب حدیث آئے تو مالکؒ ستارہ ہیں" امام احمد بن حنبل سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر کسی کی حدیث زبانی کوئی یاد کرنا چاہے تو کس کی کرے جواب دیا کہ مالک بن انس کی۔

اخلاق وعادات

امام صاحبؒ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا بے حد ادب کرتے تھے جب نام مبارک زبان پر آتا، چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن ارواح طیبات کی زیارت کی ہے، ان کی حالت مجھ سے بڑھ کر تھی[3]، امام صاحب کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر کے کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، ابونعیم نے حلیہ میں خود امام مالکؒ سے روایت کی ہے کہ ہارون رشید نے چاہا کہ مؤطا کو خانۂ کعبہ

---

[1] قرۃ العینین ص ۱۷ [2] الجواہر المضیئۃ جلد ۲ ص ۴۲۱ وص ۴۲۲ [3] مناقب مالک للزاوی ص ۳۳

میں آویزاں کیا جائے اور تمام مسلمانوں کو فقہی احکام میں اس کی پیروی پر مجبور کیا جائے۔ یہ موقع وہ تھا کہ عزت طلب اشخاص کیلئے اس سے زیادہ طلائی موقع ہاتھ نہیں آسکتا، لیکن امام صاحبؒ نے جواب دیا "ایسا نہ کرو خود صحابہؓ فروع میں مختلف ہیں، اور وہ ممالک میں پھیل چکے ہیں اور ان میں ہر شخص راہ صواب پر ہے[۱]، خلیفہ منصور نے بھی امام صاحبؒ سے ایسی ہی درخواست کی تھی، مگر امام صاحبؒ نے اس کو بھی ایسا ہی جواب دیا[۲]۔ حافظ ابن عبدالبر مالکی اس واقعہ کو نقل کرکے لکھتے ہیں: "وھٰذا غایۃ فی الانصاف لمن فھم" یہ ہر ذی فہم کے نزدیک انتہائی انصاف کی بات ہے، جو لوگ آج فروعی مسائل میں جھگڑتے ہیں، انہیں اس سے سبق لینا چاہیئے۔

مدینہ منورہ میں امام مالکؒ جس مکان میں رہتے تھے وہ مکان حضرت عبداللہؓ ابن مسعود کا تھا، کرایہ پر لے کر ہمیشہ اس میں رہے اپنا ذاتی مکان نہیں بنایا اور مسجد نبویؐ میں نشست اس جگہ کرتے تھے جہاں امیرالمومنین حضرت عمرؓ نشست کرتے تھے، اور یہ وہی جگہ تھی، جہاں حضور اکرمؐ کا اعتکاف کے وقت بستر مبارک بچھایا جاتا تھا[۳]، امام صاحبؒ فرماتے تھے میں نے فتوے دینا شروع نہیں کیا، یہاں تک کہ مدینہ کے ستّر فقہاء نے اسکی شہادت دی کہ میں فتوے دے سکتا ہوں[۴]۔

محمد ذوالنفس الزکیہ ۱۴۵ھ نے مدینہ منورہ میں اور ان کے بھائی ابراہیم نے بصرہ میں جب سادات پر منصور کی زیادتیوں سے تنگ آکر علم بغاوت بلند کیا، تو امام صاحبؒ نے ان کا ساتھ دیا جسکے نتیجہ میں والی مدینہ جعفر بن سلیمان نے غضب ناک ہوکر امام دارالہجرۃ کی پشت پر ستّر کوڑے لگوائے، تمام پیٹھ خون آلود ہوگئی، دونوں ہاتھ مونڈھے سے

۱؎ حیات المالک ص۸۳ ۲؎ تزئین الممالک ص۴۶ ۳؎ مدارک از قاضی عیاض ص۱۰۵ ۴؎ تذکرہ جلد ۲ ص۱۸۷

اتر گئے اور اونٹ پر بٹھا کر تمام شہر میں تشہیر کرائی، مگر امام صاحبؒ فرماتے جاتے تھے کہ جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں، فتوے دیتا ہوں کہ طلاق جبری[ع] درست نہیں[۱]، غالباً ۱۴۶ھ میں جب منصور حرمین حاضر ہوا تو والی مدینہ سے قصاص لینا چاہا مگر امام صاحبؒ نے روک دیا اور فرمایا کہ جب کوڑا پڑتا تھا، اسی وقت میں جعفر کو قرابت رسولؐ کے سبب معاف کرتا رہتا تھا[۲]۔

وفات امام صاحبؒ کی عمر چھیاسی برس پہنچ چکی تھی، نہایت ضعیف وناتواں ہو گئے تھے، اس کے باوجود درس و افتاء کا سلسلہ جاری تھا، اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتہ بیمار رہے، مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، بالآخر ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ میں انتقال فرمایا، چھیاسی (۸۶) برس کی عمر شریف پائی، ۱۱۷ھ میں مسند درس پر قدم رکھا باسٹھ (۶۲) برس تک علم و دین کی خدمت انجام دی، امام کا جسدِ مبارک جنت البقیع میں مدفون ہوا[۳]۔

تصنیفات امام صاحبؒ کی بہت سی تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے، تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو مقدمہ اوجز المسالک، ہم یہاں صرف مؤطا جو ان کی سب سے اہم کتاب ہے، اس کا تفصیلی تعارف کرا رہے ہیں۔

مؤطا یہ کتب خانۂ اسلام کی وہ پہلی کتاب بتائی جاتی ہے، جو قرآن مجید کے بعد سب سے پہلے باقاعدہ طور پر فقہی ترتیب سے مبوب و مرتب ہو کر منصۂ شہود پر آئی۔

---

۱ طبقات ابن سعد ترجمہ مالک بن انس، البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۸۳، وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۲۸۳

۲ مدارک ص ۲۹۳ ع جس کے نتیجہ میں منصور کی جبری بیعت غیر معتبر ثابت ہوتی تھی یاد رہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔ ۳ مقدمہ اوجز ص ۱۲ دبستان ص ۳

علامہ ابوبکر ابن العربی فرماتے ہیں: "المؤطا ھوالاصل الاول واللباب و کتاب البخاری ھوالاصل الثانی فی ھذا الباب وعلیھما بنی الجمیع کمسلم والترمذی۔" (مؤطا ہی نقش اول اور بنیادی کتاب ہے، بخاری کی حیثیت تو اس باب میں نقش ثانی کی ہے، اور انہیں دونوں کتابوں پر مسلم وترمذی جیسے بعد کے مؤلفین نے اپنی کتابوں کی بنا رکھی ہے)۔

علامہ ذہبی مؤطا کا تعارف یوں کراتے ہیں: "ان للمؤطا لوقعًا فی النفوس ومھابۃ فی القلوب لایوازیھا شئی[1]" (اس میں کوئی شک نہیں کہ دلوں میں مؤطا کی ایسی تاثیر اور قلوب میں ایسی ہیبت ہے، جس کا مقابلہ اور کوئی چیز نہیں کرسکتی)۔

مؤطا درحقیقت علوم مدینہ کا مجموعہ ہے جس کو امام دارالھجرۃ مالک بن انسؒ نے جمع کیا ہے اسی لئے نواب صدیق حسن خان نے ابوزرعہ کا یہ قول نقل کیا ہے: "وایں وثوق واعتماد برکتب دیگر نیست[2]"، معلوم ہوا کہ یہ مجموعہ وثوق واعتماد میں تمام کتابوں میں فوقیت رکھتا ہے۔

زمانۂ تالیف ظاہر ہے کہ اس کی تالیف کا مقام مدینہ طیبہ ہے، اس لئے کہ امام صاحبؒ کا قیام ہمیشہ وہیں رہا ہے، البتہ تالیف کا صحیح زمانہ معلوم نہیں ہوسکا صرف قرائن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، محدث قاضی عیاض نے مدارک میں امام مالکؒ کے شاگرد خاص ابومصعب کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ مؤطا کی تالیف خلیفہ ابومنصور عباسی کی فرمائش پر خود اسی کے عہد میں شروع ہوئی تھی[3] لیکن پایۂ تکمیل کو اسکی وفات کے بعد پہنچی[4] منصور نے ۶ ذی الحجہ ۱۵۸ھ میں وفات

---

[1] مقدمہ التعلیق الممجد علی المؤطا امام محمد [2] اتحاف النبلا ص ۱۶۵ [3] تزئین الممالک للسیوطی ص ۴۳ [4] مقدمہ اوجز ص ۲۰

پائی اور اسکی جگہ اس کا بیٹا محمد المہدی مسند خلافت پر متمکن ہوا اور اس کی خلافت کے ابتدائی دور میں اس کی تالیف پوری ہوئی۔

ابتدائے تالیف کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ ابن حزم نے صراحت کی ہے کہ امام مالکؒ نے مؤطا کی تالیف یحییٰ بن سعید الانصاری (المتوفی ۱۴۳ھ) کی وفات کے بعد کی ہے[۱]۔

وجہ تسمیہ لفظ "مؤطا"، "توطیۃ" کا مفعول ہے صاحب قاموس نے اسکے معنی روندنے، تیار کرنے، اور نرم وسہل بنانے کے بیان کئے ہیں"، مؤطا" کے لغوی معنی "روندا ہوا" "تیار کیا ہوا" "نرم اور سہل بنایا ہوا" ہیں، یہ تمام معانی بطور استعارہ کے یہاں مراد لئے جاسکتے ہیں[۲]۔

ابوحاتم رازی سے دریافت کیا گیا کہ اس کا مؤطا کیوں نام رکھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ امام مالکؒ نے اس کو مرتب کرکے لوگوں کے لئے سہل وآسان بنا دیا ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں، اس کتاب کو لکھ کر میں نے فقہاء مدینہ میں ستر فقیہوں کے سامنے پیش کیا سب ہی نے مجھ سے اتفاق کیا اس لئے میں نے اس کا نام مؤطا رکھا ہے[۳]، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس معنی کو اپنی شرح مسوّیٰ میں راجح قرار دیا ہے فرماتے ہیں: "مؤطا کے معنی روندے ہوئے، چلے ہوئے کے ہیں، یعنی جس طرح عام ائمہ وعلماء اور اکابر چلے ہوں اور سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور

۱ے توجیہ النظر ص۱۷ ۲ے قاموس جلد ا ص۲۲ ۳ے مقدمہ اوجز ص۲۲

اتفاق بھی کیا ہو[1]"۔ چونکہ یہ معنی خود صاحب کتاب سے منقول ہیں، اسلئے اسی کو ترجیح دی جائے گی۔

مؤطا کی غرض

مؤطا سے پہلے اور خود امام مالکؒ کے زمانہ میں بہت سے حدیث کے مجموعے تیار ہو چکے تھے، مگر ان کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا تھا جو التزام کہ مؤطا میں کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حبان کتاب الثقات میں فرماتے ہیں: "کان مالك اول من انتقی الرجال من الفقهاء بالمدينة واعرض عمن ليس بثقة فی الحديث ولم يكن يروی الا ما صح ولا يحدث الا عن ثقة[2]" (امام مالکؒ فقہاء مدینہ میں سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے رواۃ کے متعلق تحقیق سے کام لیا اور حدیث میں جو ثقہ نہ ہوں انکی روایت سے اعراض کیا، وہ صحیح روایات کے علاوہ نہ کوئی روایت نقل کرتے ہیں، اور نہ کسی غیر ثقہ سے حدیث ہی بیان کرتے ہیں)۔

امام دار الہجرۃ مالک بن انسؓ کے مذہب کی بنا اول احادیث صحیحہ اور بنائے ثانی آثار صحابہ و تابعین ہیں، شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "جاننا چاہیئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے خواہ مسند ہو یا مرسل نیز حضرت عمرؓ کے اثر اور عبداللہ ابن عمرؓ کے عمل سے استدلال کرنا اور صحابہ و تابعین مدینہ کے فتاوے سے اخذ کرنا خصوصاً جب کہ ان تابعین کی ایک جماعت کسی مسئلہ پر متفق ہو، امام مالکؒ کے مذہب کا اصول ہے[3]، اور انہیں تمام مذکورہ بالا باتوں کے ملحوظ رکھنے کی وجہ سے مؤطا اہل مدینہ کی روایات اور فتاوے کا بہترین انتخاب ہو گئی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے۔" فصنّف الامام

---

[1] مقدمہ مسوّی صہ۶ [2] تہذیب التہذیب؛ ترجمہ امام مالکؒ [3] مصفّٰی جلد ا صہ۱۷

مالك المؤطا وتوخیٰ فیه القوی من حدیث اهل الحجاز ومزجه باقوال الصحابة وفتاوی التابعین ومن بعدهم[1]۔" (امام مالکؒ نے مؤطا تصنیف کی اور اس میں اہلِ حجاز کی قوی روایات کا قصد کیا اور اس کے ساتھ صحابہؓ کرام کے اقوال اور تابعین و علماء مابعد کے فتاوے بھی درج کر دیئے)۔

مؤطا کا کتب حدیث میں مقام

جمہور علماء نے طبقات کتب حدیث کے اندر طبقۂ اولیٰ میں مؤطا مالک کا شمار کیا ہے حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمہما اللہ نے کتب حدیث کے پانچ طبقات قائم کئے ہیں جن میں مؤطا کو طبقۂ اولیٰ میں رکھا ہے، بلکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مؤطا کو تمام کتابوں میں مقدم و افضل سمجھتے ہیں، اپنی مشہور کتاب مصفیٰ شرح مؤطا کے مقدمہ میں اسکی ترجیح کے دلائل و وجوہ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور حجۃ اللہ البالغہ میں بھی فرماتے ہیں:

"واتفق اهل الحدیث علیٰ ان جمیع ما فیه صحیح علیٰ رأی مالك ومن وافقه واما علیٰ رأی غیره لیس فیه مرسل ولا منقطع الا وقد اتصل السند به من طرق اخریٰ فلاجرم انها صحیحة من هذا الوجه[2]۔" (محدثین کا اتفاق ہے کہ اس کتاب کی تمام روایات امام مالکؒ اور انکے موافقین کی رائے میں صحیح ہیں، اور دوسروں کی رائے بھی اس سلسلے میں یہی ہے کہ مؤطا کی مرسل و منقطع روایات کی سند دوسرے طرق سے متصل ہے، پس اس میں کوئی شبہہ نہ رہا کہ اس اعتبار سے وہ سب صحیح ہیں)۔

صاحب مفتاح السعادۃ نے بیان کیا ہے کہ اس کا درجہ ترمذی کے بعد ہے مگر صحیح یہ ہے کہ مسلم کے بعد تیسرے درجہ پر اس کو رکھنا چاہیئے[3]۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص۴ [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ا ص۱۳۳ [3] مقدمہ اوجز المسالک ص۲۱

حافظ ابوذرعہ رازی جو بخاری و مسلم دونوں ہی سے بخوبی واقف ہیں، انکو مؤطا کی صحت کا اس درجہ یقین ہے کہ فرماتے ہیں: "لو حلف رجل بالطلاق علےٰ احادیث مالك فی المؤطا انها صحاح لم یحنث" (اگر کوئی شخص اس پر طلاق کا حلف اٹھالے کہ مؤطا میں امام مالکؒ نے جو حدیثیں بیان کی ہیں صحیح ہیں تو وہ حانث نہ ہوگا)[1]

امام شافعیؒ کی شہادت

مؤطا کی صحت و مرتبہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام شافعیؒ (المتوفی ۲۰۴ھ فرماتے ہیں: ما علےٰ ظہر الارض کتاب بعد کتاب اللہ اصح من کتاب مالك" (روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد مؤطا مالکؒ سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے) اگرچہ خود علمار شوافع میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں: "انما قال ذلك قبل وجود کتاب البخاری و مسلم"[2] (امام موصوف کا یہ قول بخاری و مسلم کی کتابوں کے عالم وجود میں آنے سے پہلے کا ہے)۔

حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں حسب ذیل تقریر کی ہے: "بعض ائمہ نے بخاری کی کتاب کو امام مالکؒ کی کتاب پر اصح قرار دینا مشکل بتایا ہے کیونکہ دونوں ہی صحت اور انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں، بخاری کی روایات اگرچہ زیادہ ہیں مگر یہ صحت کی افضلیت کو مستلزم نہیں ہیں"

پھر اس اشکال کا خود ہی جواب دیتے ہیں: "بخاری کی اہمیت دراصل اشتراط صحت ہی کی بنا پر ہے، اور امام مالکؒ چونکہ انقطاع اسناد کو قادح نہیں سمجھتے اسلئے مراسیل، منقطعات، بلاغات کو اصل موضوع کتاب ہی میں نقل کرتے چلے آئے ہیں، اور امام بخاری انقطاع کو

---

[1] تزئین الممالک ص ۴۳ [2] مقدمہ ابن صلاح

چونکہ علت قادحہ سمجھتے ہیں، اسلئے ایسی روایات کو وہ تعلیقات وتراجم میں (جو اصل موضوع کتاب سے خارج ہے) درج کرتے ہیں، اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ منقطع روایات اگرچہ ایک قوم کے نزدیک قابل احتجاج ہیں مگر پھر بھی اس کی بہ نسبت متصل روایات جب دونوں کے رواۃ عدالت وحفظ میں مشترک ہوں زیادہ قوی ہیں، پس اسی سے بخاری کی فضیلت عیاں ہوگئی، نیز یہ معلوم ہوا ہے کہ امام شافعی نے جو مؤطا کو صحت میں افضل بتایا ہے، وہ ان کے زمانہ میں موجود تھے، جیسے جامع سفیان ثوری، مسند حماد بن مسلمہ وغیرہ، ان پر مؤطا کی فضیلت بلا کسی نزاع کے مسلم ہے[1]، لیکن حافظ کا یہ بیان دونوں کتابوں کے لحاظ سے تو بیشک صحیح ہے ورنہ مؤطا کے تمام مراسیل ومنقطعات وبلاغات متصل ومرفوع مسند ہیں۔

حافظ ابن حجر نے مؤطا اور بخاری کی منقطع روایات کے درمیان جو فرق بیان کیا ہے، اس پر علامہ سیوطی نے نقد کیا ہے کہ مؤطا کے مراسیل تو امام مالک اور ان کے ہم خیال علماء کے نزدیک بیشک حجّت ہیں، اور ایسی مرسل حدیث تو علمائے شوافع کے نزدیک بھی حجّت ہے بشرطیکہ دوسری اسانید سے اس کی تائید ہو رہی ہو اور موطا کی ہر حدیث کے متابعات وشواہد موجود ہیں، اس لئے مؤطا مطلقاً صحیح ہے، بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام وہ کتابیں جو سنن کے باب میں تصنیف کی گئی ہیں جیسے سنن ابو داؤد ونسائی یا ان کا فقہ سے تعلق ہے جیسے صحیح بخاری جامع ترمذی یہ سب مؤطا مالک کے مستخرجات ہیں جو اس کے ارد گرد گھومتی ہیں، اور سب کا مطمح نظر مؤطا کی مرسل روایت کا اتصال اور موقوف کا مرفوع اور بلاغات کا استدراک ومتابعات وشواہد کا ذکر ہے اور اس حقیقت کو وہ ہی جان سکتا ہے، جس کی اس کتاب پر گہری نظر ہو[2]۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص۸   [2] الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ ص۴۸

اسی لئے حافظ مغلطائی نے موطا و بخاری دونوں کو ایک ہی درجہ پر رکھا ہے فرماتے ہیں: "مؤطا و بخاری میں اس باب میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں تو بخاری میں بھی ہیں، چنانچہ تعلیقات اور ایسی بہت سی چیزیں اس میں بھی پائی جاتی ہیں"[1]

اس گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ صحت کے لحاظ سے ان دونوں کتابوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو مؤطا کو بعض وجوہ سے صحیحین پر بھی ترجیح حاصل ہے۔

(۱) امام مالکؒ تبعِ تابعی ہیں، اس لئے مؤطا کی روایات میں تین چار واسطوں سے زیادہ نہیں ہے، صحیح بخاری کو اگر یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں بائیس[۲۲] ثلاثیات ہیں تو یہاں مؤطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے، بلکہ اس میں چالیس[۴۰] ثنائیات ہیں، یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور امام مالک کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔

(۲) امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک ضروری ہے کہ راوی جس روایت کو بیان کرے اس کا وہ حافظ ہو، لیکن امام بخاری و مسلم کے نزدیک یہ شرط نہیں[2]۔

مؤطا کی مقبولیت امام مالکؒ کے شیوخ و معاصرین نے مؤطا کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے، اوپر گزر چکا ہے کہ امام صاحبؒ نے فقہائے مدینہ کے سامنے پیش کیا تو سب نے داد تحسین دی اور بعد کے علماء کے نزدیک انتہائی مقبول رہی ہے علامہ نووی شرح مسلم کے مقدمہ میں اپنے استاد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ایک کتاب مجھ کو ایسی ملی جو ان تمام کتابوں (بخاری، مسلم و ترمذی وغیرہ) سے بہتر ہے اگرچہ یہ کتابیں بھی اچھی ہیں، اور وہ مؤطا ہے، جس کے مصنف کا نام مالک بن انس

---

[1] تزئین الممالک ص۴۷ [2] تدریب ص۱۰۱

ہے، جو تمام محدثین کے شیخ الشیوخ ہیں"[1]

علامہ زرقانی شارح مؤطا فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ نے جب اس کتاب کو تصنیف کیا تو دوسرے علماء نے بھی اسی طرز سے احادیث کے مجموعے تیار کئے، لوگوں نے امام مالکؒ سے جاکر بیان دیا کہ صرف اخلاص وحسن نیت کو بقا ہے، یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی، مؤطا مالکؒ کے سوا اور کوئی مؤطا دنیا میں باقی نہیں رہی۔[2]

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کی حیات ہی میں یہ کتاب پوری دنیائے اسلام میں مشہور ہوگئی تھی، جتنا زمانہ گزرتا گیا اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا اور لوگوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی، اس مقدس کتاب کی تنہا یہ خصوصیت ہے کہ سلاطین زمانہ مہدی، ہادی، رشید، مامون اور امین جیسے مشاہیر خلفاء اسلام نے عراق سے حجاز تک بادیہ پیمائی کی۔[3]

روایات کی تعداد

ابتداءً مؤطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں، مگر امام صاحب نے سب کو قلم زد کر دیا، اب ۱۷۲۵ باقی ہیں، جس میں مسند و مرفوع ۶۰۰ اور مرسل ۲۲۲ موقوف ۶۱۳ تابعین کے اقوال وفتاوے ۲۸۵ ہیں۔[4]

مؤطا کے مراسیل وبلاغات

امام مالک کے مراسیل وبلاغات بہت ہی اہم سمجھے جاتے ہیں، علامہ ابن عبدالبر مالکی نے اس موضوع پر مستقل ایک کتاب لکھی ہے، جس میں مؤطا کی مرسل، منقطع اور معضل روایات کا اتصال بیان کیا ہے، فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں جہاں کہیں بلغنی یا عن الثقة عندی آیا ہے اور اسکی سند نہیں بیان کی ہے ۶۱ مقامات ہیں، ان سب روایات کو امام مالکؒ کے علاوہ

---

[1] مقدمہ شرح مسلم [2] مقدمہ اوجز ص ۲ [3] الحطہ ص ۵۵ [4] اوجز ص ۲۸

دوسرے حضرات نے مسنداً بیان کیا ہے، البتہ چار احادیث ایسی ہیں جن کی اسناد معلوم نہ ہوسکیں، وہ یہ ہیں عہ :-

(۱) انی لا انسی ولکن انسی لأسن (۲) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم أری اعمار الناس قبلہ اوماشاء اللہ من ذلک کأنہ تقاصر اعمار امتہ فاعطی لیلۃ القدر۔ (۳) قول معاذؓ آخر ما اوصانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ (۴) اذا انشأت بحریۃ ثم تشاء مت فتلک عین غدیقۃ[۱]۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ مسند دارمی کی تصنیف ہی مؤطا کی احادیث کے بیان اسناد کے لئے ہوئی ہے[۲]۔

مؤطا میں غیر مدنی شیوخ کی روایات شاذ و نادر ہی ہیں، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ کی بلاغات کو امام مالکؒ نے عبداللہ بن ادریسؒ سے سنا ہے۔

مؤطا کی خصوصیات

اب ہم مختصراً مؤطا کی خصوصیات اور بعض خاص اصطلاحات کی جانب اشارہ کریں گے۔

۱۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: "السنۃ التی لا اختلاف فیہا عندنا کذا وکذا". (یعنی وہ سنت کہ جس کے بارے میں ہمارے یہاں کوئی اختلاف نہیں) یہ ان مسائل کے بارے میں فرماتے ہیں، جن میں اہل مدینہ کا اتفاق ہوتا ہے۔

۲۔ اگر اہل شہر میں اختلاف ہوتا تو سب سے قوی اور راجح قول کو اختیار کرتے تھے خواہ یہ قوت کثرت قائلین سے حاصل ہوتی ہو یا کسی قیاس قوی کی موافقت سے یا کتاب

عہ لیکن شیخ ابن صلاحؒ نے ان کی اسانید بیان کی ہے (السنۃ ومکانتہا ص۴۸۸)

[۱] مقدمہ اوجز ص۲۸ [۲] مقدمہ مسوّی ص۶

سنت کی تخریج سے اسی قسم کے مسائل میں امام مالکؒ یوں فرمایا کرتے ہیں کہ: "ھذا احسن ماسمعت"[1] (جو کچھ میں نے سنا ہے اس میں یہ بہتر ہے)۔

۳ــــ باب کے تحت ان مسائل فقہیہ کو بیان کرتے ہیں کہ جو اس سے مناسبت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے اجتہادات کو بھی نقل کر دیتے ہیں۔

۴ــــ امام مالکؒ کے سامنے بہت سے حدیث کے مجموعے تھے، جب اس میں سے کسی روایت کا انتخاب فرماتے ہیں تو اس کو بلغنی کے صیغے سے بیان کرتے ہیں[2]۔

۵ــــ امام مالکؒ جب عن الثقۃ عن بکیر بن عبداللہ الاشج کہتے ہیں تو قاضی ابن عبدالبرؒ کی تحقیق میں اس ثقہ سے مراد مخرمہ بن بکیر ہیں، حافظ ابن حجر کا بھی یہی خیال ہے، البتہ امام نسائی کے نزدیک اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد عمرو بن الحارث کو لیا جائے۔

۶ــــ کبھی فرماتے ہیں اخبرنی من لا اتہم من اھل العلم تو یہاں مراد لیث بن سعد ہیں۔

۷ــــ جب عن الثقۃ عن عمرو بن شعیب کہتے ہیں تو ثقہ سے مراد ابن عبدالبر مالکی کے نزدیک عبداللہ بن وہب ہیں اور حافظ ابن حجر کی تحقیق میں عمرو بن حارث یا عبداللہ ابن لہیعہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مراد لیا ہے۔

۸ــــ اور جب عن الثقۃ عن ابن عمرؓ فرماتے ہیں تو یہاں ثقہ سے انکی مراد نافع ہیں۔

مؤطا کے رواۃ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اپنی کتاب بستان المحدثین میں فرماتے ہیں کہ: "امام مالکؒ سے تقریباً ایک ہزار آدمیوں

---

[1] الانصاف وحجۃ اللہ البالغہ [2] مقدمہ مصفی ص۶

نے روایت کی ہے[1]۔" اس کثرت تعداد و اختلاف اوقات کالازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کی کتاب میں کمی وزیادتی، تقدیم وتاخیر کا ہونالازمی ہے، حافظ صلاح الدین علائی لکھتے ہیں ہیں کہ مؤطا کو امام مالکؒ سے بکثرت لوگوں نے روایت کیا ہے، اس لئے ان کی روایات میں تقدیم وتاخیر کمی وزیادتی موجود ہے[5]۔ جب کہ امام موصوف برابر انتخاب وتہذیب کرتے رہتے تھے۔

چنانچہ مؤطا امام صاحبؒ سے تیس طریقوں سے مروی ہے جن میں مشہور سولہ[16] نسخے ہیں اور ان میں بھی چار زیادہ اہم ہیں، یعنی یحیٰی[1] وابن[2] بکیر، ابومصعب[3] اور ابن[4] وہب کے نسخے۔

ا۔ لیکن سب سے مشہور ومتداول یحیٰی بن یحیٰی مصمودی اندلسی (المتوفی ۲۳۴ھ) کا نسخہ ہے، انہیں کے نسخے کی شرح علامہ سیوطی، زرقانی اور باجی اور حضرت شاہ ولی اللہ نے لکھی ہے، یہ بربر کے مشہور قبیلے مصمودہ کی طرف منسوب ہو کر مصمودی کہلاتے ہیں، ان کے دادا (جنہوں نے اندلس کو اپنا وطن بنایا) پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے قرطبہ میں امام مالکؒ کے شاگرد زیاد بن عبد الرحمٰن موطا کا درس دیتے تھے، یحیٰی نے پہلے انہیں سے پوری موطا کا سماع حاصل کیا، مگر شوق علم انہیں ۲۸ سال کی عمر میں مدینہ طیبہ لایا جہاں انہوں نے امام مالکؒ سے مؤطا پڑھی، ابھی مؤطا کی قرأت کی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ امام دارالہجرۃ کا انتقال ہو گیا، اس لئے یحیٰی کے نسخے میں تمام احادیث حدثنا سے شروع ہوتی ہیں لیکن باب خروج المعتکف الی العید باب قضاء الاعتکاف باب النکاح فی الاعتکاف۔ میں حدثنا زیاد عن مالک ہے یعنی زیاد کا واسطہ

---

[1] مقدمہ اوجز، ص۲۳ [5] ایضاً

زیادہ ہے۔

ان کے نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ امام صاحبؒ سے آخری زندگی میں سماع حاصل کیا بلکہ تجہیز و تدفین میں شریک رہے، مگر ابھی یحییٰ کی علمی پیاس نہ بجھی تھی، اس لئے انہوں نے اندلس سے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور اس سفر میں امام مالکؒ کے خاص شاگرد ابن القاسم سے استفادہ کیا، امام مالکؒ بھی یحییٰ کی بڑی عزت کرتے تھے، ہاتھی کا مشہور واقعہ انہی کا ہے، اندلس میں حکومت ان کا خاص احترام کرتی تھی، مؤطا کی بلاد مغرب میں شہرت کا خصوصی سبب ان کا وجود ہے، چار مسئلوں کے علاوہ ہر بات میں امام مالکؒ کے مقلد تھے، ۱۵۲ھ میں پیدا ہوئے، ۸۲ سال کی عمر پائی ۲۳۴ھ میں انتقال ہوا۔[۱]

۲ ــــــ دوسرا مشہور نسخہ امام محمد بن حسن شیبانی (المتوفی ۱۸۹ھ) کا ہے، جس طرح یحییٰ کے نسخے کو بہت سی خصوصیات حاصل ہیں اسی طرح اس نسخے کو بھی ہیں بلکہ بہت سی وجوہ سے ترجیح بھی دی جاسکتی ہے، کیونکہ امام محمد تین سال امام مالکؒ کی خدمت میں رہے جس کو تفصیل کے ساتھ مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح التعلیق الممجد کے مقدمہ میں بیان کیا ہے۔

چونکہ امام محمدؒ نے اپنی مؤطا میں بہت سے آثار و روایات اور مسائل کو امام مالکؒ کے علاوہ دوسرے حضرات سے نقل کیا ہے، اس لئے مجازاً اس کا انتساب امام محمدؒ ہی کی طرف ہونے لگا۔

اس میں احادیث مرفوعہ اور موقوفات صحابہؓ مسند و مرسل روایات کی مجموعی تعداد

---

[۱] مقدمہ التعلیق الممجد

۱۸۵ا ہے، جس میں ۵۰۰ا تو امام مالکؒ سے اور ۱۷۵ا دوسرے طرق سے جن میں ۱۳ تو امام ابوحنیفہؒ سے اور ۴ قاضی ابو یوسف سے اور بقیہ دیگر حضرات سے مروی ہیں[1]۔

مؤطا کے دیگر نسخوں سے تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ اوجز المسالک والتعلیق الممجد — اور بستان المحدثین —!

شروح وتعلیقات

مؤطا کی مقبولیت وہر دل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ اس کو شارحین ومعلّقین ومحشّین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئی ہے، علامہ ابن فرحون فرماتے ہیں کہ جن علمار نے اس کی حدیث ورجال پر اعتناءً کیا اور اس میں تصنیف کی ہے ان کی تعداد بہت بڑی ہے اس میں علمار مالکیہ کے علاوہ دوسرے حضرات بھی ہیں، قاضی عیاض نے اپنی معلومات کے مطابق انکی تعداد ۹۹ بتائی ہے، ان کے بعد بھی اس میں ہر زمانہ میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ہمیں ان کا تفصیلی تعارف مقصود نہیں ہے، اس کیلئے ملاحظہ ہو اوجز المسالک کا مقدمہ، البتہ سرسری طور پر ہم چند شروح وتعلیقات کا ذکر کر رہے ہیں۔

(۱) — المنتقی: ابوالولید الباجی (المتوفی ۴۷۴ھ) کی شرح ہے، جو طبع ہو چکی ہے۔

صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں کہ یہ ابن عبد البر کی شرح التمہید کا اختصار ہے۔

(۲) — کتاب التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید

از حافظ ابن عبد البر مالکی (المتوفی ۴۶۳ھ)

مؤطا کے معانی کی تشریح اور اس کے اسانید کی تحقیق، نیز اس کے ضمن میں فقہ و حدیث کی بے شمار معلومات بہ ترتیب رواۃ اور بہ لحاظ حروف تہجی درج ہیں۔

---

[1] ایضاً ص ۳۹

(۳) ــــ الاستذکار حافظ ابن عبدالبر نے خود ہی اپنی شرح التمہید کا اختصار کیا ہے، مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۴) ــــ المقتبس فی شرح مؤطا مالک بن انس یہ قاضی ابوبکر ابن العربی (المتوفی ۵۴۶ھ کی شرح ہے۔

(۵) ــــ کشف المغطا عن المؤطا۔ للحافظ جلال الدین السیوطی (المتوفی ۹۱۱ھ) کی شرح ہے۔

(۶) ــــ تنویر الحوالک للسیوطی کشف المغطا کا اختصار ہے۔

(۷) ــــ تجرید احادیث مؤطا للسیوطی۔ شرح۔

(۸) ــــ اسعاف المؤطا برجال المؤطا للسیوطی

(۹) ــــ شرح زرقانی محمد بن عبدالباقی زرقانی مالکی (المتوفی ۱۱۲۲ھ)
یہ نفیس شرح چھپ کر مشہور ومتداول ہو چکی ہے اکثر حصہ فتح الباری سے ماخوذ ہے مصنف نے ۱۰۹۷ھ میں شروع کرکے ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۱۲ھ کو مکمل کیا ہے۔

(۱۰) ــــ المصفّٰی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ)

(۱۱) ــــ المسوّٰی۔ مصفّٰی فارسی میں مؤطا کی تعلیق ہے اور مسوّٰی عربی میں اسی کا اختصار ہے!

(۱۲) ــــ شرح مؤطا ــ الفتح الرحمانی ــ از شیخ بیری زادہ حنفی جن کا پورا نام ابو محمد ابراہیم بن حسین ہے، انہوں نے ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اکثر علامہ عینی کی شرح سے انہوں نے استفادہ کیا ہے، مدینہ طیبہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۱۳) ــــ المحلّٰی سلام اللہ حنفی (متوفی ۱۲۲۹ھ) جو حضرت عبدالحق محدث دہلوی

کی اولاد میں سے ہیں، اس کا آخری حصّہ مظاہر علوم سہارنپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۱۴) ــــ التعليق الممجد علے مؤطا محمدؒ۔ مولانا عبدالحیؒ لکھنوی (متوفی ۱۳۰۷ھ) کی شرح ہے۔

(۱۵) ــــ اوجز المسالك الى مؤطا مالك: حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گراں قدر شرح ہے، جو چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، متقدمین کی شروح کا خلاصہ ہے ہر باب میں ائمہ اربعہ کا مذہب معتبر کتب سے نقل کیا گیا ہے، حل لغات وحل مطالب اور مشکل مقامات کی پوری وضاحت کی گئی ہے۔ بعض جلیل القدر علمائے مالکیہ نے اس کی جلالت کا اعتراف کیا ہے کہ اس سے زیادہ ہمیں اپنے مسلک کی تحقیق معلوم نہیں، مذہب حنفیہ کی توجیہ کے بعد مختصراً دلائل بھی ذکر کئے گئے ہیں، آغاز کتاب میں ایک نہایت مبسوط مقدمہ ہے جو اب ندوۃ العلماء سے عربی ٹائپ پر بھی طبع ہو چکا ہے۔ جس میں فن حدیث اور خصوصاً مؤطا مالک کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے، اس مضمون میں اس سے پوری طرح استفادہ کیا گیا ہے، اور اب یہ قاہرہ سے عربی ٹائپ پر طبع ہو رہی ہے۔

اس کے علاوہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا حاشیہ اور مولانا اشفاق الرحمٰنؒ کی تعلیق بھی مشہور ہے!

امام شافعیؒ

نام ونسب و ابتدائی حالات

نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، لقب ناصر السُّنۃ، شافعی ان کے جد اعلیٰ شافع کی طرف نسبت ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے، محمد بن ادریس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید القریشی الہاشمی المطلبی، ساتویں پشت پر آپ کا سلسلۂ نسب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔

آپ بمقام غزہ[عہ] رجب ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے، امام شافعی کی پیدائش اسی دن کی ہے، جس دن امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا، صحیح قول کے مطابق آپ کی والدہ قبیلۂ ازد

عہ جائے پیدائش میں اختلاف ہے عسقلان کو بھی بتایا گیا مگر واقعہ یہ ہے کہ چونکہ مقام غزہ عسقلان سے تین فرسخ پر واقع ہے، غزہ قریہ ہے اور عسقلان اس کا شہر اس لئے مجازاً عسقلان کو بھی بتایا گیا، ایک روایت یہ بھی امام شافعی سے نقل کی گئی کہ میری پیدائش یمن کی ہے، علامہ ذہبی نے اس کی تردید کی اور حافظ ابن حجر نے وہم راوی قرار دیا، صحیح یہ ہے کہ میری نشو ونما یمن میں ہوئی (توالی التاسیس ص ۳۹)

سے تھیں جو یمن کا ایک ممتاز و مشہور قبیلہ ہے، جب امام شافعیؒ کی عمر دو سال کی ہوئی تو ان کی والدہ ان کو حجاز لے گئیں اور وہاں سے اپنے قبیلہ میں یمن منتقل ہوگئیں، یمن میں امام شافعی نے اپنی عمر کے دس سال گزارے، اب ان کی والدہ کو نسبی شرافت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا اس لئے وہاں سے انہیں لے کر مکہ معظمہ آگئیں[۱]، وہیں انہوں نے نشو و نما پائی[۲]، امام شافعی کی پیدائش ایک غریب گھرانے میں ہوئی، باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا، اللہ تعالےٰ نے ذکاوت و ذہانت سے نوازا تھا، سات سال کی عمر میں حافظِ قرآن ہوگئے تھے، حفظ قرآن کے بعد حفظ حدیث پر متوجہ ہوئے، جب عمر شریف دس سال پہنچی تو مؤطا مالک یاد کرلیا تھا، اور پندرہ سال کی عمر میں اپنے شیخ مسلم بن خالد زنجی کی اجازت سے فتوے دینے لگے، امام صاحب نے قبیلہ ہذیل میں رہ کران کے اشعار میں اتنا کمال پیدا کرلیا تھا کہ اصمعی جیسا شاعر یگانۂ روزگار جو ادب و لغت میں امامت کا درجہ رکھتا ہے، امام صاحب سے اپنے اشعار کی تصحیح کراتا تھا[۳]۔

طلب علم امام شافعی کو اگرچہ علم کا شوق ابتدا سے تھا مگر باقاعدہ طلب علم کا آغاز مکہ معظمہ سے ہوا جو اسلام کی ابتدائی دو صدیوں تک علم کا بہت بڑا مرکز تھا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ عہد صحابہؓ میں یہاں علم کم تھا، پھر صحابہؓ کے دور اخیر میں اس کی کثرت ہوئی، اسی طرح عہد تابعین و تبع تابعین میں بڑے بڑے فقہاء و محدثین ہوئے اس کے بعد حافظ ذہبی لکھتے ہیں: "ثم فی اثناء المأۃ الثالثۃ تناقص علم الحرمین وکثر لغیرھما۔" پھر تیسری صدی میں حرمین کا علم کم ہوگیا، اور دوسری جگہوں پر کثرت

---

[۱] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۱۰۱، البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صفحہ ۲۵۱ و وفیات الاعیان جلد ۳ طبع جدید صفحہ ۳۰۶ [۲] حسن المحاضرہ صفحہ ۱۶۶ [۳] وفیات الاعیان

ہوئی۔

دراصل وہاں کی علمی رونق حضرت عبداللہ بن عباس کے تلامذہ سے تھی، بہرکیف امام شافعیؒ سب سے پہلے مسلم بن خالد زنجی مفتی مکہ کی مجلس درس میں شریک ہونے لگے، اور ان سے مسلسل تین سال استفادہ کیا، جب عمر تیرہ ۱۳ سال کی ہوئی تو مدینہ طیبہ امام دارالہجرۃ مالکؒ بن انس کے آستانے پر حاضر ہوئے، امام مالکؒ نے فرمایا کہ تمہارے قلب میں ایک نور ہے، معاصی سے اسے ضائع نہ کرنا، تم تقوے کو اپنا شعار بنانا، ایک دن آئے گا کہ تم بڑے شخص ہوگے [۱] امام مالکؒ کے سامنے مؤطا کی قرأت زبانی کی، امام موصوف کو اس پر تعجب ہوا [۲]۔ امام شافعی صرف آٹھ ماہ امام مالکؒ کی خدمت میں رہے [۳]، اس کے بعد مدینہ منورہ سے واپس مکہ معظمہ آگئے اور وہاں کے شیوخ بالخصوص محدث شہیر سفیان بن عیینہ سے استفادہ کرتے رہے۔

امام شافعیؒ پر دورِ ابتلاء

اس کے بعد امام شافعیؒ کو فکر معاش دامنگیر ہوئی، اتفاقاً مکہ معظمہ میں والیٔ یمن آیا، اس سے بعض عمائد قریش نے سفارش کی کہ شافعی میں ایسی اہلیت موجود ہے کہ انہیں کوئی سرکاری خدمت سپرد کی جائے، چنانچہ نجران کے عامل بنا دیئے گئے، مگر والیٔ یمن بہت سفاک وظالم تھا، امام صاحبؒ اس کو ظلم وزیادتی وبے انصافی کرنے سے روکتے تھے، اس لئے والیٔ یمن نے ناراض ہوکر ہارون رشید کو خط لکھا کہ شافعیؒ علوی سادات کے ساتھ ہیں، جس سے بڑا اندیشہ ہے، جب یہ خط ہارون رشید کو ملا تو وہ آپے سے باہر ہوگیا، اور والیٔ یمن کو خط لکھوایا کہ شافعیؒ اور تمام ان کے ساتھیوں کو فوراً دارالخلافہ بھیج دو، چنانچہ حکم تعمیل کی گئی، اور امام

---

[۱] وفیات الاعیان [۲] توالی التاسیس [۳] تانیب الخطیب ص ۱۸۲

شافعیؒ کو گرفتار کر کے دربار خلافت میں بھیج دیا گیا، خلیفہ کے سامنے پیش ہوئے، وہاں قاضی امام محمدؒ موجود تھے جب انہیں معلوم ہوا تو وہ بھی دربار خلافت میں پہنچ گئے، چنانچہ امام محمدؒ کی سفارش پر امام شافعیؒ کی رہائی ہوئی، [ع] یہ واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے، جب امام صاحبؒ کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔[۱]

امام محمدؒ کے حلقہ میں شافعیؒ کی شرکت

امام شافعیؒ ہارون رشید کی تلوار سے نجات پا کر امام محمدؒ کے زیر سایہ آگئے، یہاں آنے سے پہلے امام محمدؒ کے مرتبہ اجتہاد و تفقہ سے پورے طور پر واقف ہو چکے تھے، کیونکہ امام محمدؒ فقہ عراق کے حامل و ناشر تھے، یہیں سے شافعی کی زندگی نے پلٹا کھایا اور از سر نو تحصیل علم میں مشغول ہوئے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ شافعی نے فقہ عراق کو بکمال حاصل کیا اور امام محمدؒ کی خدمت میں تین سال سے زائد رہے، بالآخر فقہ کے بانی موسس قرار پائے۔[۲]

امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کی بارگاہِ فیض سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس پر تا زندگی ممنون رہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ "میں نے جو کچھ امام محمدؒ سے پڑھا، سنا، نقل کیا اور لیا وہ بارِ شتر کے برابر ہے۔

امام محمدؒ بھی امام شافعیؒ کا بہت خیال فرماتے تھے، ابوالحسن زیادی بیان کرتے

---

[۱] توالی التاسیس ص۶۹ [۲] حیات الشافعی از ابو زہرہ ص۲۴۶

[ع] امام ابو یوسف سے ملاقات نہ ہو سکی تھی کیونکہ امام موصوف کا ۱۸۲ھ میں انتقال ہو چکا تھا، امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ پر محدث بیہقیؒ وغیرہ نے جو الزامات عائد کئے ہیں حافظ ابن حجر نے توالی التاسیس ص۷۱ پر اور علامہ کوثری نے بلوغ الامانی ص۳۱ تا ص۳۵ پر تردید کی ہے۔

ہیں کہ: "میں نے دیکھا کہ جو برتاؤ امام محمدؒ صاحب کا شافعیؒ کے ساتھ ہے وہ کسی اور اہل علم کے ساتھ نہیں ہے"۔[۱]

رحلت علمی بغداد سے امام شافعیؒ مکہ معظمہ واپس آئے، اور حرم میں بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، اسی زمانے میں احمد بن حنبلؒ ان سے ملے، یہ وہ زمانہ تھا کہ شافعیؒ فقہ جدید کے بانی کی حیثیت سے نمایاں ہو رہے تھے، اس مرتبہ تو تقریباً نو سال مکہ معظمہ میں قیام رہا، لیکن اس عرصہ میں انہوں نے اجتہاد و استنباط کے جو اصول وضع کئے تھے، اور جو ضوابط تیار کئے تھے، ضروری تھا کہ وہ جمہور فقہاء کے سامنے پیش کریں، عراق اس وقت اہل الرائے اور اہل الحدیث کا مرکز تھا، اسلئے دوسری مرتبہ ۱۹۵ھ میں بغداد پہنچے، اب وہ اس طرح آئے کہ فقہاء کی رہبری کے لئے ایک راستہ پیدا کرلیا تھا، اس لئے علماء و طالبان فقہ و حدیث سبھی ان کے گرد جمع ہو گئے یہیں پر اپنی مشہور کتاب الرسالہ تصنیف کی اس دوسرے سفر میں دو سال بغداد میں قیام رہا، پھر ۱۹۸ھ میں تیسری بار بغداد آئے، لیکن اس مرتبہ صرف ایک ماہ کے بعد ہی مصر کا عزم کرلیا اور ۱۹۹ھ میں مصر پہنچ گئے۔

امام شافعیؒ کا مصر میں قیام اب امام صاحبؒ کی فکر کی نمو مکمل ہو چکی تھی مصر پہنچ کر انہوں نے اپنے آراء و افکار پر نظر ثانی کی اور بعض سے رجوع کیا اور بعض نئے آراء کو قائم کیا، قول جدید سے مراد یہیں کا قول ہے، اور قول قدیم یہاں سے پیشتر کا قول ہے، چنانچہ امام شافعیؒ نے خود فرمایا "میں اپنی بغدادی تصنیفات کی روایت کی اجازت نہیں دیتا"۔[۲]

---

[۱] تاریخ ابن خلکان جلد ۳ ص ۳۰۶ [۲] الشافعی

علامہ نووی فرماتے ہیں: "ان قوله القديم مرجوع عنه فلا يصح نسبته اليه[1] یعنی امام شافعیؒ نے اپنے قول قدیم سے رجوع کرلیا ہے اس لئے ان کی طرف اس کا انتساب صحیح نہیں ہے۔

وفات رجب ۲۰۴ھ میں اپنے اصحاب وتلامذہ کی ایک جماعت چھوڑ کر امام صاحبؒ چون ۵۴ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہوئے، مصر میں مزار ہے۔

شیوخ وتلامذہ صدر الائمہ مکی نے امام صاحبؒ کے شیوخ کی تعداد اسّی ۸۰ بتائی ہے[2] حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان کے حدود سفر میں حسب ذیل مقامات کے نام لئے ہیں، مدینہ، یمن، عراق اور مصر، اس لئے ان کے شیوخ کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، البتہ سفیان بن عیینہ، مسلم بن خالد زنجی، امام مالکؒ، امام محمدؒ، ابن ذئبؒ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو توالی التاسیس، مدرسہ عبداللہ بنؓ عباسؓ جس کا سلسلہ مکہ معظمہ میں قائم تھا، امام شافعیؒ نے اس سے پوری طرح استفادہ کیا۔

تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے، ان میں ایک وہ جماعت ہے جس نے بغداد یا مکہ معظمہ میں ان سے استفادہ کیا، جیسے ابوالولید موسیٰ بن جارود، ابوعلی الزعفرانی، امام احمد واسحٰق بن راہویہ وغیرہ ہیں، ایک وہ جماعت ہے، جو ان سے مصر میں مستفید ہوئی، جیسے امام مزنی ربیع المرادی، بویطی، حرملہ اور یونس بن عبدالاعلےٰ وغیرہ ہیں، یہ حضرات امام شافعیؒ کے مذہب جدید کے راوی ہیں، اور ان لوگوں نے امام شافعیؒ کے بعد ان کے علوم کو مرتب ومدون کیا۔[3]

---

[1] شرح مسلم جلد ۲ ص ۱۸۷ [2] مناقب الامام اعظمؒ از صدر الائمہ ص ۳۸ [3] الشافعی۔

تصنیفات امام شافعیؒ کی بہت سی تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے، ملا علی قاری نے ان کی تعداد ۱۱۳ بتائی [۱] ہے، جس میں الرسالہ اور کتاب الام اور سنن شافعیؒ زیادہ مشہور ہیں۔

مسند شافعی خود امام شافعیؒ کی تصنیف کردہ نہیں ہے، بلکہ کتاب الام وغیرہ کتب شافعیؒ سے احادیث کا انتخاب ہے اس اہم کام کو ابوجعفر محمد ابن مطر نیشاپوری نے انجام دیا ہے، چونکہ انہوں نے ابوالعباسؒ اصم (جو بیک واسطہ شافعیؒ کے شاگرد ہیں) کے حکم سے انتخاب کیا تھا، اس لئے مؤلف کی حیثیت سے ابوالعباس ہی مشہور ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ انہیں کا انتخاب ہے، ابوجعفر صرف کاتب تھے۔ بہرحال مسند شافعیؒ نہ مسانید کی ترتیب پر ہے، اور نہ ابواب پر، بلکہ کیف ما اتفق انتخاب ہے، اس لئے بکثرت تکرار ہے [۲]۔

مسند شافعی کی روایات تکرار کے ساتھ ۱۹۰۰ ہیں، اور مکررات کو حذف کرکے ان کی تعداد ۸۲۰ حدیث مسند و مرفوع، اور ۱۲۰ مرسل و معضل روایات ہیں [۳]۔

صاحب کشف الظنون بیان کرتے ہیں کہ ابن عبداللہ علم الدین جاولی نے اس کو مرتب کیا ہے، ابن الاثیر الجزری (م ۶۰۶ھ) نے اس کی شرح لکھی ہے، اس کا نام رکھا ہے "کتاب الشافعی العینی فی شرح مسند الشافعی"، ۵ جلدوں میں ہے، شیخ زین الدین حلبی نے اس کا انتخاب کیا ہے، اس کا نام ہے "المنتخب المرضی فی مسند الشافعیؒ"، علامہ رافعی (م ۶۲۳ھ) نے دو جلدوں میں اس کی شرح لکھی ہے علامہ سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی شرح ہے "الشافعی العینی علی مسند الشافعیؒ" [۴]

---

[۱] ابجد العلوم [۲] بستان ص ۲۸ و تدریب ص ۵۷ [۳] حاشیہ تدریب الراوی ص ۱۰۲ [۴] مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔

امام شافعیؒ و علم حدیث

اوپر گزر چکا ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنے دور کے تمام مراکز سے استفادہ کیا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب علم حدیث کی تدوین ہو چکی تھی، فقہ حنفی و فقہ مالکی ان احادیث و آثار کی روشنی میں مدون ومکمل ہو چکی تھی، جن پر صحابہؓ وتابعین کا تعامل تھا، اب تک عام طور پر مصنفین اپنی کتابوں میں احادیث مرفوعہ کے ساتھ صحابہؓ وتابعین کے اقوال بھی درج کرتے تھے، مگر امام شافعی کے دور میں یہ طرز بدل گیا اب تک علماء مسند ومرسل دونوں سے استدلال کرتے تھے، مگر اس عہد میں اس سے اختلاف کیا گیا، امام محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں: "ان التابعین اجمعوا باسرھم علیٰ قبول المرسل ولم یات عنھم انکارہ ولا عن احد من الائمۃ بعدھم الیٰ راس المأتین[1]" یعنی تابعین سارے کے سارے مرسل کے قبول کرنے پر متفق تھے، نہ تو ان سے اور نہ ان کے بعد کسی امام سے سنہ ۲۰۰ھ تک اس کا انکار ثابت ہے۔

لیکن امام شافعیؒ نے مرسل حدیث سے استدلال کرنے کے بارے میں اختلاف کیا،[2] مرسل کا انکار فی الواقع احتیاط کے پیش نظر کیا گیا تھا، مگر جہاں مرسل کے علاوہ کوئی اور مسند روایت نہیں تھی، اپنے پیشرو علماء سے اختلاف کرنا پڑا۔

امام شافعیؒ کے زمانے میں ہر نادر نوشتے اور غیر متداول صحیفے کی تلاش کی گئی، اور حجاز وعراق، شام ومصر اور بلاد اسلامیہ کے افراد وغرائب، شخصی وخاندانی روایات یا کسی غیر مشہور صحابی کی حدیث جن کو ان سے ایک ہی شخص روایات کرتا چلا آیا ہو، یہ سب جمع ہو گئی تھیں، ان مجموعوں میں بعض ایسی روایات سامنے آئیں جن پر صحابہؓ وتابعین اور سلف کا تعامل نہ تھا، عام اہل فتوے ان کے شاذ ومتروک العمل ہونے کی وجہ سے

---

[1] بغیۃ الالمعی ص ۲۷ از حافظ [2] توجیہ النظر ص ۱۵۲

ان کو نا قابل استدلال سمجھتے تھے، امام شافعیؒ نے ان سے اختلاف کیا کیونکہ صحابہ تابعین ہر مسئلے میں حدیث تلاش کرتے تھے، جب کوئی روایت نہ ملتی تو دوسرے دلائل کی طرف رجوع کرتے، اس لئے امام شافعیؒ نے ایسی تمام روایات کو معمولی بہا قرار دیا مثلاً قلّتین کی حدیث اگلے طبقہ میں شائع نہ تھی مگر اس دور میں اسکی اشاعت ہوئی، اس لئے امام شافعیؒ نے اس پر اپنے مذہب کی بنا رکھی، حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب فرماتے ہیں: "فلم یظهر الحدیث فی عصر سعید بن المسیب ولا فی عصر الزهری ولم یمش علیه المالکیة ولا الحنفیة فلم یعملوا به[1]"

قُلّتین کی حدیث نہ سعید بن مسیب کے عہد میں ظاہر ہوئی نہ زہری کے زمانہ میں نہ اس پر مالکیہ چلے اور نہ حنفیہ۔

چنانچہ ان سب لوگوں نے اس پر عمل نہیں کیا، علامہ ابن قیم نے تہذیب السنن میں اس حدیث کے شذوذ پر تفصیلی بحث کی ہے، فرماتے ہیں: "پس یہ سنت عظیم المرتبت اگر حضرت ابن عمرؓ کے پاس ہوتی تو ان کے اصحاب اور اہل مدینہ سب لوگوں سے زیادہ اس کے ناقل ہوتے اور سب سے زیادہ اس کو روایت کرتے، سو اس سے بڑھ کر اور کیا شذوذ ہوسکتا ہے، اور جب کہ اصحاب ابن عمرؓ سے کوئی ایک فرد بھی اس تحدید کا قائل نہیں (یعنی پانی کی تحدید) تو معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ کے پاس اس کے متعلق کوئی سنّت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے موجود نہ تھی اور یہ اس روایت کے شاذ ہونے کا بیان ہے[2]۔

اسی طرح خیار مجلس کی حدیث پر نہ فقہاء سبعہ نے عمل کیا اور نہ انکے معاصرین نے،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص۱۱۷ [2] تہذیب سنن ابی داؤد ص۵۹ برحاشیہ غایۃ المقصود

پس یہ علت قادحہ ہے، امام مالکؒ وابوحنیفہؒ کے نزدیک، مگر امام شافعیؒ نے اس پر عمل کیا۔

چونکہ امام شافعیؒ کے دور میں اقوال صحابہؓ جمع ہو چکے تھے اس لئے جو اقوال وفتاوے ان روایات کے خلاف تھے انہیں نہ تسلیم کرتے ہوئے صاف کہہ دیا۔ ھم رجال ونحن رجال[عہ][1]۔

امام شافعیؒ نے جمع روایات، تنقید احادیث، اصول روایت اور امتیاز مراتب کے قواعد مرتب کئے، انہوں نے اپنی کتاب الام اور الرسالہ وغیرہ میں بکثرت روایات سے استدلال کیا ہے جس سے حجیت حدیث اور شریعت اسلامیہ میں حدیث کے درجے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، زعفرانی کہتے ہیں کہ اصحاب حدیث خوابیدہ تھے، امام شافعیؒ نے بیدار کیا، امام محمدؒ نے یہ سند عطا کی "ان تکلم اھل الحدیث یوما فبلسان الشافعیؒ"۔ اگر کسی روز اصحاب حدیث کلام کریں گے تو امام شافعیؒ کی زبان میں، امام فرماتے ہیں کوئی ایسا محدث نہیں ہے جس نے قلم و دوات کو ہاتھ لگایا ہو مگر شافعیؒ کا اسکی گردن پر احسان نہ ہو، ہمیں مجمل و مفسر اور ناسخ و منسوخ حدیث کا علم نہیں ہوا، یہاں تک کہ ہم امام شافعیؒ کی مجلس میں بیٹھے[2]۔

امام احمدؒ کی نظر میں امام شافعیؒ دوسری صدی کے مجدد ہیں[3]۔

البتہ امام شافعیؒ نے کوئی درس حدیث کی باقاعدہ مجلس نہیں قائم کی، کیونکہ وہ امام ومجتہد تھے، وہ حدیث پر اصولی حیثیت سے گفتگو کرتے تھے، اور حدیث کو استنباط و استخراج مسائل کیلئے تلاش کرتے تھے مگر تاریخ حدیث میں ان کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

عہ حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں امام شافعیؒ کی طرف اس قول کے انتساب کو غلط بتایا ہے (امام شافعی ص۳۰۱)

۱؎ حجۃ اللہ البالغہ ۲؎ ابن خلکان جلد ۳ ص۳۵ ۳؎ توالی التاسیس ص۳۹ وحسن المحاضرہ ص۱۶۶

امام احمد بن حنبلؒ

نام ونسب وابتدائی حالات

نام ہے احمد بن حنبل شیبانی مروزی، کنیت ابوعبداللہ، وہ خالص عربی النسل، اور قبیلہ شیبانؑ میں سے تھے، امام احمدؒ کی والدہ مرو سے بغداد آئیں تو وہ پیٹ میں تھے، اور وہیں ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے، تین سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔[1]

بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا اور زبان کی تعلیم حاصل کی، تقویٰ وطہارت، نجابت و صلاحیت کے آثار ابتدا ہی سے نمایاں تھے، انہیں آثار کو دیکھ کر ان کے زمانے کے صاحب نظر (ہشیم بن جمیل) نے کہا تھا اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ پر حجت ہوگا[2] بغداد جسے امام صاحب کے مولد و مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے خلافت عباسیہ

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۳۲۶، تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۷، تہذیب جلد ۱ ص ۷۲ [2] تاریخ اسلام از ذہبی ترجمۂ احمد بن حنبل ؑ عہد صدیقی کے مشہور سپہ سالار مثنیٰ بن حارثہ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

میں بہت بڑا علم وفن کا مرکز تھا جس کو محدث حاکم نیشاپوری، مدینۃ العلم وموسم العلماء والافاضل فرماتے ہیں[۱]، بغداد میں علم حدیث کی نشر واشاعت کا یہ حال تھا کہ ایک ایک محدث کے حلقۂ درس میں عام طور پر ہزاروں طلباء کا ہجوم ہوتا تھا۔

تحصیل علم

بغداد کے محدثین میں امام ابو یوسف کی یہ شان ہے کہ امام احمد بن حنبل نے جب تحصیل حدیث شروع کی تو سب سے پہلے امام یوسف کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیثیں لکھیں[۲]۔ پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث ہشیم ابن بشیر بن ابو حازم الواسطی (م ۱۸۳ھ) سے استفادہ کرتے رہے، اس اثناء میں بغداد کے دیگر محدثین سے بھی استفادہ کیا[۳]۔

بغداد سے فارغ ہو کر کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا، اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا[۴]۔

۱۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعیؒ سے ہوئی پھر بغداد میں دوبارہ ہوئی، امام احمدؒ اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے، امام شافعیؒ حدیث کے صحت وسقم کے بارے میں اکثر ان پر اعتماد کرتے اور فرماتے کہ اگر تم محدثین کے یہاں حدیثیں صحیح ہوں تو مجھے بتلا دیا کرو میں اسی کو اختیار کروں گا، حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ: امام احمد کے مجتہد وفقیہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، مگر ان پر حدیث کا رنگ غالب تھا، انہوں نے جریر بن عبد الحمید محدث سے حدیث سننے کیلئے رے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے، اس بلند ہمتی وکثرت اسفار اور فطری و

---

[۱] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۴۹ [۲] مناقب الامام احمد لابن الجوزی ص ۲۲ و ص ۲۳

[۳] مناقب امام احمد ص ۲۵ [۴] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد ۱ ص ۲۰۱

غیر معمولی حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں اس وسعت علم اور کثرتِ حفظ کے باوجود امام شافعیؒ کی شخصیت سے متاثر تھے، اور کہتے تھے "ما رأت عینای مثله" انہوں نے امام شافعیؒ سے اجتہاد کے اصول سیکھے اور اس کا ملکہ اخذ کیا اور بالآخر وہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے، ان کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے، امام شافعیؒ بھی ان کے بڑے معترف اور قدرداں تھے، بغداد سے جاتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "خرجت من بغداد وما خلفت بها اتقی ولا افقه من احمد بن حنبل[۱]" میں بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ، امام احمد کو شافعیؒ سے مؤطا کا سماع بھی حاصل ہے[۲]۔

مجلسِ درس چالیس سال کی عمر میں غالباً ۲۰۴ھ میں انہوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہ بھی ان کا کمال اتباع سنّت تھا کہ انہوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سنِ نبوت ہے، علوم نبوت کی اشاعت شروع کی[۳]، ابتداہی سے ان کے درس میں سامعین وطالبین کا اژدھام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی جن میں سے پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے، ان کی مجلس درس بڑی سنجیدہ اور باوقار ہوتی تھی[۴]۔

زہد و تقویٰ امام صاحبؒ کی زندگی زہد و توکل میں یکتائے روزگار تھی، انہوں نے کبھی سلاطین زمانہ اور خلفاء کا عطیہ قبول نہیں فرمایا۔ مامونؔ معتصم، اور واثق کا دوران کیلئے اس حیثیت سے آزمائش کا تھا کہ وہ ان کا نہایت

---

[۱] حوالہ مذکور و تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۸ والسنۃ ومکانتہا۔ [۲] تدریب ص ۳۴

[۳] احمد بن حنبل از ابوزہرہ ص ۳۴ [۴] حلیۃ الاولیاء جلد ۹ ص ۱۶۵

عقیدت مند اور قدر داں تھا، چنانچہ امام صاحبؒ نے متوکل کے حکم سے چند روز اس کے لشکر میں قیام فرمایا، اس عرصہ میں وہ شاہی مہمان تھے، روزانہ پر تکلف کھانا آتا جس کی قیمت کا اندازہ ایک سو بیس[۱۲۰] درہم روزانہ تھا، انہوں نے اس کھانے کو کسی روز چکھا تک نہیں وہ مسلسل روزہ رکھتے تھے، آٹھ روز تک امام صاحب نے روزہ رکھے، یہاں تک کہ بے انتہا ضعیف ہو گئے، اگر جلدی ان کو رخصت نہ مل جاتی تو زندگی ان کیلئے مشکل تھی۔

تواضع و مسکنت

مسئلہ خلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام ان کی شہرت سے معمور تھا اور ہر طرف ان کی تعریف اور دعا کا غلغلہ تھا، وہ برابر خائف رہتے اور ان کو اپنی طرف سے اطمینان نہیں تھا۔

ان کو جو ذاتی کمالات اور اوصاف خدا کی طرف سے عطا کئے گئے اس کی بناپر کبھی اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوا، ان کے ساتھی یحییٰ بن معین کہتے ہیں: " مارأیت مثل احمد بن حنبل صحبته خمسین سنة ما افتخر علینا بشئ مما کان فیه من الصلاح والخیر[۲]" میں نے امام احمد جیسا نہیں دیکھا، میں پچاس برس ان کے ساتھ رہا انہوں نے کبھی ہمارے سامنے اپنی صلاح و خیر پر فخر نہیں کیا۔

شیوخ و تلامذہ

حافظ ابن جوزی نے ان کے شیوخ کی تعداد سو سے زائد بتائی ہے جیسے قاضی ابو یوسف، ہشیم بن بشیر بن حازم، وکیع، یحییٰ ابن سعید، قطان، سفیان بن عیینہ و امام شافعیؒ وغیرہم۔

تلامذہ کے متعلق حافظ ذہبی فرماتے ہیں، بخاری و مسلم، ابو داؤد، ابو زرعہ، مطین و عبد اللہ بن احمد" وخلق عظیم" اور ایک بہت بڑی خلقت "خلق عظیم" کے لفظ سے معلوم ہوا

---

[۱] اختصار طبقات الحنابلہ ص۶ [۲] حلیۃ الاولیاء جلد ۹ ص۱۸۱

کہ ان کے تلامذہ کی تعداد بے شمار ہے، جس میں بڑے بڑے ائمہ فن داخل ہیں[1]۔

وفات کا حال امام صاحبؒ نے ۷۷ سال کی عمر پائی، ۹ روز بیمار رہے، عیادت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا، سلطان کو اطلاع ہوئی تو ان کے دروازے اور گلی میں پہرہ لگا دیا اور وقائع نگار متعین کر دیئے گئے کہ حالات کی اطلاع برابر ملتی رہے، ہجوم دم بدم بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ گلی بند کر دی گئی، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے بازار میں خرید و فروخت مشکل ہوگئی تھی، امام صاحبؒ کے پیشاب میں خون آنے لگا تھا، طبیب سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم و فکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، جمعرات کو طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا تو انہوں نے تکلیف ہی کی حالت میں مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤ، شب جمعہ میں حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ کو امام سنت نے انتقال کیا، اس پر سارا شہر امنڈ آیا، کسی کے جنازہ پر خلقت کا ایسا ہجوم دیکھنے میں نہ آیا تھا، نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں[2]۔

امام احمد ابتلا و امتحان میں جب معتزلہ نے عقیدہ خلق قرآن کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا، اتفاقاً مذہب اعتزال کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی، مامون اس مسئلہ کا پرجوش داعی اور مبلغ بن گیا، ۲۱۸ھ میں مامون نے والئ بغداد اسحٰق بن ابراہیم کے نام مفصل فرمان بھیجا جس میں عامۂ مسلمین بالخصوص محدثین کی جو اس عقیدہ کو قرآن مجید کی عظمت کے منافی سمجھتے تھے سخت مذمت

---

[1] تذکرہ جلد ۵ ص ۸ [2] طبقات الشافعیہ جلد ۱ ص ۲۰۳ و تاریخ ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۸

کی اور حقارت آمیز تنقید کی اور انہیں شرارِ امت قرار دیا[ع۵]، اس فرمان کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں، اس فرمان کے بعد اسحاق نے فرمان شاہی کی تعمیل کی، اور مشاہیر علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی اور ان کے جوابات کو بادشاہ کے پاس لکھ بھیجا، مامون اس محضر کو پڑھ کر سخت برافروختہ ہوا، ان میں سے دو کے قتل کا حکم دیا اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو ان کو اس کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ ان علماء کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں مامون کے پاس روانہ کر دیا گیا، جب یہ لوگ مقام رقہ پہنچے تو مامون کے انتقال کی خبر ملی، مامون نے اپنے جانشین معتصم کو وصیت کی تھی کہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک اور عقیدہ پر قائم رہے، چنانچہ اس نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا، اب حکومت وقت کے مقابلے کی تنہا ذمہ داری امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہ محدثین کے امام اور سنّت و شریعت کے اس وقت امین تھے، امام صاحب کو رقہ سے بغداد لایا گیا اور تین دن تک اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا، ہر طرح ڈرایا اور دھمکایا گیا، اس کے بعد امام صاحبؒ کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا اور ان کو اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ دم جلاد صرف دو کوڑے لگاتا پھر دوسرا جلاد بلایا جاتا، امام احمدؒ ہر کوڑے پر فرماتے: "اعطونی شیئاً من کتاب اللہ وسنة رسولہ حتی اقول بہ"۔ میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنّت میں سے کوئی دلیل پیش کرو تاکہ میں اس کو مان لوں، امام احمدؒ کو ۲۸ ہفتے قید خانہ میں رکھا گیا اور اس عرصہ میں ان کو ۳۴ کوڑے لگائے گئے[لہ]۔

ع۵ امام احمدؒ کے مجددانہ کارنامے کی تفصیلی مطالعہ کیلئے ملاحظہ ہو حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ظلہ کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" لہ البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۳۳۶ و دعوت و عزیمت بحوالہ تاریخ اسلام ازذہبی

محمد بن اسمٰعیل بخاری کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ امام احمدؒ کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی کو لگتا تو چیخ مار کر بھاگتا، امام احمدؒ کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ مسئلہ ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا اور امت اسلامیہ ایک بہت بڑے دینی خطرے سے محفوظ ہوگئی ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت وامامت کا اصل راز دین کی حفاظت کے لئے اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہت کا تنہا مقابلہ ہے۔

علی بن مدینی جو مشہور محدث اور امام بخاری کے مایۂ ناز استاد ہیں جنہوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی فرماتے ہیں کہ: "ان اللہ اعز ھٰذا الدین برجلین لیس لھما ثالث ابوبکر الصدیق یوم الردۃ واحمد بن حنبل یوم المحنۃ" (اللہ تعالیٰ نے اس دین کے غلبہ و حفاظت کا کام دو شخصوں سے لیا جن کا تیسرا ہمسر نظر نہیں آتا ارتداد کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور فتنۂ خلق قرآن کے سلسلہ میں امام احمدؒ بن حنبلؒ[1])

تصنیفات کتاب الزہد، کتاب الناسخ والمنسوخ، کتاب المنسک الکبیر، کتاب المنسک الصغیر، کتاب حدیث شعبہ، کتاب فضائل الصحابہؓ، مناقب صدیق اکبرؓ وحسنینؓ، کتاب الاشربۃ، تاریخ، تفسیر، مسند[2]، یہ ان کی تصنیفات میں بڑا علمی وتصنیفی کارنامہ ہے جس کا ہم آئندہ صفحات میں تفصیلی تعارف پیش کر رہے ہیں۔

مسانید کی تصنیف کا آغاز دوسری صدی تک علماء اپنی کتابوں میں حدیث نبویؐ کے ساتھ آثار صحابہؓ وتابعین کو درج کرتے تھے، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: "ذٰلک علیٰ رأس المائتین" یعنی مسند کی تصنیف

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب جلد ۴ ص ۴۱۸ [2] کشف الظنون

کا آغاز سن ۲۰۰ھ کے ختم پر ہوا[1]، مگر اس دور میں طریقہ تصنیف بدل گیا، حدیث نبویؐ کو آثار سے علیحدہ کر کے جمع و تالیف کا اہتمام کیا گیا، اور مسانید کی تصنیف کا آغاز ہوا، اور بہت سے ائمہ نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مسند پر کتابیں لکھیں، حافظ صاحب لکھتے ہیں:

"فقلّ امام من الحفاظ الا وصنف حدیثه علی المسانید کاحمد بن حنبل واسحٰق بن راھویه وعثمان بن ابی شیبة وغیرھم"۔ حفاظ حدیث میں شاید ہی کوئی امام ہو جس نے مسند کی ترتیب پر اپنی احادیث کو نہ مرتب کیا ہو جیسے احمد بن حنبل، واسحٰق بن راہویہ وعثمان بن ابی شیبہ وغیرہم۔

مسانید والواب کا فرق

ہر صحابیؓ کی جملہ روایات کو بلا لحاظ مضمون یک جا بیان کر دیا جاتا ہے اور الواب میں احادیث کو باب وار مضامین کے لحاظ سے مرتب کیا جاتا ہے، حافظ سیوطی فرماتے ہیں کہ حدیث کی تصنیف کے دو طریقے ہیں، یا تو فقہی الواب کی ترتیب پر مرتب کیا جائے جیسے صحاح ستہ یا مسانید کے طریقہ پر تصنیف کی جائے یعنی ہر صحابی کے ترجمہ میں اس کی صحیح وسقیم ہر طرح کی روایات کو جمع کر دیا جائے، مسند کے لکھنے میں کبھی حروف تہجی کا اعتبار کیا جاتا ہے کبھی قبائل پر ترتیب دی جاتی ہے، اور کبھی اسلام میں سبقت کا لحاظ ہوتا ہے[2]۔

حافظ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں: "اصل وضع التصنیف للحدیث علی الابواب ان یقتصر فیه علیٰ ما یصلح للاجتھاد اوللاستشھاد بخلاف من رتب علی المسانید فان اصل وضعه مطلق الجمع[3]"۔ الواب پر حدیث کی تصنیف کا ضابطہ یہ ہے کہ اس کو صرف ان روایات تک محدود رکھا جائے جو استدلال یا استشہاد کی صلاحیت

---

[1] تدریب ص۴۰ [2] لامع الدراری ص۴۵ بحوالہ تدریب [3] تعجیل المنفعة ص۳

رکھتی ہوں برخلاف مسانید پر جن لوگوں نے مرتب کیا ہے، ان کا مقصد صرف جمع روایات ہے۔

چونکہ مسند میں ہر طرح کی پراگندہ روایات کو جمع کر دیا جاتا ہے، اس لئے اس میں صحیح وضعیف ہر طرح کی روایات موجود ہوتی ہیں، اب اہل فن کا کام ہے کہ وہ اصول تنقید و قواعد روایت پر جانچ پڑتال کر کے ہر روایت پر صحیح رائے قائم کریں، متاخرین کیلئے مسند سے روایت کی تخریج میں دشواری معلوم ہوتی ہے، مگر علماء سلف جن کے قوت حافظے کا تذکرہ گزر چکا ہے، انہیں اس میں کوئی زحمت نہیں تھی۔

مسند احمد کی تالیف

امام احمد سولہ ۱۶ سال کی عمر سے علم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہوئے، اسی زمانے سے جمع روایات کی ابتدا کر دی تھی، گویا ۱۸۰ھ سے تصنیف کا آغاز کیا[1]، اور اخیر زندگی تک اس میں مشغول رہے، اس کی روایات کو متفرق اوراق میں جمع کرتے رہے، یہاں تک کہ جب زندگی کا وقت قریب ہوا تو اس مسودے کو اسی حالت میں اپنے عزیزوں کو سنایا، آپ کے برادر زادہ حنبل بن اسحٰق بیان کرتے ہیں کہ عم محترم نے مجھے اور اپنے دونوں صاحبزادگان صالح و عبداللہ کو جمع کر کے ہمارے سامنے مسند کی قرأت کی، ہمارے سوا اور کسی نے آپ سے اس کتاب کو بتمام وکمال نہیں سنا ہے، پھر ہم سے فرمایا کہ میں نے اسے ساڑھے سات لاکھ[2] سے زائد احادیث سے جمع و انتخاب کیا ہے، پس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جس حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو تو اس کتاب کی طرف رجوع کرو، اگر وہ روایت

---

[1] احمد بن حنبل از شیخ ابوزہرہ ص۱۵۹، المنہج لاحمد [2] یہ تعداد متون کی نہیں اسانید وطرق کی ہے۔

اس میں مل گئی تو فبہا ورنہ حجت نہیں[1]، یاد رہے کہ مسند میں کسی حدیث کا موجود ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ امام احمد کا اس پر عمل بھی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ امام ممدوح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی حدیث مسند میں موجود نہ ہو تو وہ حجت نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ کی ایک بڑی تعداد اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: "قد قیل انہ لم یقع لہ جماعۃ من الصحابۃ رض الذین فی الصحیحین قریبًا من مأتین[2]" کہا گیا ہے کہ قریباً دو سو صحابہؓ کی روایات اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں جن سے صحیحین میں حدیثیں منقول ہیں۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ کا یہ ارشاد غالب حال کے لحاظ سے ہوسکتا ہے[3]۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ تحریر فرماتے ہیں: راقم الحروف می گوید مراد ایشاں ہمان است کہ بدرجہ تواتر یا شہرت نہ رسیدہ اند والا احادیث صحیحہ مشہورہ بسیار است کہ در مسند ایشاں نیست[4] راقم الحروف کہتا ہے کہ امام صاحب کی مراد وہ احادیث ہیں جو تواتر یا شہرت تک نہ پہنچی ہوں، ورنہ بہت سی احادیث صحیحہ مشہورہ ایسی ہیں جو ان کی مسند میں موجود نہیں۔

مسند کی ترتیب امام احمدؒ اپنی زندگی میں اس کی ترتیب وتبویب نہیں کرسکے تھے حافظ شمس الدین جزری فرماتے ہیں: امام احمدؒ نے مسند کو متفرق اوراق میں لکھا تھا اور مختلف اجزا میں پھیلا رکھا تھا، جیسے کہ مسودہ ہوتا ہے، اس کی تنقیح و تہذیب سے پہلے انتقال ہوگیا، کتاب اسی حال میں رہ گئی[5]۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد ۱ صـ۲۰۲ [2] اختصار علوم الحدیث صـ۶ [3] المصعد صـ۲۱ لاحمد۔
[4] بستان صـ۲۶ [5] مقدمۃ المسند بہ تحقیق۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب فرماتے ہیں کہ: مسند کی موجودہ ترتیب امام صاحبؒ کے صاجزادے عبداللہ کی ہے، لیکن اس میں بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں، مدنیوں کو شامیوں میں اور کبھی اس کے برعکس درج کر دیا ہے[1]، علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر امام صاحبؒ نے اس کو مرتب و مہذب کیا ہوتا تو یہ کام بہت اعلیٰ پیمانے پر انجام پاتا، اللہ تبارک و تعالےٰ سے امید ہے کہ شاید کسی بندے کو اس کار عظیم کی توفیق عطا فرمائے۔[2]

بعد کے بہت سے علمار نے اس کی ترتیب وتبویب کی کوشش کی بعض کا کام مکمل ہوا اور بعض کا ناقص رہ گیا، مگر افسوس کہ وہ سب کتابیں نایاب ہیں، حافظ ابوالحسن ہیثمی نے مسند کی ان روایات کو جو صحاح ستہ سے زائد ہیں، منتخب کر کے ابواب پر مرتب کیا ہے، ابوالحسن ابن عبدالہادی سندی (م ۱۱۳۹ھ) نزیل مدینہ منورہ نے اس کی ضخیم شرح لکھی ہے بہت سے علمار مسند کا اختصار بھی کیا ہے۔

موجودہ زمانے میں احمد بن عبدالرحمٰن البنّا نے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے ان کی کتاب کا نام ہے "الفتح الربانی" جو چھپ چکی ہے، شیخ احمد شاکر نے بھی اس کی ترتیب و تحقیق کی ہے، جس کی کچھ جلدیں چھپ گئی ہیں، تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔

تعداد روایات | مسند میں تقریباً سات سو صحابہؓ کی روایات ہیں، روایات کی تعداد تین ہزار بتائی گئی ہے، اور عبداللہ کی زوائد کا شمار کر کے چالیس ہزار تعداد بتائی گئی ہے، شاہ عبدالعزیزؒ صاحب فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ مکررات کے ساتھ یہ تعداد مراد ہو۔

زوائد مسند | شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مسند میں امام صاحبؒ کے صاجزادے عبداللہ

---

[1] بستان ص ۲۶ [2] امام احمد بن حنبل ص ۱۶۲ از شیخ ابوزہرہ

نے اضافے بھی کئے ہیں، اسی طرح عبداللہ سے روایت کرنے والے ابوبکر قطیعی نے بھی اضافہ کیا ہے[1]، عبداللہ نے اکثر اضافے امام صاحبؒ سے سنی ہوئی روایات کے کئے ہیں یہی اصل مسند ہے، کچھ دیگر شیوخ کی تعداد کا اضافہ بھی کیا ہے مگر ان کی تعداد کم ہے[2]۔

مسند میں تخریج روایات کی شرط

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں: "ذکروا ان احمد بن حنبل شرط فیہ ان لایخرج الاحدیثا صحیحا"[3] لوگوں نے بیان کیا ہے کہ امام احمدؒ نے اپنی مسند میں صرف صحیح حدیثوں کی تخریج کو شرط قرار دے رکھا ہے، لیکن امام صاحب نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے فرمایا کہ میں نے مسند میں حدیث مشہور کا قصد کیا ہے، اور لوگوں کو اللہ کے پردے کے تحت چھوڑ دیا ہے، اگر میں صرف احادیث صحیحہ جو میرے پاس ہیں انہیں کو درج کرتا تو مسند میں روایات کی تعداد بہت کم ہوتی، میرے بیٹے! تم حدیث میں میرے طریقے سے واقف ہو کہ میں حدیث ضعیف کی مخالفت نہیں کرتا الا یہ کہ باب میں (اس سے قوی روایت) معارض ہو[4]۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ مسند کی شرط ابوداؤد کی شرط سے قوی ہے جو انہوں نے اپنی سنن میں اختیار کر رکھا ہے، چنانچہ ابوداؤد نے اپنی سنن میں ایسے لوگوں سے روایت کی ہے، جن سے مسند میں اعراض کیا گیا ہے[5]۔

مسند میں کسی راوی کی روایت درج ہونے کے بعد اگر راوی یا روایت کا غیر معتبر ہونا معلوم ہوتا تو اس کو امام صاحبؒ چھانٹ دیتے تھے، تادم زیست مسودہ میں حذف و

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۱ ص ۲۰۳ [2] بستان ص ۲۹ [3] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۳۰

[4] احمد بن حنبل ص ۱۶۴ [5] توجیہ النظر ص ۱۵۴

ترمیم فرماتے رہے۔[1]

حضرت شاہ ولی اللہ نے مسند کو طبقۂ ثانیہ کی کتب کے قریب قریب بتایا ہے[2]۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں: امام احمدؒ نے مسند میں جن روایات کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے وہ قابلِ احتجاج ہیں[3]۔

مسند کی بعض خصوصیات

(۱) حدیث کا اتنا بڑا اور کوئی مجموعہ نہیں (۲) اس میں قریباً تین سو ثلاثی روایات ہیں (۳) حافظ شمس الدین جزری لکھتے ہیں: "مامن حدیث غالبًا الا ولہ اصل فی ھٰذا المسند واللہ اعلم[4]" کوئی حدیث غالباً ایسی نہیں جس کی اصل اس مسند میں نہ ہو واللہ اعلم (۴) دیگر مسانید سے صحیح تر ہے

مسند پر ابن جوزی وغیرہ کے اعتراضات

علامہ ابن الجوزی و حافظ عراقی نے مجموعی طور مسند کی ۳۸ روایات کو موضوع قرار دیا ہے، جیسا کہ حافظ سیوطی نے "التعقاب علی الموضوعات" کے آخر میں تحریر فرمایا ہے، اور ان سب کا جواب بھی دیا ہے۔

حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ اصل مسند میں بھی چند روایات موضوع درج ہو گئی ہیں البتہ امام صاحبؒ کے صاحبزادے عبداللہ کے زوائد میں ضعیف و موضوع دونوں طرح کی روایات شامل ہیں[5]۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں وضاحت کی ہے کہ مسند اور عبداللہ کے زوائد کی کوئی حدیث موضوع نہیں ہے، البتہ ابوبکر قطیعی کے زیادات میں بعض حدیثیں

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۱ ص۲۰۲ [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص۱۰۷ [3] نیل الاوطار ج ۱ ص۱۳

[4] تدریب ص۱۰۱ [5] تدریب ص۹۹ و ص۱۰۰

موضوع کہی گئی ہیں[1]۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے حافظ عراقی وابن جوزی کے اعتراضات کے جواب میں مستقل ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام رکھا ہے" القول المسدد فی الذب عن المسند" کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ :" اس تصنیف عظیم کا دفاع ضروری معلوم ہوا جس کی امت میں مقبولیت و تعظیم ہے، اس کتاب میں ان نو ۹ روایات کا جواب ہے جن کو حافظ عراقی نے موضوع قرار دیا ہے، اور پندرہ ۱۵ وہ ہیں جن کو ابن جوزی نے کتاب الموضوعات میں داخل کیا ہے، حافظ سیوطی فرماتے ہیں، مگر چودہ ۱۴ حدیثیں رہ گئی تھیں، اس لئے ان کا جواب میں نے" الذیل الممہد" میں لکھ دیا ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مسند میں کوئی حدیث بے اصل نہیں سوائے تین یا چار کے، مگر احتمال ہے کہ امام احمد نے کاٹ کر نکالنے کی وصیت کی ہو وہ سہواً رہ گئی ہوں، یا کاٹ کر نیچے لکھ دیا ہو، بہرحال اصل کتاب سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

ابوالحسن بن عبدالہادی سندی م ۱۱۳۹ھ نزیل مدینہ منورہ نے مسند کی شرح لکھی ہے، اور زین الدین عمر بن احمد شجاع حلبی نے اس کا اختصار کیا ہے، اور اس کا نام" المنتقد من مسند الامام احمد" رکھا ہے، اسی طرح سراج الدین عمر بن علی جو ابن الملقن کے نام سے مشہور ہیں، انہوں نے بھی مسند کا اختصار کیا ہے[2]۔

---

[1] توجیہ النظر ص۱۵۴ [2] مفتاح السنہ للخولی ص۳۷

امام بخاریؒ

نام ونسب سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بُردِزبہ۔ بردزبہ مجوسی تھے اور اسی مجوسیت پر ان کا انتقال ہوا، ان کے صاحبزادہ مغیرہ پہلے شخص ہیں، جو امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھوں پر مشرف باسلام ہوئے، اسی نسبت سے امام موصوف جعفی مشہور ہوگئے، ورنہ جعف خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہیں[1]۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام موصوف کے دادا ابراہیم کی زندگی کے حالات معلوم نہیں ہوسکے[2]۔ البتہ امام بخاری کے والد سماعیل اپنے زمانہ میں طبقۂ رابعہ کے مشہور محدث شمار کئے گئے ہیں، ان کے شیوخ میں امام مالک، حماد بن زید وغیرہ ہیں، لیکن عبداللہ بن مبارک کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے والد اسماعیل نے حماد بن زید کو دیکھا کہ انہوں نے عبداللہ بن مبارک سے دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا اور انہیں امام مالکؒ سے بھی سماع

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۵۰ [2] مقدمہ فتح الباری ص ۱۷

حاصل ہے، اور عبداللہ بن مبارک امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے ہیں لیکن تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔[عہ][۱]

پیدائش اور ابتدائی حالات

امام بخاری ۱۳ شوال نماز جمعہ کے بعد ۱۹۴ھ میں بخارا ہی میں پیدا ہوئے، بچپن میں نابینا تھے، لیکن والدہ کی دعا کی برکت سے آنکھیں روشن ہوگئیں، امام صاحبؒ کی والدہ نے جب ان کے لئے دعا کرنا شروع کی تو خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا، آپ نے فرمایا کہ تمہاری کثرت دعا کی برکت سے اللہ تعالےٰ نے تمہارے لڑکے کی بینائی واپس کر دی، اس خواب کی صبح کو وہ واقعی بینا ہوگئے۔[۲]

امام صاحب کے والد اسماعیل کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا، اور انہوں نے اپنی والدہ کے آغوش شفقت میں نشو ونما پائی، سولہ (۱۶) سال کی عمر میں امام موصوف نے عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع کی کتابوں کو حفظ کرلیا تھا، پھر اپنے بڑے بھائی اور والدہ کے ساتھ حج کیلئے گئے، بھائی تو بخارا واپس آگئے اور امام موصوف نے حج سے فراغت کے بعد دوسال مکہ معظمہ میں قیام فرمایا، پھر اٹھارہ سال کی عمر میں مدینہ منورہ کا رخ کیا، اور وہاں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس چاندنی راتوں میں "قضایا الصحابہؓ والتابعین" اور "التاریخ الکبیر" تصنیف کی۔[۳]

سماع حدیث کیلئے سفر

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ کے سفر کا آغاز ۲۱۰ھ سے ہوا، انہوں نے سماع حدیث کے لئے

---

۱ لامع الدراری ص۴۲ بحوالہ تہذیب الکمال ۲ مقدمہ فتح الباری ص۴۵۸ ۳ ایضاً ص۴۷۹ عہ ۱۵ اسکے خلاف جن شروح حدیث یا کتاب میں ہے وہ غلط ہے، ناسخ کی غلطی ہے یا مؤلف سے فروگزاشت ہوگئی ہے (لامع ص۶)

دُور دراز مقامات کا سفر کیا۔ شام، مصر اور جزیرہ میں دو بار تشریف لے گئے، اور حجاز مقدس میں چھ سال قیام فرمایا، کوفہ و بغداد جو علماء کا مرکز تھا، بار بار گئے، اور بصرہ میں چار مرتبہ جانا ہوا، اور بعض دفعہ پانچ پانچ سال تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جایا کرتے تھے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام موصوف آٹھ مرتبہ بغداد آئے اور ہر مرتبہ امام احمد بن حنبل بغداد کے قیام پر اصرار کرتے تھے۔[1]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود امام صاحبؒ نے امام احمد سے بہت کم روایت کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحبؒ کو خود امام احمد کے مشائخ سے استفادہ کا موقع ملا تھا، اور اس لئے کہ اخیر سفر میں امام صاحب نے روایت کرنا بہت کم کر دیا تھا[2]، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے سب سے پہلے سماع حدیث ۲۰۵ھ میں شروع کیا اور اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کرنے کے بعد ۲۱۰ھ سے انہوں نے سفر کا آغاز کیا، اس سلسلہ میں نیشاپور کا بھی سفر کیا تھا اور وہاں بھی کچھ دنوں مقیم رہے تھے۔[3]

اساتذہ وشیوخ

امام بخاری کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے ان کا خود بیان ہے: "کتبت عن الف وثمانین نفسًا لیس فیھم الاصاحب حدیث[4]" (میں نے ایک ہزار اسی آدمیوں سے حدیثیں لکھیں، ان میں سب کے سب محدث تھے) لیکن یہ مسلم ہے کہ ان کو اسحٰق بن راہویہ اور علی بن المدینی سے زیادہ فیض پہنچا تھا۔

حافظ ابن حجر نے ان کے شیوخ کے پانچ طبقات قائم کئے ہیں۔

(۱) تبع تابعین، مثلاً محمد عبداللہ الانصاری، ابوعاصم النبیل۔

---

[1] ارشاد الساری ص۳۱ [2] مقدمہ لامع ص۶ بحوالہ فتح الباری [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ [4] مقدمہ فتح الباری ص۴۷۹

(۲) تبع تابعین کے وہ معاصر جنہوں نے کسی ثقہ تابعی سے حدیث کی روایت نہیں کی جیسے آدم بن ایاس۔

(۳) امام صاحبؒ کے اساتذہ کا یہ درمیانی طبقہ ہے، اس میں ان لوگوں کا شمار ہے جن کو کبار تبع تابعین سے اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ۔

(۴) معاصرین اور ہم عصر رفقاء، جیسے محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوحاتم رازی۔

(۵) وہ معاصرین جو امام صاحب کے تلامذہ کے صف کے تھے، لیکن ان سے بھی بعض مرتبہ انہوں نے روایت کی ہے، جیسے عبداللہ بن حماد آملی وغیرہ۔

ان محدثین سے استفادہ میں امام صاحب نے امام وکیع کے اس مقولہ پر عمل فرمایا ہے کہ آدمی اس وقت تک محدث نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے بڑوں، معاصرین اور چھوٹوں سے استفادہ نہ کرے[۱]، اسی لئے امام موصوف نے اپنے معاصرین وتلامذہ سے بھی روایت کی ہے[۲]۔

تلامذہ

امام صاحبؒ کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا، فربری لکھتے ہیں کہ امام صاحب سے براہ راست نوّے ہزار آدمیوں نے جامع صحیح کو سنا تھا[۳]، امام صاحب کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی اس میں شریک ہوتے تھے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے مکان میں منعقد ہوتی تھی۔ ان کے شاگردوں میں بڑے پایہ کے علماء ومحدثین تھے مثلاً حافظ ابوعیسیٰ ترمذی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، مسلم بن حجاج وغیرہ جو حدیث کے ارکان

---

[۱] مقدمہ فتح الباری ص۴۸۰ [۲] تہذیب التہذیب جلد ۸ ص۵۱ [۳] ارشاد الساری ص۳۳

ستہ کے جلیل القدر رکن ہیں[1]، ابوزرعہ، ابوحاتم، ابن خزیمہ محمد بن نصر مروزی، ابوعبداللہ الفربری وغیرہم بھی امام صاحب کے تلامذہ میں ہیں جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے محدث ہوئے، اور ہزاروں لاکھوں کو نفع پہنچایا[2]

غیر معمولی قوتِ حافظہ

امام موصوف نہایت قوی الحافظہ تھے، استاد سے جو حدیث بھی سنتے فوراً زبانی یاد ہو جاتی، کہا جاتا ہے کہ بچپن ہی میں انکو ستر ہزار حدیثیں یاد تھیں جس کتاب پر ایک نظر ڈال لیتے تھے، وہ حافظہ میں محفوظ ہو جاتی تھی۔

ابن مجاہد بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں محمد بن السلام بیکندی کے پاس تھا، انہوں نے فرمایا کہ اگر تم کچھ دیر پہلے آگئے ہوتے تو میں تمہیں ایک ایسا بچہ دکھاتا جسکو ستر ہزار حدیثیں زبانی یاد ہیں[3]۔

امام صاحب خود فرماتے تھے کہ "مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں اور اس جامع صحیح کو میں نے چھ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے[4]"۔ امام صاحبؒ کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ جس وقت بغداد تشریف لائے تو وہاں کے محدثین نے آپ کا امتحان لینا چاہا چنانچہ سو[1] احادیث کے متن اور سندوں میں الٹ پھیر کر کے دس آدمیوں کے حوالہ کیا کہ ہر شخص ان میں سے دس دس حدیثیں اسی طرح امام صاحب کے سامنے پیش کرے، شہر کے بہت سے لوگ اس کو دیکھنے کیلئے جمع ہوئے پھر ان محدثین نے حدیثیں پیش کیں، ہر مرتبہ امام موصوف لاادری ہی فرماتے رہے، جب سب لوگ حدیثیں پیش کر چکے تو امام صاحب نے ہر متن کو اسکی اصلی سند اور ہر سند کو اس کے اصلی متن کے ساتھ ملحق کر کے ترتیب وار سنا دیا، لوگ سن کر دنگ رہ گئے، اور آپ کے علم و فضل کا ان کو لوہا ماننا پڑا، " فأقر الناس له بالحفظ وأذعنوا له بالفضل "۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تعجب اس پر نہیں ہے کہ صحیح و غلط میں امتیاز کر دیا کمال

لے تہذیب الاسماء واللغات ص۶۳ از نووی ؎۲ تذکرۃ الحفاظ ؎۳ مقدمہ فتح الباری ص۴۸۷ ؎۴ مقدمہ ارشاد الساری ص۲۹

یہ ہے کہ ان لوگوں نے جس ترتیب سے روایات کو غلط شکل میں پیش کیا تھا، اس کو بھی بیان کردیا۔[1]

انسائیکلوپیڈیا کے مصنفین نے بھی امام بخاری کے کمال حفظ کے متعلق لکھا ہے: "امام بخاری کا حافظہ و استحضار اس غضب کا تھا کہ معاصرین ائمہ تک کو وہ ایک کرامت نظر آتا تھا۔"[2]

امام بخاری کا زہد و تقویٰ

علامہ کرمانی کہتے ہیں کہ امام صاحب کو اللہ تعالےٰ نے دنیا بھر کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، انہوں نے اپنے والد سے ترکہ میں بہت سا مال پایا تھا، اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے رہتے تھے، اور بسا اوقات آپ کو دو یا تین بادام پر ایک دن گزارنا پڑا، شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: "کان قلیل الأکل جداً مفرداً فی الجود وقال کان یقنع کل یوم بلوزتین او ثلاث۔"[3]

امام صاحبؒ نے کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ بارہا اس کے مواقع آئے، ان کے شاگرد امام موصوف کے واسطہ سے بیان کرتے ہیں کہ جس وقت میں آدم بن ایاس کی خدمت میں حاضر ہوا، تو خرچ کے آنے میں بڑی تاخیر ہوئی، یہاں تک کہ مجھ کو گھاس کھاکر دو دن گزارنے پڑے تیسرے دن ایک صاحب نے آکر مجھے دینار کی تھیلی پیش کی، جن کو میں پہچانتا بھی نہ تھا، اسی طرح ان کے ایک اور شاگرد کا امام صاحب کے واسطہ سے بیان ہے کہ جس وقت سے مجھے غیبت کی حرمت معلوم ہوئی، اس وقت سے میں نے کسی کی غیبت نہیں کی، اور اللہ تعالےٰ سے مجھے

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص۵۲۳ و فتح المغیث ص۱۱۶ [2] جلد چہارم ص۵۲۴ [3] فیما یجب حفظہ للناظر ص۲

امید ہے کہ وہ اس بارے میں میرا محاسبہ نہیں فرمائے گا۔

امام موصوف ایک مرتبہ بیمار ہوئے، ان کا قارورہ اطباء کو دکھایا گیا، انہوں نے کہا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ سالن استعمال نہیں کرتے، امام موصوف نے فرمایا کہ چالیس سال سے ..... سالن استعمال کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، نماز میں امام صاحب کے استغراق کا یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے، کہ ایک بار ظہر کی نماز سے فراغت کے بعد نفل میں مشغول ہوگئے، اس سے فارغ ہونے کے بعد اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر اپنے بعض ساتھیوں سے فرمایا کہ دیکھو قمیص کے اندر کچھ ہے تو نہیں، انہوں نے دیکھا تو بھڑ نکلی جس کے ڈنک سے سترہ نشانات تھے، اور جسم کا وہ حصہ متورم ہوگیا تھا، ایک صاحب نے عرض کیا کہ آپ نے نماز کیوں نہیں توڑ دی فرمایا میں ایک ایسی سورہ پڑھ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا کہ اس کو ختم کرلوں[1]۔

شیوخ ومعاصرین کا اعتراف

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ کی مدح میں اگر متاخرین کے اقوال نقل کئے جائیں تو کاغذ اور روشنائی ختم ہو جائے؛

"فذلك بحر لا ساحل له" ع

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

ان کے شیوخ ومعاصرین سب ان کے کمالات کے معترف تھے، ایک مرتبہ عمرو بن زرارہ اور محمد بن رافع امام بخاری سے علل حدیث کے متعلق مختلف سوالات کے جواب حاصل کرنے کے بعد جب رخصت ہونے لگے، تو حاضرین مجلس سے مخاطب

---

[1] مقدمہ قسطلانی ص۳۱ ولامع ص۵

ہو کر کہا کہ "ابوعبد اللہ افقہ منا واعلم وابصر" امام اسحٰق بن راہویہ نے فرمایا "ھو ابصر منی"۔ حالانکہ اس وقت امام صاحب سبزہ آغاز تھے، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اسانید و علل میں امام بخاریؒ سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں پایا، امام مسلمؒ نے امام بخاری کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شہادت دی "اشھد انہ لیس فی الدنیا مثلک"[1] ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اس آسمان کے نیچے امام بخاری سے بڑھ کر میں نے کسی کو عالم حدیث نہیں دیکھا۔[2]

امام صاحب پر دورِ ابتلاء و آزمائش

حدیث میں ہے کہ اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل۔ چنانچہ امام موصوف کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑے بڑے امتحان میں ڈالا۔ امام موصوف ۲۵۰ھ میں جب نیشاپور تشریف لائے تو محمد بن یحییٰ ذہلی نے لوگوں سے کہا کہ ان صالح عالم کی خدمت میں جاکر ان سے حدیثیں سنو، ان کے کہنے پر لوگ اس کثرت سے امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ خود محمد بن یحییٰ کی مجلس درس ماند پڑ گئی، پھر امام صاحبؒ جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اس کی تصویر امام مسلم نے ان لفظوں سے کھینچی ہے کہ اہل نیشاپور نے اس سے پہلے کسی والی اور کسی عالم کا ایسا استقبال نہیں کیا تھا، ان کے استقبال کے لئے نیشاپور سے دو تین منزل باہر نکل آئے تھے، امام صاحب نیشاپور پہنچ کر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، امام ذہلی نے اعلان کر دیا تھا کہ کسی اختلافی مسئلہ میں امام صاحبؒ سے گفتگو نہ کی جائے، ورنہ اگر کوئی جواب ہمارے خلاف ہوا تو خراسان کے لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے، لیکن امام صاحب کے آنے کے دو ہی چار دن کے بعد جب آپ کے اشتیاق میں مکانوں اور چھتوں پر لوگوں کا ہجوم تھا، ایک شخص

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۵ [2] تہذیب جلد ۱ ص ۷۳ الاسماء واللغات از نووی۔

نے قرآن کے الفاظ کے متعلق بار بار سوال کیا، اس لئے مجبوراً امام صاحب کو اس کا جواب دینا پڑا، آپ نے فرمایا: "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق الفاظنا من افعالنا و افعالنا مخلوقۃ والامتحان عنہ بدعۃ" (قرآن کلام الٰہی غیر مخلوق ہے، الفاظ ہماری زبان کا فعل ہیں، اور ہمارے تمام افعال مخلوق ہیں، اور اس مسئلہ میں امتحان لینا بدعت ہے) عوام اس دقیق جواب کو نہ سمجھ سکے اور امام ذہلی نے شدت سے امام صاحب کی مخالفت شروع کردی، اور اپنی مجلس میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص لفظی بالقرآن غیر مخلوق کا قائل ہو وہ ہماری مجلس درس میں نہ آئے، اس پر امام مسلم، احمد بن سلمہ نے جو حلقۂ درس کے ممتاز طالب علم تھے، امام ذہلی کی ساری تقریروں کو واپس کر دیا اور ان کا حلقہ چھوڑ دیا۔

مسئلۂ خلق قرآن میں امام صاحب کا نقطۂ نظر

خلق قرآن کے بارے میں اوپر امام بخاری کا قول نقل کیا گیا ہے، اس سے یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں امام احمد کے خلاف ہیں، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو فی الواقع دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ معتزلہ نے جب یہ مسئلہ اٹھایا کہ جس طرح خدا نے دنیا کو کن فیکون کے ذریعہ پیدا کیا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی پیدا کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مخلوق ہے، لیکن یہ عقیدہ جمہور اہل سنت کے خلاف ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے، اور باری تعالیٰ کی صفت ہے، کیونکہ متلو اور تلاوت کے درمیان فرق ہے، متلو تو قدیم ہے اور تلاوت ہمارا فعل ہے، اس لئے وہ حادث ہے۔ بعض

لوگ اس تفریق کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن امام بخاری متلوا ورتلاوت کے درمیان فرق کرتے تھے، اورامام ذہلی کو اس پر اعتراض تھا۔[۱]

امام احمد نے ان لوگوں پر جنہوں نے کلام اللہ کو مخلوق یا غیر مخلوق کہا یا اس بارے میں توقف اختیار کیا ہے، اس لئے سخت تنقید کی ہے، اور پوری قوت سے ان کا رد کیا، تاکہ آئندہ کے لئے اس مسئلہ پر گفتگو کا دروازہ بند ہو جائے بعد میں حنابلہ نے یہاں تک غلو کیا کہ کلام مجید کی روشنائی اور اوراق سب کو قدیم کہا، بعض نے قلم تک کو جس سے قرآن مجید لکھا گیا ہے، قدیم کہہ دیا، امام بخاری کو اس غلو سے اختلاف تھا، اور ہونا بھی چاہیئے تھا، جیسا کہ بخاری جلد ثانی باب خلق افعال العباد میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اس بنا پر امام بخاری اور حنابلہ میں کشمکش پیدا ہوگئی، اورامام صاحب کو قید وبند کی تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑیں، کیونکہ حکومت پر حنابلہ کا اثر تھا، غرض نیشاپور میں لوگوں نے محض فتنہ انگیزی کے لئے اس قسم کے سوال وجواب پر امام صاحب کو مجبور کیا، جس کے نتیجہ میں ان کو نیشاپور چھوڑ کر اپنے وطن مالوف بخارا واپس آنا پڑا، لیکن وہاں بھی مخالفین نے سکون سے رہنے نہ دیا۔[۲]

وفات چنانچہ امام صاحب کے بخارا واپس آنے کے بعد لوگوں نے والی بخارا کو آپ کے خلاف بھڑکانے کے لئے مختلف مقامات سے اس کے پاس خطوط لکھے، امام ذہلی نے بھی اس میں حصہ لیا، ان خطوط پر والی بخارا امام صاحب سے ناراض ہوگیا،[۳] کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ والی بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے گھر پر جاکر

---

[۱] کتاب الاسماء والصفات جلد ا ص۱۹۸ و ص۱۹۹ [۲] لامع الدراری ص۱۳ وافادات حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ [۳] مقدمہ لامع ص۱۲

اس کے بچوں کو الجامع الصحیح اور التاریخ الکبیر پڑھا کریں، امام صاحب نے اس بنا پر اس سے انکار کیا کہ اس میں علم کی توہین تھی، تو والی بخارا نے کہا کہ لڑکے خود امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں گے، لیکن اس وقت وہاں کوئی دوسرا طالب علم نہ ہو، اس کو بھی امام صاحب نے منظور نہیں کیا، اس پر والی بخارا آپ سے برہم ہو گیا، اور آپ کو بخارا سے نکل جانے کا حکم دیا جب سمرقند والوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، لیکن وہاں کے لوگوں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا مجبوراً اپنے ننہال خرتنگ چلے گئے جو بخارا سے تھوڑے فاصلے پر تھا، پھر رمضان المبارک کا مہینہ گزار کر شوال میں سمرقند جا رہے تھے کہ راستہ میں دفعتاً پیام اجل آگیا، اور ۲۵۶ھ میں باسٹھ[۶۲] سال کی عمر میں حدیث رسولؐ کا یہ آفتاب تاباں غروب ہو گیا[۱]

امام بخاری کا مسلک

امام صاحب کے مسلک کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے، کبار محدثین کے ساتھ ہمیشہ سے یہ معاملہ رہا ہے کہ مختلف مسلک والوں نے ان کو اپنے اپنے مسلک کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یہی معاملہ بخاری کے ساتھ بھی ہوا، تقی الدین السبکی نے طبقات الشافعیہ میں اور نواب صدیق حسن خان صاحب نے ابجد العلوم میں ان کو شافعی لکھا ہے[۲]، حافظ ابن حجر کے نزدیک امام بخاری کے مباحث فقہیہ کا غالب حصہ امام شافعی کے مسلک سے ماخوذ ہے[۳]، علامہ ابن قیم کی تحقیق میں امام موصوف حنبلی تھے[۴] لیکن علامہ طاہر جزائری کی نظر میں مجتہد مطلق ہیں[۵] مگر ان کی جامع صحیح کے مطالعہ سے جیسا کہ علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں، واضح ہوتا ہے کہ آپ بلاشک و شبہہ مجتہد مطلق تھے، اور یہ شہرت کہ آپ شافعی تھے، اور آپ نے مسائل مشہورہ میں امام شافعی کے مسلک کی پیروی کی ہے صحیح نہیں ہے،

۱؎ مقدمہ فتح الباری ص۴۹۴ ۲؎ ابجد العلوم ص۸۱۰ ۳؎ فتح الباری جلد ۱ ص۲۳۳ ۴؎ اعلام الموقعین جلد ۱ ص۲۳۶ ۵؎ توجیہ النظر ص۱۸۵

امام ابوحنیفہؒ کی موافقت بھی امام شافعی سے کم نہیں ہے[1]، حضرۃ الاستاذ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے شافعیہ کے مسائل پر جتنی جگہوں پر رد کیا ہے، اور اس کے وجوہ ہیں[2]، اس پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اگر امام موصوف مجتہد مطلق ہیں تو ان کے خاص شاگرد امام ترمذی نے جہاں اپنی کتاب میں مذاہب کی طویل فہرست نقل فرمائی ہے، اس میں امام موصوف کا مسلک پوری کتاب میں ایک جگہ باب الاقتدار بالامام میں نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ مجتہد مطلق نہیں تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ان کا مذہب رائج نہیں ہوا تھا اور نہ ان کے مقلد ہوئے، اس لئے ان کے مذہب کو بیان نہیں فرمایا[3]۔

تصنیفات

امام صاحبؒ نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، ان کی مجمل فہرست یہ ہے:۔

الجامع الصحیح[1]، الادب المفرد[2]، التاریخ الکبیر[3]، التاریخ الاوسط[4]، التاریخ الصغیر[5]، خلق افعال العباد[6]، جزء رفع الیدین[7]، قرأۃ خلف الامام[8]، برالوالدین[9]، کتاب الضعفاء[10]، الجامع الکبیر[11]، التفسیر الکبیر[12]، کتاب الاشربۃ[13]، کتاب الہبۃ[14]، کتاب المبسوط[15]، کتاب الکنیٰ[16]، کتاب العلل[17]، کتاب الفوائد[18]، کتاب المناقب[19]، اسامی الصحابہ[20]، کتاب الوحدان[21]، قضایا الصحابۃ[22][4]۔

الجامع الصحیح

ان میں سب سے مہتم بالشان "الجامع الصحیح" ہے، جس پر ہمیں آئندہ صفحات میں گفتگو کرنی ہے۔

متعین طور سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ امام موصوف نے اس کتاب کی تصنیف

---

[1] فیض الباری جلد ۱ صـ۵۸ [2] لامع صـ۱۵ [3] افادات [4] اللامع صـ۲۲

کا آغاز کس سنہ سے کیا، اور کب اس سے فارغ ہوئے، لیکن اتنا معلوم ہے کہ تصنیف کرنے کے بعد اس کو اپنے شیوخ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ ابن المدینی م ۲۳۴ھ اور ابن معین م ۲۳۳ھ کے سامنے پیش کیا تھا۔

ابن معین کا سنہ وفات ۲۳۳ھ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سنہ میں بخاری تصنیف سے فارغ ہو چکے تھے، البتہ اس میں کچھ بعد میں اضافے بھی کرتے رہے[1]،

یہ کتاب امام صاحب نے سولہ[16] سال میں مکمل کی، خود فرماتے ہیں: "صنفت کتابی الصحیح فی ست عشرۃ سنۃ"[2] اس لئے اس کا آغاز ۲۱۷ھ میں ہوگا، جب کہ آپ کی عمر شریف ۲۳ سال کی تھی[3]۔

وجہ تالیف امام بخاری کے عہد تک احادیث کے بہت سے مجموعے تیار ہو گئے تھے، جب انہوں نے ان مجموعوں کو دیکھا اور پرکھا تو اس میں صحیح وضعیف ہر طرح کی روایات نظر آئیں، اس لئے انہوں نے احادیث صحیحہ کا ایک مجموعہ تیار کرنے کا ارادہ کیا جس میں کسی قسم کا شک وشبہہ نہ ہو، ان کے استاد امیر المومنین فی الحدیث اسحٰق بن راہویہ نے ان کے ارادہ کو اور زیادہ قوی کر دیا۔

امام بخاری فرماتے ہیں: ایک مرتبہ ہم ان کی خدمت میں حاضر تھے، انہوں نے فرمایا: کاش! احادیث صحیحہ کے عنوان پر ایک کتاب تم جمع کر دیتے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی، دوسری غیبی تائید یہ ہوئی کہ انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں، ان کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے، جس کے ذریعہ آپ کے اوپر سے دفع کر رہے ہیں۔

---

[1] اللامع ص۳۷ [2] وفیات الاعیان جلد ۲ ص۳۳۵ [3] اللامع ص۲۶

بیدار ہو کر بعض معبرین سے تعبیر دریافت کی، انہوں نے کہا تم حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے کذب کو دفع کرو گے، اس خواب نے ان کے شوق و ہمت کو اور بلند کر دیا، اور الجامع الصحیح کی تالیف میں ہمہ تن مشغول ہو گئے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مولف نے پوری کتاب میں صحت کا التزام رکھا ہے جو اسکے نام سے ظاہر ہے[1]۔

وجہ تسمیہ اس کتاب کا پورا نام ہے "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وأیامہ"

الجامع: جس میں فن حدیث کے آٹھوں ابواب ہوں، اس کو جامع کہتے ہیں اور اس میں سب ابواب موجود ہیں۔ الصحیح اس کی تمام حدیثیں صحیح ہوں، اگر کوئی معلل یا شاذ روایت آگئی تو اس کا ضمناً ذکر ہے۔ المسند بطور تاکید کے ہے، سنۃ یعنی آپ کے اقوال و افعال و احوال پر مشتمل ہے۔ أیامہ: امام بخاری نے دور جاہلیت کے بعض ایسے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جس سے آپؐ کی زندگی کا تعلق ہے[2]۔

اس تصنیف میں اہتمام اس تصنیف میں امام بخاری نے سولہ[۱۶] سال صرف کئے، اور اس کو انہوں نے تین بار تصنیف کیا، فرماتے ہیں: قد صنفت کتبی ثلاث مرات۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں: "کانہ اراد بالتکریر التنقیح"[3] یعنی تنقیح و تہذیب تین بار فرمائی، علامہ عینی فرماتے ہیں: ابن طاہر نے کہا کہ امام بخاری نے صحیح بخاری کو بخارا میں تصنیف کیا، ابن بجیر فرماتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بصرہ میں، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں تصنیف ہوئی[4]۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص۵ [2] افادات حضرت الاستاذ شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

[3] مرقاۃ جلد ۱ ص۱۳ [4] عمدۃ القاری جلد ۱ ص۵

لیکن خود امام بخاری کا بیان ہے کہ میں نے "الجامع الصحیح" کو مسجد حرام میں تصنیف کیا، اور ہر حدیث کو درج کرنے سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ سے استخارہ کر کے دو رکعت نماز پڑھتا تھا، اور جب اس کی صحت پر پوری طرح انشراح ہو جاتا تھا، اس وقت حدیث کو کتاب میں جگہ دیتا تھا، اس اہتمام کی وجہ سے لوگوں کا قول ہے کہ امام بخاری نے گویا براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے

کان البخاری فی جمعہ　　تلقّٰی من المصطفیٰ ما اکتتب[۱]

بخاری نے تراجم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک اور منبر شریف کے درمیان مسودہ سے مبیضہ میں منتقل کیا تھا، اور ہر ترجمہ کے لئے دو رکعت نماز پڑھتے تھے[۲]۔

مقام تصنیف کے بارہ میں جو متعدد مقامات بیان کئے جاتے ہیں، ان میں حافظ ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ تصنیف کا ابتدائی خاکہ اور ترتیب والواب تو مسجد حرام میں لکھ لئے تھے، اور مختلف مقامات پر احادیث کی تخریج فرماتے رہے، تراجم الواب کے مسودہ کو مزار مبارک اور منبر شریف کے درمیان مبیضہ میں تبدیل فرمایا[۳]۔

الجامع الصحیح کی مقبولیت

بخاری شریف کے محاسن وفضائل بے شمار ہیں، جس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، حافظ ابن صلاحؒ بخاریؒ ومسلمؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "کتاباھما اصح الکتاب بعد کتاب اللہ العزیز ثم ان کتاب البخاری اصح الکتابین صحیحا واکثرھما فوائد[۴]" یعنی کتاب اللہ کے بعد ان دونوں کتابوں کا درجہ ہے، پھر صحیح بخاری کا مرتبہ صحت اور کثرت فوائد کے لحاظ سے ممتاز و مقدم ہے، امام نسائی فرماتے ہیں: "اجود ھذہ الکتب

---

[۱] ارشاد الساری ص۲۰ [۲] مقدمہ فتح الباری ص۴۹۱ [۳] ایضاً ص۴۹ [۴] مقدمہ ابن صلاح۔

کتاب البخاری[1]

ابو زید مروزی فرماتے ہیں کہ میں حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان سویا ہوا تھا کہ خواب میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ نے فرمایا، اے ابو زید! امام شافعیؒ کی کتاب کا درس کب تک دو گے؟ میری کتاب کا درس آخر کب دو گے؟ انہوں نے عرض کیا حضور، آپؐ کی کونسی کتاب ہے؟ فرمایا محمد بن اسمٰعیل البخاری کی "الجامع الصحیح"[2]

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس کتاب کی عظمت کا قائل نہ ہو وہ مبتدع ہے، اور مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے[3]، شاہ صاحب قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ صحیح بخاری کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔[4]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: بخاری شریف کے پڑھنے سے قحط سالی دور ہو جاتی ہے اور قحط کے زمانے میں اس کے ختم کی برکت سے بارش کا نزول ہوتا ہے۔[5]

ایک محدث نے اس کو ایک سو بیس (۱۲۰) مرتبہ مختلف مقاصد کے لئے پڑھا، اور ہر مرتبہ کامیابی ہوئی۔[6]

جامع صحیح کا مقصد و مقصودِ اعظم

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مصنف نے پوری کتاب میں صحت کا التزام رکھا ہے اور اس میں صرف احادیث صحیحہ ہی لائے ہیں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کے ساتھ انہوں نے فقہی مسائل اور حکیمانہ نکتوں کا بھی لحاظ رکھا ہے، چنانچہ متون

---

[1] تہذیب الاسماء والصفات جلد ۱ ص ۶۷ [2] مقدمہ فتح الباری ص ۵۷۷ [3] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۲۹۷ [4] ایضاً جلد ۱ ص ۲۵۰ [5] ارشاد الساری جلد ۱ ص ۲۹ [6] اتحاف النبلاء ص ۱۰۴ ولامع ص ۲۴

احادیث سے بہت سے معانی استنباط فرماتے ہیں، جو مناسب طریقے سے پوری کتاب میں موجود ہیں، اسی طرح آیات احکام کی طرف بھی پوری توجہ رکھی ہے، اور اس سے عجیب وغریب معانی کی طرف اشارہ کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: امام بخاری کی اصل غرض احادیث کے ذخیرہ میں سے صحیح ومستفیض ومتصل کا انتخاب ہے، اور فقہ و سیرت اور تفسیر کو بھی استنباط کیا ہے، اور اخذ حدیث میں جو شرط انہوں نے مقرر کی تھی، وہ بدرجۂ کمال پوری کی ہے[1]۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام موصوف کا مقصود اعظم اپنی الجامع الصحیح میں طرق استنباط ہے، اسی لئے فقه البخاری فی تراجمه کہا گیا ہے، بخاری کا سارا کمال ان کے تراجم ابواب میں ہے[2]۔

امام بخاری کے تخریج کے شرائط

شروط الائمہ پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ ان ائمہ یعنی بخاری ومسلم اور سنن اربعہ کے مصنفین میں کسی سے بھی تخریج روایات میں ان کے شرائط منقول نہیں، بلکہ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے[3]، بخاری کی شرط یہ ہے کہ وہ ایسی روایت کی تخریج کرتے ہیں جس کے سارے رواۃ صحابی مشہور تک ثقہ ہوں، اور ان کی ثقاہت پر کبار محدثین کا اتفاق ہو، اس کی سند متصل ہو منقطع نہ ہو، جس روایت کے صحابی سے دو یا اس سے زیادہ راوی ہوں، وہ نہایت ہی اعلیٰ وارفع ہوگی، اور اگر ایک ہی راوی ہو اور اس کی سند صحیح ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں امام مسلم نے ایسے لوگوں سے بھی حدیث کی تخریج کی ہے، جن کی حدیث کو کسی شبہہ کی بنا پر امام بخاری

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۱۵۱ [2] لامع ص ۲۴ [3] شروط الائمہ ص ۱

نے ترک کر دیا تھا، جس کی مثال امام زہری کے تلامذہ ہیں جو اوصاف کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے پانچ طبقوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، امام بخاری نے ان میں سے طبقۂ اولیٰ سے اصالۃً اور طبقۂ ثانیہ سے جن کی احادیث پر ان کو اعتماد ہے، ان کو بخاری میں روایت کیا ہے، لیکن بالاستیعاب ایسا نہیں کیا ہے، اور امام مسلم نے دونوں طبقوں کی حدیث کو بالاستیعاب لیا ہے، اسی طرح طبقۂ ثالثہ کی روایات کو امام بخاری نے بالکل قبول نہیں کیا ہے، لیکن امام مسلم ان سے بھی کبھی کبھی روایت کرتے ہیں[1]۔

اسی طرح ابو عبداللہ حاکم نے حدیث صحیح کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کو کوئی مشہور صحابی نبی کریمؐ سے روایت کرے، پھر اس صحابی سے دو ثقہ راوی روایت کرتے ہوں لیکن صحیحین سے ان کا دعوے ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ شیخین نے بہت سے ایسے صحابہ کی روایات کو نقل کیا ہے، جن سے صرف ایک ہی راوی نے روایت کی ہے[2]۔

کتب احادیث میں جامع بخاری کا مقام

مذکورہ بالا شرائط اور دیگر وجوہ کی بنا پر امت کا اتفاق ہے کہ صحیح بخاری کو صحاح اور تمام کتب حدیث پر ترجیح حاصل ہے، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ صحیح بخاری صحت اور دیگر فوائد کے لحاظ سے صحیح مسلم پر فائق ہے[3]۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں: ”لا یوازیه فیه غیره لا صحیح مسلم ولا غیره[4]۔“ (بخاری کا صحیح مسلم یا اور کوئی کتاب مقابلہ نہیں کر سکتی)۔

البتہ امام شافعی سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ: ”انه قال ما اعلم فی

---

[1] تدریب الراوی ص۴۱ [2] ایضاً ص۳۸ [3] مقدمہ شرح مسلم ص۱۱ [4] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص۲۸

الارض کتابا اکثر صوابا من کتاب مالك وفی لفظ عنه ما بعد کتاب اللہ اصح من موطا مالك " (روئے زمین پر امام مالک کی کتاب سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی کتاب نہیں ہے اور ایک روایت میں ہے کہ کتاب اللہ کے بعد موطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے)۔

لیکن علامہ نووی فرماتے ہیں کہ امام شافعی کا یہ فیصلہ ان دونوں کتابوں کے وجود میں آنے سے پیشتر تھا امام شافعی کی وفات ۲۰۴ھ میں ہوئی جب کہ امام بخاری کی عمر دس سال کی تھی، اور اسی سال امام مسلم پیدا ہوئے[1]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں: بخاری، مسلم و موطا کی حدیثیں نہایت صحیح ہیں اور موطا کی اکثر روایات مرفوعہ صحیح بخاری میں موجود ہیں[2]۔

لیکن حاکم کے شیخ ابو علی نیشاپوری اور بعض مغاربہ نے صحیح مسلم کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ العزیز۔ کہا ہے، حافظ ابن حجر نے اس قول کی یہ توجیہ کی ہے کہ ممکن ہے ان لوگوں نے حسن ترتیب کے لحاظ سے مسلم کو ترجیح دی ہو۔ کیونکہ امام مسلم نے اپنے شہر میں بیٹھ کر نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی کتاب کی تصنیف کی، اور امام بخاری نے مختلف مقامات میں رہ کر روایات کی تخریج کی ہے، حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب) فرماتے تھے کہ اگر ان کے قول کی یہ توجیہ نہ کی جائے تو بھی جمہور کے مقابلہ میں ان کا قول شاذ و ناقابل اعتبار ہے[3]۔

صحیح بخاری کے صحیح مسلم پر ترجیح کی ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ بخاری کی روایات کے مقابلہ میں مسلم کی روایات پر زیادہ کلام کیا گیا ہے۔

امام دارقطنی فرماتے ہیں: لولا البخاری لما جاء مسلم۔[4] (اگر بخاری نہ

---

[1] لامع ص۱۲ [2] عجالۂ نافعہ ص۶ [3] افادات [4] مقدمہ فتح الملہم۔

ہوتے تو مسلم کا وجود نہ ہوتا)

تعداد روایات علامہ نووی و شیخ ابن صلاح کے نزدیک تکرار کے ساتھ بخاری کی روایات کی تعداد ۷۲۷۵ ہے، اور عدم تکرار کے ساتھ ۴۰۰۰ ہے[1]

لیکن حافظ ابن حجر نے پوری احتیاط سے شمار کیا تو روایات مرفوعہ کی تعداد ۷۳۹۷، اور تکرار کے ساتھ متابعات و تعلیقات کی تعداد ۱۳۴۱ ہے، جن میں اکثر کو امام بخاری نے مسنداً بیان کر دیا ہے، اور موقوفات صحابہ و مقطوعات تابعین کی تعداد ۳۴۱ ہے، اس طرح مجموعی تعداد ۹۰۴۷ ہے، غیر مکرر روایات مرفوعہ ۲۳۵۳، اور غیر مکرر متابع و معلق ۱۶۰ ہیں، اس طرح غیر مکرر مجموعہ ۲۵۱۳ ہے، اس تعداد میں آثار صحابہ و تابعین جن کا تراجم ابواب میں تذکرہ ہے شامل نہیں ہیں[2]۔

جامع صحیح کی خصوصیات (۱) امام بخاری کو دوران تالیف میں جب کبھی تالیف کا سلسلہ چھوڑنا پڑا تو دوبارہ جب بھی شروع کیا تو اس کی ابتدا بسم اللہ سے کی، اس لئے درمیان میں متعدد جگہوں پر بسم اللہ مذکور ہے۔

(۲) عام طور پر مشہور ہے کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں صیغۂ تمریض سے روایات کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ جن معلق روایات کو امام موصوف نے صیغۂ جزم سے بیان کیا ہے ان کی صحت کا فیصلہ کیا گیا ہے، لیکن جب صیغۂ تمریض سے بیان کرتے ہیں تو ان کی صحت کا حکم تو نہیں لگایا جائے گا، لیکن صحیح بخاری میں آجانے کی وجہ سے ناقابل اعتبار بھی نہیں سمجھا جائے گا، حافظ ابن حجر نے علامہ نووی کے کلام پر تعقب کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں صحیح رائے ہمارے شیخ کی ہے

---

[1] تدریب ص ۳۰ [2] مقدمہ فتح ص ۴۶۵ و لامع ص ۳۸

کہ امام بخاری صیغۂ تمریض کو ضعف اسناد کے ساتھ خاص نہیں کرتے بلکہ جب کبھی متن کو بالمعنیٰ اختصار کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہوتا ہے تو صیغۂ تمریض سے اس اختلاف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

(۳) صحیح بخاری کا امراض و مصائب، دشمنوں کے خوف و غلبہ کی گرانی وغیرہ میں پڑھنا تریاق مجرب ہے۔

(۴) عام طور پر مشہور ہے کہ امام بخاری جب قال فلاں کہتے ہیں تو یہ مذاکرہ پر محمول ہوتا ہے، علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس کا رتبہ تحدیث سے کم ہے، اور یہ صیغہ وہاں استعمال کرتے ہیں، جہاں روایت ان کی شرط پر نہیں ہوتی، لیکن یہ کلیہ نہیں ہے، کیونکہ کبھی اس کو صیغۂ تحدیث سے بھی بیان کر دیتے ہیں۔

(۵) امام بخاری کا معمول ہے کہ جب حدیث میں کوئی ایسا غریب لفظ آجاتا ہے جس کی نظیر کتاب اللہ میں موجود ہے تو اس کی وضاحت میں مفسرین کے اقوال نقل کر دیتے ہیں، اسی طرح کبھی باب کی مناسبت سے آیات قرآنی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، اور اکثر آیات کے بجائے صرف اس کے چند الفاظ نقل کر دیتے ہیں، کتاب التفسیر و کتاب بدء الخلق میں بکثرت اس کی مثالیں ہیں۔

(۶) محدثین کرام کے نزدیک سند عالی کی بڑی خصوصیت رہی ہے، بخاری کا یہ خاص امتیاز ہے کہ اس میں بائیس[۲۲] روایات ثلاثی ہیں، جن کا تذکرہ حاشیہ پر نہایت جلی قلم سے کیا گیا ہے، ان میں سے بعض ثلاثیات کے شیوخ حنفی ہیں، اور دو کے متعلق تحقیق نہیں[۱]۔

---

[۱] لامع صنہ ۳

(۷) شروع میں بیان کیا جاچکا ہے کہ امام بخاری کے پیش نظر طرق استنباط ہے، اس لئے ایک ہی حدیث کو استنباط مسائل یا کسی دوسرے مقصد سے متعدد مقامات پر بیان کرتے ہیں، مثلاً انما الاعمال بالنیات والی روایت کو تیرہ[۱۳] مقام پر ذکر گیا ہے، حالانکہ امام موصوف نے خود فرمایا ہے کہ میں مکرر روایات کو اس کتاب میں داخل نہ کروں گا[۱]، حافظ ابن حجر نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ بالارادہ اپنی کتاب میں ایک ہی سند و متن کو مکرر نہیں لاتے، اگر کہیں تکرار ہے تو محض اتفاقی ہے[۲]، پوری کتاب میں بائیس[۲۲] روایات مکرر ہیں، جو اتنی ضخیم کتاب کے لئے زیادہ نہیں کہی جاسکتیں۔

(۸) تاریخ پر بھی امام بخاری کی مجتہدانہ نظر ہے، حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق میں امام بخاری ہر کتاب کے شروع میں اس کے زمانۂ نزول اور مشروعیت کی ابتدا کی طرف بھی کبھی کبھی اشارہ کر دیتے ہیں، خصوصاً جب کہ اس میں کوئی اختلاف ہو، اور کبھی صراحت بھی کر دیتے ہیں۔

(۹) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام موصوف ہر کتاب کے اختتام پر کوئی نہ کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں، جس سے ختم کتاب کی طرف اشارہ ہوتا ہے، مثلاً بدء الوحی کے آخر میں فکان ذلك آخر شان ھرقل اور کتاب الحج کے ختم پر واجعل موتی ببلد رسولك حضرت الاستاذ کی رائے ہے کہ امام بخاری ہر کتاب کے ختم پر کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے ختم زندگی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب کو موت کے استحضار کے ساتھ پڑھنا چاہیئے۔

(۱۰) کتاب کی ابتدا اور انتہا میں گہرا ربط ہے، حافظ ابن حجر نے اپنے استاد کا قول

---

[۱] بخاری شریف جلد ۱ ص ۲۲۷ [۲] مقدمہ فتح ص ۱۲

نقل کیا ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کو کتاب التوحید پر ختم کیا، کیونکہ توحید ہی آخرت میں کامیابی اور ناکامی کی اصلی میزان ہے، اور اس کی ابتدا انّما الاعمال بالنّیات کی حدیث سے فرمائی، کیونکہ اعمال کی عند اللہ مقبولیت کے لئے اخلاص نیت ضروری ہے، اور آخرت میں صرف وہی اعمال وزنی ہوں گے جو اخلاص کے ساتھ رضائے الٰہی کے لئے کئے جائیں، یہ چند خصوصیات لامع کے مقدمہ سے باختصار نقل کی گئی ہیں۔

صحیح بخاری کے تراجم الابواب

شروع میں کہا جا چکا ہے کہ امام بخاریؔ کے پیش نظر جس طرح احادیث صحیحہ کی تخریج ہے، اسی طرح وہ ان سے بہت سے مسائل کا استنباط واستخراج بھی فرماتے ہیں، اسی لئے کبھی کبھی ایک روایت متعدد جگہوں پر نقل کرتے ہیں، جیسے حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جو حضرت بریرہؓ کے واقعہ سے متعلق ہے، اس کو بیس[۲] مرتبہ سے زائد نقل کیا ہے علمار کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ فقہ البخاری فی تراجمہ. بخاریؔ کا سارا کمال ان کے تراجم میں ہے، علامہؔ کرمانی فرماتے ہیں، امام صاحبؒ نے اپنے تراجم ابواب میں جس دقت نظر کا مظاہرہ فرمایا ہے، اس کو سمجھنے سے بڑے بڑے اہل علم قاصر رہے، اس کی اسی اہمیت کی بنا پر متقدمین اور متاخرین نے تراجم ابواب پر مستقل رسالے لکھے ہیں، حضرت الاستاذ نے لامعؔ الدراری میں چھ کتابوں کا تذکرہ فرمایا ہے، مگر آج ہمارے سامنے صرف دو رسالے موجود ہیں، (۱) حضرت شاہ ولیؔ اللہؒ صاحب کا رسالہ شرح تراجم البخاری (۲) دوسرا حضرت شیخ الہند کا الابواب والتراجم جو اردو میں ہے، پہلے رسالے میں چودہ اور دوسرے میں پندرہ اصول بیان کئے گئے ہیں، شراح بخاری میں حافظ ابن حجر اور عینیؔ نے بھی تراجم ابواب کی طرف توجہ فرمائی ہے، اول الذکر نے بعض اصولوں کی

نشان دہی بھی کی ہے، فرماتے ہیں کہ امام موصوف نے بہت سے فقہی فوائد اور حکیمانہ نکتے اپنی کتاب میں بکھیرے ہیں، اور غور و فکر کرنے والوں کو اس میں بہت سی نادر چیزیں ملتی ہیں، من جد وجد[1]، حضرت الاستاذ نے ان حضرات کے بیان کردہ اصول کی تفصیل فرمائی ہے، اور اس پر اضافے بھی کئے ہیں، اس طرح ان اصولوں کی تعداد ستر (۷۰) تک پہنچ جاتی ہے، اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو ہر جگہ حدیث و ترجمہ میں مناسبت نظر آئے گی[2]

امام دارقطنی وغیرہ کے شبہات

صحیح بخاری کی جن روایات پر دارقطنی وغیرہ نے نقد کیا ہے، ان کی تعداد مجموعی طور پر ایک سو دس (۱۱۰) ہے، حافظ ابن حجر اور علامہ عینی وغیرہ نے اس کا مفصل جواب دیا ہے حافظ ابن حجر جواب دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ الحمد للہ اکثر اعتراضات کا جواب کافی وشافی ہوگیا ہے، بعض جوابات محتمل ہیں، البتہ چند جگہوں پر تکلف سے کام لینا پڑا ہے، جب کوئی منصف مزاج ان جوابات پر غور کرے گا تو مصنف کی جلالت شان اور کتاب کی عظمت اسکی نظر میں دوبالا ہو جائیگی، اور اس پر واضح ہو جائیگا کہ علماء میں جو اس کو حسن قبول حاصل ہوا اور تمام کتب حدیث پر جو انہوں نے اس کو ترجیح دی وہ سراسر مبنی بر حقیقت ہے، ناقدین کے اصول نقد چند کمزور اصولوں پر مبنی ہیں، جو جمہور ائمہ کے خلاف ہیں، اس لئے معارضہ کے وقت شیخین کی تصحیح کو فوقیت حاصل ہوگی[3]، اسی طرح بخاری کے تقریباً اسی (۸۰) اور مسلم کے ایک سو ساٹھ (۱۶۰) رواۃ پر کسی نوع کا نقد کیا گیا ہے[4]، حافظ ابن حجر نے اس کا اجمالی جواب یہ دیا ہے کہ: ینبغی لکل منصف ان یعلم تخریج صاحب الصحیح لای راو کان مقتض بعدالتہ

---

[1] مقدمہ فتح ص۲ [2] لامع ص۹۰ [3] مقدمہ فتح ص۴۰۰ ولامع ص۴۲ [4] لامع ص۸۴

عندہ وصحۃ حفظہ وعدم غفلتہ، یعنی ہر منصف مزاج کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ امام بخاری اپنی کتاب میں جس راوی سے تخریج کریں ان کے نزدیک اس راوی کے عادل اور صحیح الحفظ ہونے کی دلیل ہے اس لئے جمہور ائمہ نے ان دونوں کتابوں کو صحیحین کے نام سے یاد کیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ متابعات وشواہد میں بھی عدالت و حفظ کا وصف امام بخاری کے نزدیک ضروری ہے[1]۔

تاہم اتنی ضخیم کتاب میں معمولی فروگزاشتوں اور تسامح کا ہونا نہ بعید ہے اور نہ اس کی عظمت کے منافی ہے، چند مقامات پر امام موصوف سے تسامح ہوگیا ہے جس سے واقفیت ایک طالب بخاری کے لئے ضروری ہے تفصیل کے لئے لامع الدراری کا مقدمہ ملاحظہ ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

صحیحین پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ وغیرہ ائمہ نے بہت سی ایسی روایات سے استدلال کیا ہے، جو صحیحین میں موجود نہیں ہیں، پھر صحیحین کے اصح ہونے کا کیا مطلب ہے؟ تحبیر کے شارح ابن امیر الحاج نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ صحیحین کی اصحیت مابعد کے لوگوں کے لحاظ سے ہے، وہ ائمہ مجتہدین جو ان کے پیشتر گزرے ہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہیں[2]، علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ شیخین اور اصحاب سنن وغیرہ فقہ اسلامی کی تدوین کے بعد پیدا ہوئے اور حدیث کی طرف اعتنا کیا، لیکن ائمہ مجتہدین جو ان سے پیشتر گزرے ہیں، ان کے سامنے مرفوع وموقوف اور صحابہ وتابعین کے فتاوے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا، اور مجتہد کی نظر حدیث کی

---

[1] مقدمہ فتح ص۳۸۳ وارشاد الساری ص۲۱ [2] التقریر والتحبیر جلد ۳ ص۳۰

صرف ایک قسم پر محدود نہیں ہوتی، آج ہمارے سامنے اس دور کی جوامع و مصنفات موجود ہیں، جن کے مصنفین ائمۂ مجتہدین کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں، اسلئے علوئے طبقہ کی وجہ سے ائمۂ مجتہدین کے لئے احادیث کی اسانید پر غور وخوص کرنا آسان تھا، پھر مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال اس کی صحت کی دلیل ہے، کتب ستہ کی ضرورت اور ان سے استدلال مابعد کے لوگوں کے لحاظ سے ہے[۱]۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ سے روایت نہ کرنے کی وجہ

کہا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ چونکہ حنفیہ سے ناراض تھے، اس لئے انہوں نے امام ابو حنیفہؒ سے کوئی روایت نقل نہیں کی، علامہ زیلعی فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے شدت تعصب اور امام ابو حنیفہؒ کے مسلک پر بیجا تنقید کی وجہ سے ان کی کوئی روایت اپنی کتاب میں نقل نہیں کی[۲]، اسی طرح بعض الناس کے ذریعہ امام صاحبؒ پر تعریض کی ہے، اور ان پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے، مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے امام اعظمؒ کے ساتھ وہی روش اختیار کی جو امام جعفر صادق کے ساتھ کی تھی، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق کو امام بخاری نے قابل استدلال نہیں سمجھا، حالانکہ وہ جمہور امت کے نزدیک ثقہ ہیں[۳]۔

لیکن امام بخاری اور دیگر ائمۂ محدثین کے متعلق عناد و تعصب کا شبہہ کرنا نہایت نامناسب ہے، اکابر کی شان اس سے بلند تھی، علامہ کوثری نے اس بارے میں نہایت مناسب و معتدل رائے ظاہر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ قابل غور امر یہ ہے کہ شیخین نے

---

[۱] لامع ص ۸۴ [۲] نصب الرایہ جلد ا ص ۳۵۵ [۳] ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۲۸

امام ابوحنیفہؒ سے کوئی روایت نہیں نقل کی، حالانکہ ان کے صغیر السن تلامذہ سے ان کا لقاء و روایت دونوں ثابت ہیں اسی طرح امام شافعیؒ کے بعض تلامذہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی، لیکن امام شافعیؒ کی کوئی روایت اپنی کتاب میں درج نہیں کی، امام بخاریؒ کو امام احمد سے زیادہ ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اس کے باوجود ان سے صرف دو روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں، ایک تعلیقاً اور دوسری ایک واسطے سے، امام مسلم، امام بخاریؒ کے شاگرد ہیں، اور انہوں نے اپنی کتاب میں ان سے پورا استفادہ کیا ہے، لیکن امام بخاریؒ سے صحیح مسلم میں کسی روایت کی تخریج نہیں کی، امام احمدؒ، امام شافعیؒ کے تلمیذ رشید ہیں، اور ان سے مؤطا امام مالکؒ کا سماع بھی کیا ہے، لیکن امام مالکؒ کی کل پانچ روایات امام شافعیؒ کے واسطے سے اپنی کتاب میں درج کی ہیں، ان واقعات اور ان محدثین کرام کے اخلاص و دیانت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ مجتہدین کی احادیث کو روایت کرنے والے شرق و غرب ہر چہار سو پھیلے ہوئے تھے، ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا، اس لئے ان محدثین کرام نے صرف ان راویوں کی روایات کی طرف توجہ مبذول فرمائی، جس کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لئے ان محدثین کا دامن ہر تعصب و عناد سے پاک تھا۔[1]

جامع صحیح کے شروح وحواشی

جامع صحیح کی اہمیت و مقبولیت کی بنا پر ہر دور کے علماء نے اس پر شروح وحواشی لکھے ہیں، لامع میں ایک سو سے زائد شروح وحواشی اور متعلقات بخاری کا تذکرہ ہے ان میں سب سے زیادہ فتح الباری کو شہرت حاصل ہوئی۔

---

[1] حاشیہ شروط الائمہ صفحہ ۵

(۱) فتح الباری - یہ شیخ الاسلام حافظ ابوالفضل احمد بن علی بن حجر م ۸۵۲ھ کی تصنیف ہے، مصنف نے ۸۱۷ھ سے اس کا آغاز کیا، سب سے پہلے ایک مقدمہ لکھا، جب وہ مکمل ہوگیا تو شرح کی تالیف شروع کی، اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب شرح کا معتد بہ حصہ ہوجاتا تو اس کو ائمۂ مجتہدین کی ایک جماعت نقل کرتی، پھر ہفتہ میں ایک دن اس پر مباحثہ و مقابلہ کیا جاتا، علامہ برہان بن خضر پڑھتے اور لوگ اپنے اعتراضات اور بحث پیش کرتے تھے، حافظ صاحب جواب دیتے، اس طرح یہ کام ۸۴۲ھ میں ختم ہوا مگر اس کے بعد مصنف نے اس پر کچھ اضافے بھی کئے، اور اس کی تکمیل وفات سے کچھ مدت پہلے ہوئی۔

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بخاری کی شرح کا دین امت پر باقی ہے، حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ غالباً فتح الباری سے یہ دین ادا ہوگیا۔

اس میں مصنف نے جامع صحیح کے ان نکات پر جو فن رجال یا تراجم ابواب کی تدقیقات فقہیہ سے متعلق ہیں محققانہ بحث کی ہے اور حدیث کے مختلف طرق کو جمع کیا ہے، جس سے حدیث کے کسی ایک احتمال یا اعراب کی تعیین ہوجاتی ہے[1]۔

(۲) عمدۃ القاری، علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ھ کی تصنیف ہے، مصنف نے ۸۲۱ھ سے اس کی ابتدا کی اور ۸۴۷ھ میں یہ شرح مکمل ہوئی، اتنی مدت اس لئے صرف ہوئی کہ درمیان میں مختلف موانع کی بنا پر متعدد بار اس کام کو بند کرنا پڑا، ورنہ زیادہ سے زیادہ دس سال کی مدت صرف ہوتی، علامہ عینی نے فتح الباری سے بہت استفادہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بعض ورق

---

[1] ارشاد الساری ص ۳۶

پورے کے پورے نقل کر دیئے ہیں، علامہ عینی نے اپنی شرح میں حافظ ابن حجر پر تعقبات بھی کئے ہیں، اور جن باتوں کو انہوں نے بالقصد ترک کر دیا تھا، ان کی تفصیل کر دی ہے، مثلاً (۱) حدیث کے پورے متن کو نقل کر دیا ہے (۲) رواۃ کے انساب کی وضاحت کی ہے (۳) ہر راوی کا ترجمہ دیا ہے (۴) لغات واعراب، معانی وبیان کی وضاحت کی ہے، اور حدیث سے مسائل کا استنباط کیا ہے، اشکالات وجوابات فتح الباری سے زیادہ ہیں۔[1]

علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ عمدۃ القاری، فتح الباری سے ایک ثلث مقدار میں زیادہ ہے، اس میں مختلف مباحث کی ایسی وضاحت کی گئی ہے کہ قاری کو کسی دوسری شرح کی ضرورت نہیں رہتی، اگر فتح الباری کا مقدمہ نہ ہوتا تو عمدۃ القاری کو اس پر نمایاں فوقیت حاصل ہوتی، عینی نے حافظ ابن حجر کے بہت سے اوہام پر تنبیہ کی ہے، اور جب یہ کتاب ان کے سامنے آئی تو حافظ ابن حجر نے ان مقامات کی اصلاح کر لی، اور علامہ عینی کی تردید میں ایک رسالہ انتقاض الاعتراض لکھنا چاہا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی، اس لئے یہ رسالہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، علامہ عینی، حافظ ابن حجر کے شیوخ کے صف کے آدمی ہیں، وہ عمر میں حافظ ابن حجر سے بارہ سال بڑے تھے، البتہ ان کا انتقال تین سال بعد ہوا۔

(۳) ارشاد الساری، شہاب احمد بن محمد الخطیب القسطلانی المصری صاحب المواہب اللدنیہ المتوفی ۹۲۳ھ، اس میں شرح ومتن مخلوط ہے، لیکن متن کو سیاہی وسرخی سے ممتاز کر دیا ہے۔

---

[1] حوالہ مذکور ایضاً ص ۳۶

حقیقت میں یہ فتح الباری، عمدۃ القاری کی تلخیص ہے، اگرچہ مصنف نے دوسری شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

(۴) الکواکب الدراری :۔ علامہ شمس الدین محمد بن یوسف بن علی کرمانی م ۷۸۶ھ حافظ ابن حجر اور عینی نے اپنی شرحوں میں اس سے بہت کچھ لیا ہے، مصنف نے اس میں نحوی اعراب اور غریب الفاظ کو پوری طرح حل کیا ہے، یہ شرح مصر میں چھپ گئی ہے۔

(۵) شرح النووی :۔ علامہ نووی المتوفی ۶۷۶ھ نے صرف کتاب الایمان تک شرح لکھی تھی، اس کی تکمیل نہیں کر سکے، صحیح مسلم کے مقدمہ میں اس کا ذکر ہے۔

(۶) ہدایۃ الباری :۔ شیخ الاسلام زکریا الانصاری، تلمیذ حافظ ابن حجر المتوفی ۹۲۸ھ مصر سے چھپ چکی ہے۔

(۷) تیسیر القاری :۔ علامہ نور الحق بن مولانا عبد الحق الدہلوی، المتوفی ۱۰۷۳ھ جس زمانے میں شیخ عبد الحق نے مشکوٰۃ شریف کی شرح لکھی تھی، اسی زمانہ میں ان کے صاحبزادے علامہ نور الحق نے صحیح بخاری کی شرح فارسی میں لکھنی شروع کی۔

(۸) التوشیح علی الجامع الصحیح :۔ حافظ جلال الدین سیوطی، المتوفی ۹۱۱ھ کی لطیف شرح ہے، اس کی تلخیص علامہ دمنتی نے کی ہے، اور اس کا نام روح التوشیح رکھا ہے، طبع ہو چکی ہے۔

(۹) شواہد التوضیح والتصحیح لمشکلات الجامع الصحیح :۔ شیخ جمال الدین الشافعی المتوفی ۶۷۲ھ کا رسالہ ہے، جو ہندوستان میں طبع ہو چکا ہے۔

(۱۰) علامہ ابو الحسن نور الدین محمد بن عبد الہادی السندی الحنفی کا حاشیہ جو مشہور

ومعروف ہے، یہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

(۱۱) شرح شیخ الاسلام بن محب اللہ البخاری الدہلوی، یہ فارسی شرح تیسیر القاری کے حاشیہ پر چھپی ہے، مگر صرف چودہ ۱۴ پارے ہی طبع ہوئے ہیں۔

(۱۲) عون الباری:- نواب صدیق حسن خان صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ نے تجرید بخاری کی مختصر شرح لکھی ہے۔

(۱۳) نبراس الساری فی اطراف البخاری:- مولانا ابوسعید محمد بن عبدالعزیز الحنفی کی تصنیف ہے۔

(۱۴) فیض الباری:- علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے افادات ہیں جو ان کے تلمیذ رشید مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (۵ رجب ۱۳۸۵ھ) نے درس کے وقت لکھتے تھے۔

(۱۵) مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری المتوفی ۱۲۹۸ھ کا حاشیہ جس کے آخری حصے کی تکمیل حضرت نانوتوی نے کی، نہایت مفید ہے۔

(۱۶) لامع الدراری: حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی المتوفی ۱۳۲۳ھ کے درس کے افادات ہیں، جن کو ان کے مختلف تلامذہ نے جمع کیا تھا، سب سے آخری دورہ جس میں ملک کے بڑے بڑے علماء و فضلاء شریک تھے، اور اس کے بعد سلسلۂ درس ختم ہو گیا تھا، اس دورہ میں حضرت کے مایۂ ناز شاگرد مولانا یحییٰ صاحب شریک تھے، بلکہ ان ہی کی خاطر حضرت نے اس دورہ کا افتتاح فرمایا تھا، اس آخری درس کے افادات کو حضرت کے تلامذہ نے قلم بند کیا تھا، اس پر حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے تعلیق اور ایک مبسوط مقدمہ لکھا، اس کا مطالعہ حدیث کے طلباء و اساتذہ کے لئے بہت مفید ہے، اس کی دو جلدیں طبع ہو چکی ہیں اور جلد ثالث زیر طبع ہے، اس مضمون کا بیشتر حصہ اسی سے ماخوذ ہے۔

امام مُسلمؒ

نام و نسب

نام مسلم بن حجاج بن داؤد بن کوشاد لقب عساکر الدین اور کنیت ابوالحسن ہے مولد و مسکن کے لحاظ سے اگرچہ ان کے خمیر میں عجم کی خاک کا عنصر بھی شامل ہے، لیکن دراصل ان کا سلسلۂ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے، اسی بنا پر انہیں قشیری کہا جاتا ہے، علامہ ذہبی کی تحقیق میں امام مسلم ۲۰۴ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے[1]، ان کے سن پیدائش میں قدرے اختلاف ہے ۲۰۲ھ، ۲۰۴ھ، ۲۰۶ھ مختلف اقوال ہیں، اور اسی آخری قول کو ابن الاثیر نے جامع الاصول کے مقدمہ میں راجح قرار دیا ہے[2]، اور ابن خلکان کی بھی یہی تحقیق ہے۔

سماع حدیث کے لئے سفر

امام مسلمؒ نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو ہر جانب علم حدیث کا غلغلہ تھا، خوش قسمتی سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۶۵ [2] فتح الملہم ص ۱۰۰ وبستان المحدثین ص ۱۱۶

امام موصوف نیشاپور جیسے شہر میں پیدا ہوئے جسے اس زمانہ میں مرکزیت حاصل تھی، علامہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں قد کانت نیسابور من اجل البلاد واعظمہا لم یکن بعد بغداد مثلہا[1]۔ (نیشاپور اس قدر بڑے اور عظیم الشان شہروں میں سے تھا کہ بغداد کے بعد اس کی نظیر نہ تھی) علامہ ذہبیؒ نے امام موصوف کے سماع حدیث کی ابتدا ۲۱۸ھ کو قرار دیا ہے، اس لئے اس حساب سے گویا چودہ برس کی عمر سے سماعت کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے، اس سے پہلے بھی سماعت کے مواقع حاصل تھے، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف نے اس کو اس وقت کیلئے محفوظ رکھا جو ہر قسم کی اہلیت کا زمانہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس فن کے نشیب و فراز اور اس کے نکات کو پیش نظر رکھ کر اس میدان میں قدم رکھا۔

شیوخ وتلامذہ

امام موصوف کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہو سکے، لیکن خراسان و نیشاپور میں اسحٰق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے امام فن موجود تھے، امام موصوف نے ان کے علاوہ مختلف مقامات کی خاک چھانی عراق، حجاز، شام و مصر ان مقامات پر بکثرت تشریف لے گئے، بغداد متعدد بار جانا ہوا[2]، اور بغداد میں آپ نے درس بھی دیا ہے، بغداد کا آخری سفر ۲۵۹ھ میں ہوا، جس کے دو سال بعد آپ انتقال فرما گئے[3]، وہاں کے محدثین میں سے محمد بن مہران اور ابو غسان وغیرہ سے سماعت کی، عراق میں امام احمد بن حنبلؒ اور عبداللہ بن مسلمہ قعنبیؒ سے استفادہ کیا، حجاز میں سعید بن منصور اور ابو مصعب سے روایتیں حاصل کیں، مصر میں عمرو بن سواد حرملہ بن یحییٰ کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی[4]، احمد بن مسلمہ کی

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۱ ص۱۷۳ [2] تاریخ ابن خلکان جلد ۲ ص۱۳۵ [3] ایضاً ص۱۳۳ [4] مقدمہ نووی ص۱۲

رفاقت میں بصرہ و بلخ کا بھی سفر کیا، قال الذھبی رفیق مسلم فی الرحلۃ الیٰ بلخ والیٰ بصرۃ[۱] - امام بخاری سے نیشاپور میں بہت کچھ استفادہ کیا[۲]، ان بزرگوں کے علاوہ احمد بن یونس یربوعی و اسماعیل بن ابی اویس، عون بن سلام وغیرہ سے بہت کچھ حاصل کیا، امام بخاریؒ کے بہت سے شیوخ میں شریک ہیں، تلامذہ میں ابو عیسیٰ ترمذی صاحب السنن، ابوحاتم رازی، ابوبکر بن خزیمہ اور ابوعوانہ جیسے ائمۂ فن داخل ہیں۔

امامؒ موصوف کے فضل کا اعتراف

امام موصوفؒ کے زمانہ میں سیکڑوں ائمۂ فن پیدا ہوچکے تھے، جس میں بہت سے شیوخ کو امام موصوف کی استاذی کا شرف حاصل ہے، تاہم امام صاحب کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ کی وجہ سے اس قدر برگزیدہ بنالیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن نے پیشین گوئی فرمائی :- ای رجل یکون ھذا (خدا جانے کس بلا کا یہ شخص ہوگا) اسحٰق کوسج نے امام صاحب کو مخاطب کرکے فرمایا :- لن یعدم الخیر ما ابقاك الله للمسلمین - (جب تک اللہ تعالےٰ آپ کو مسلمانوں کیلئے باقی رکھے گا بھلائی آپ کے ہاتھ سے نہ جائے گی) امام ابوزرعہ و ابوحاتم جیسے بزرگ امام صاحب کو اپنے زمانہ کے تمام شیوخ پر ترجیح دیتے تھے، ابوقریش نے تمام دنیا کے حفاظ اربعہ میں شمار کیا ہے، ابوسلمہ جو امام صاحب کے رفیق درس تھے، وہ آپ کے اس قدر گرویدہ تھے کہ پندرہ سال مسلسل آپ کے ساتھ صحیح مسلم کی ترتیب میں شریک رہے[۳]۔

اخلاق و عادات زہد و تقوےٰ

پوری زندگی میں نہ کسی کی غیبت کی اور

---

[۱] تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۰ [۲] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ صفحہ ۳۵

[۳] ایضاً صفحہ ۱۶۶

نہ ضرب وشتم کیا[۱] امام صاحب اپنے اساتذہ وشیوخ کا بیحد احترام فرماتے تھے، نیشاپور کے سفر میں امام بخاریؒ کی خدمت میں بکثرت حاضر ہوتے تھے، ایک مرتبہ انکی تبحرِ علمی اور زہد وتقویٰ سے متاثر ہوکر بے ساختہ ان کی پیشانی کا بوسہ لیا اور بے خودی میں پکار اٹھے:

اقبل رجلیك یا استاذ الاساتذین وسید المحدثین وطبیب الحدیث فی علله۔

امام صاحبؒ نہایت پاکیزہ خو اور انصاف پسند تھے، امام بخاریؒ کے نیشاپور کے زمانۂ قیام میں جب وہاں کی مجالس درس بے رونق ہوگئیں، اور امام بخاریؒ پر خلق کا ہجوم ہونے لگا تو حاسدین نے حسد کیا، عوام تو عوام امام ذہلیؔ تک نے امام بخاریؒ کی مخالفت مسئلۂ خلقِ قرآن میں کی، اور اپنی مجلسِ درس میں اعلان کردیا: الامن کان یقول بقول البخاری فی مسٔلة اللفظ بالقرآن فلیعتزل مجلسنا؛ اس اعلان کو سن کر امام مسلم فوراً مجلس سے اٹھے اور ان سے مسموعہ روایات کے تمام مسوّدے ان کو واپس کردیئے اور امام ذہلیؔ سے بالکلیہ روایت کرنا ترک کردیا[۲]۔

اسی طرح اپنی کتاب کو لکھ کر ابوزرعہ کے سامنے پیش کیا، جن روایات کو وہ صحیح بتاتے ان کو باقی رکھتے اور جن پر وہ نکتہ چینی کرتے اس کو ترک فرمادیتے[۳]، اس سے امام صاحبؒ کے اخلاص وبے نفسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

امام صاحبؒ کا مسلک

امام مسلم کے مسلک کی تعیین میں بڑی دشواری ہے مولانا انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ امام مسلم وابن ماجہ کا مذہب معلوم نہیں ہے، چونکہ صحیح مسلم کے ابواب مؤلف نے بذاتِ خود قائم نہیں کئے ہیں اس لئے ان کے مذہب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا[۴]، عرف

۱؎ بستان ص۱۱۷ ۲؎ البدایۃ والنہایہ جلد۱۱ ص۳۴ ۳؎ مقدمہ نووی ص۱۱ وتدریب ص۴۷ ۴؎ فیض الباری جلد۱ ص۱۸۳

الشذی میں بھی ناقل نے یہی لکھا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: فلا اعلم مذھبہ بالتحقیق، مولانا نواب صدیق حسن خان صاحب نے انہیں شافعیؒ شمار کیا ہے[1]۔

شیخ عبداللطیف سندی فرماتے ہیں: امام ترمذی و مسلم کے متعلق عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں امام شافعیؒ کے مقلد ہیں، حالانکہ یہ دونوں مجتہد تھے، البتہ بہت سے مسائل میں ان سے استفادہ کیا ہے، ان کے اجتہاد کی طرف حافظ ابنؒ حجر نے بھی اشارہ فرمایا ہے، فرماتے ہیں: ثقۃ امام کذا فی التقریب، مولانا عبدالرشید صاحب کی تحقیق ہے کہ امام مسلم مالکی المذہب[2] تھے، مگر طبقاتِ المالکیہ میں اس کا تذکرہ نہیں ہے، صاحبِ کشف الظنون فرماتے ہیں: جامع الصحیح للامام المسلم الشافعی، صاحب الیانع الجنی نے امام مسلم کے سلسلہ میں یہ لکھا ہے کہ اصولی طور پر شافعیؒ تھے، انہوں نے امام شافعی سے بہت کم اختلاف کیا ہے[3]۔

شیخ طاہر جزاری کی رائے بھی امام مسلم کے متعلق یہی ہے کہ وہ کسی امام کے مقلد محض نہیں تھے، البتہ امام شافعیؒ وغیرہ اہل حجاز کے مسلک کی طرف مائل تھے[4]۔

وفات کا حال

امام صاحب کی پوری زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز ہے، خصوصاً اس سے امام صاحب کی علمی شیفتگی و انہماک کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہا گیا ہے کہ مجلس درس میں ایک حدیث کے متعلق دریافت کیا گیا جو امام صاحبؒ کو سوءِ اتفاق سے یاد نہ آئی اور پھر گھر واپس آئے تو انہیں ایک خرمے کی تھیلی پیش کی گئی، حدیث کی تلاش و جستجو میں اس قدر محو ہوئے کہ چھوہارے آہستہ آہستہ سب کھا گئے اور حدیث بھی مل گئی یہی امام صاحب

---

[1] حطہ ص ۹۸ [2] مختصر التمس الیٰ الحاجۃ ص ۲۶ [3] لامع ص ۱۹ [4] توجیہ النظر ص ۱۸۵

کی موت کا سبب ہوا۔

شیخ ابن صلاح فرماتے ہیں: کانت وفاته بسبب غريب نشأ فی غمرة فكرة علیہ اس وقت عمر شریف ۵۵ سال تھی۔

لیکن علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ تقریباً ساٹھ سال تھی کیونکہ مشہور قول کے مطابق آپ کا سنِ ولادت ۲۰۴ھ تھا[1]

بہرحال امام صاحب نے ۲۵ رجب ۲۶۱ھ یک شنبہ کے دن وفات پائی، دوشنبہ کے روز جنازہ اٹھایا گیا، اور نیشاپور کے باہر نصیر آباد میں دفن کئے گئے[2]، علامہ ذہبی فرماتے ہیں، قبرہ یُزار ان کی قبر مبارک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے[3]۔

تصنیفات | صحیح مسلم کے علاوہ بھی امام صاحب نے بکثرت تصنیفات کی ہیں، جن کی اجمالی فہرست پیش ہے:-

مسندِ کبیر، الاسماء والکنی، جامع کبیر، کتاب العلل، کتاب التمیز، کتاب الوحدان، کتاب الاقران، کتاب سوالات لِاحمد، کتاب حدیث عمرو بن شعیب، کتاب الانتفاع باہب السباع، کتاب مشائخ مالک، کتاب الثوری، شعبہ، کتاب من لیس لہ الاراو واحد، کتاب المخضرمین، کتاب اولاد الصحابہؓ، کتاب اوہام المحدثین، کتاب الطبقات، کتاب افراد الشامیین، وکتاب رواۃ الاعتبار[4]۔

الجامع الصحیح للامام مسلم رحمہ اللہ

مذکورۂ بالا فہرست سے معلوم ہوچکا ہے کہ امام موصوف نے بکثرت کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت "الجامع الصحیح" کو حاصل ہوئی

---

[1] مقدمہ فتح الملہم ص۱۰۱ [2] ابن خلکان جلد۲ ص۱۳۶ [3] تذکرہ [4] مقدمہ فتح الملہم ص۱۰۰ وتدریب ص۵۱۵

ہے، اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ ہمیشہ صحیح بخاری کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

وجہِ تسمیہ اس پر الجامع کا اطلاق شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے نہیں کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جامع وہ ہے جس میں حدیث کے ابواب ثمانیہ موجود ہوں[1] جیسے الجامع الصحیح للامام بخاری، یا الجامع الصحیح للامام الترمذی، لیکن صحیح مسلم میں فنِ تفسیر و قرأۃ سے متعلق احادیث بہت کم ہیں، اسلئے اس کو الجامع الصحیح نہیں کہا گیا ہے[2]، اگرچہ فن تفسیر کی احادیث بہت کم ہیں، لیکن آخر کتاب میں کچھ موجود ہیں، اس لئے اکثر محدثین نے اسکو الجامع کہا ہے۔

صاحب کشف الظنون و صاحب قاموس نے بھی اس پر الجامع کا اطلاق کیا ہے، اس لئے متاخرین نے اس کو الجامع الصحیح کہا ہے، البتہ فقط متقدمین الصحیح کہتے تھے[2]۔

تفسیر کے حصے کے مختصر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس باب کی روایتیں امام صاحبؒ کی شرط پر بہت قلیل تھیں، اور خود امام بخاریؒ کی کتاب التفسیر تکرار وغیرہ کی وجہ سے بہت طویل ہوگئی ہے، ورنہ احادیث صحیحہ مسندہ کی تعداد قلیل ہی ہے[3]۔

غرض تصنیف احادیث کے ذخیرہ میں سے سب سے پہلے امام بخاری نے احادیث صحیحہ مرفوعہ کو الگ منتخب فرمایا، اور اپنی الجامع الصحیح کو تیار کیا، اس کو دیکھ کر امام مسلم کو بھی اسی عنوان سے ایک دوسرے انداز میں احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کا شوق ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ امام مسلم، امام بخاری کے شاگرد ہیں، اور ان سے بہت

---

[1] عجالہ نافعہ ص۶ [2] لامع الداری ص۲۴ [3] افادات حضرت الاستاذ مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث دفتح ص۱۶۵

کچھ استفادہ کیا ہے، اور اکثر شیوخ میں دونوں شریک ہیں[1]۔

لیکن امام بخاری کے پیش نظر احادیث صحیحہ مرفوعہ کی تخریج اور فقہ و سیرت و تفسیر وغیرہ کا استنباط ہے، اس لئے انہوں نے موقوف و معلق، صحابہؓ و تابعین کے فتاوے دیگرہ بھی نقل کئے ہیں، اس مقصد کے پیش نظر احادیث کے متون و طرق کے ٹکڑوں کو اپنی کتاب میں بکھیر دیا ہے، اور امام مسلم کا مقصد اعظم فقط احادیث صحیحہ کو منتخب کرنا ہے، وہ استنباط وغیرہ سے تعرض نہیں کرتے، بلکہ ہر حدیث کے مختلف طرق کو حسن ترتیب سے یک جا ہی بیان کرتے ہیں جس سے متون کے اختلاف اور مختلف اسانید سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، اس لئے احادیث منقطع وغیرہ کی تعداد شاذ و نادر ہے[2]۔

تعداد روایات

امام صاحبؒ فرماتے ہیں: صنفت ھذا المسند الصحیح فی ثلث مأۃ الف حدیث مسموعۃ[3] یعنی تین لاکھ احادیث سے ایک مسند صحیح کا انتخاب کیا ہے، علامہ طاہر جزائری کے نزدیک مکررات کے حذف کے بعد صحیح مسلم کی تعداد روایات چار ہزار ہے، شیخ ابن صلاح کی تحقیق میں مکررات کے علاوہ بنیادی حدیثیں چار ہزار ہیں[4]،

علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اگر مکررات کا لحاظ کیا جائے تو صحیح مسلم کثرت طرق میں بخاری سے زائد ہے، چنانچہ احمد بن سلمہ جو امام موصوف کے ساتھ ترتیب میں شریک تھے فرماتے ہیں کہ بارہ ہزار، اور ابو حفص میانجی فرماتے ہیں، آٹھ ہزار، لیکن دوسرے قول میں حافظ ابن حجر نے نظر قائم کیا ہے، مگر فی الواقع دونوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ ممکن ہے شمار دونوں کے نزدیک

---

[1] مقدمہ فتح الملہم ص۹۲ [2] حاشیہ شروط الائمہ ص۵۵ [3] مقدمہ نووی ص۱۳ وتذکرہ ص۲۱۵ [4] مقدمہ فتح الملہم ص۹

مختلف رہا ہو۔[1]

تراجم ابواب

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ امام صاحب نے اپنی کتاب کو ابواب کا لحاظ رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے گویا فی الواقع کتاب کی تبویب کردی گئی تھی، لیکن شاید حجم کتاب کی زیادتی یا اور کسی وجہ سے تراجم ابواب قائم نہیں فرمائے ان کے بعد بہت سے محدثین نے تراجم ابواب قائم کئے ہیں، جس میں بعض مناسب اور بعض غیر مناسب ہیں یا تو ترجمہ کی عبارت میں کمی یا الفاظ میں ناموزونیت ہوتی ہے، انشاء اللہ میں اس کو اچھے انداز میں ان جگہوں پر پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔[2]

لیکن مولانا شبیر احمد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مصنف کے شایانِ شان اب تک تراجم نہیں قائم کئے جاسکے شاید اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو توفیق دے کر یہ کام لے لے۔[3]

زمانۂ تصنیف

احمد بن سلمہ کا قول گزرچکا ہے پندرہ سال میں صحیح مسلم کی ترتیب میں شریک رہا، جس سے مدت تصنیف کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، سفیان بن ابراہیم جو امام صاحب کے خاص شاگرد ہیں، ان کے بیان کے مطابق ۲۵۷ھ میں اس کتاب کی قرأت سے فراغت پائی[4] اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کے انتقال سے بہت پہلے کتاب مکمل ہوچکی تھی۔

امام صاحبؒ کا اپنی تصنیف میں اہتمام

امام مسلم نے جمع حدیث میں نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی تحقیق پر اکتفا کیا، یعنی یہ نہیں کیا کہ جن حدیثوں کو صحیح سمجھا تھا، نقل کردیا بلکہ مزید احتیاط کے پیش نظر صرف وہی حدیثیں درج کی ہیں جن کی صحت پر مشائخ وقت کو اتفاق تھا،

---

[1] تدریب ص۳۰ [2] مقدمہ نووی ص۱۵ [3] مقدمہ فتح الملہم ص۱۰۰ [4] مقدمہ نووی۔

چنانچہ خود انکا بیان ہے کہ: لیس کل شئ عندی صحیح وضعتہ ھٰھنا انما وضعت ھٰھنا ما اجمعوا علیہ (صحیح مسلم باب التشہد) ہر وہ حدیث جو میرے نزدیک صحیح تھی ان کو میں نے یہاں درج نہیں کیا، میں نے تو یہاں صرف ان احادیث کو درج کیا ہے، جن کی صحت پر شیوخ وقت کا اجماع ہے۔

شیخ ابن صلاح وغیرہ نے اجماع سے اجماع عام سمجھا اس لئے انکو امام مسلم کے اس دعوے کی صحت کے متعلق سخت اشکال ہوا، لیکن امام مسلم کی مراد اجماع سے اجماع عام نہیں بلکہ اس دور کے بعض خاص مشہور شیوخ وقت کا اجماع ہے، چنانچہ علامہ بلقینیؒ نے اس سلسلہ میں، امام احمدؒ بن حنبل، یحییٰؒ بن معین، عثمانؒ بن ابی شیبہؒ اور سعید بن منصور خراسانی، ان چار ائمہ کے نام گنا کر لکھا کہ امام مسلم کی مراد اجماع سے ان چار حضرات کا اجماع ہے[1]، جب کتاب مکمل ہوگئی تو ابو زرعہ امام الجرح والتعدیل کے سامنے پیش کیا جس روایت میں کسی علت کی طرف اشارہ کیا اس کو کتاب سے خارج کر دیا، اس طرح پندرہ سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ مجموعہ تیار ہوا، جس کے بارے میں امام صاحب نے خود فرمایا ہے: لوان اھل الحدیث یکتبون مائتی سنۃ الحدیث فمدارھم علیٰ ھذا المسند یعنی صحیحہ[2] (محدثین اگر دو سو سال بھی حدیثیں لکھتے رہیں، جب بھی ان کا دارومدار اسی المسند الصحیح پر رہے گا)

صحیح مسلم کی خصوصیات

مجموعی طور پر صحیح بخاری کو صحت وغیرہ بہت سے امور میں پورے مجموعہ احادیث پر فوقیت حاصل ہے لیکن صحیح مسلم کو بھی بعض حیثیات سے صحیح بخاریؒ اور پورے ذخیرۂ احادیث پر امتیاز ہے،

---

[1] تدریب ص۲۸ [2] مقدمہ نووی

چونکہ ہر مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کی کتاب میں کوئی ایسی نئی وکارآمد بات ہو جو اسے دیگر کتابوں سے ممتاز کر دے، اس لئے چند خصوصیات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے' جو شرح نوویؒ وغیرہ میں درج ہیں۔

(۱) امام صاحب اگر دو یا اس سے زیادہ روایت کو بیان کرتے ہیں، جس میں معنی کے اتحاد کے ساتھ الفاظ میں اختلاف ہوتا ہے تو دونوں کو ایک اسناد میں جمع کر دیتے ہیں لیکن جس راوی کے کچھ الفاظ بیان کرتے ہیں ان کی تعیین کر دیتے ہیں۔

(۲) صحیح مسلم سے استفادہ بہت آسان ہے کیونکہ ہر ایک حدیث کو اس کی مناسب جگہ پر بیان کرتے ہیں، وہیں پر اس کے طرق اور اسکی متعدد اسانید اور مختلف الفاظ کو جمع کر دیتے ہیں، جس سے اس حدیث کے تعدد طرق اور الفاظ سے بسہولت واقفیت ہو جاتی ہے۔

(۳) حدثنا و أخبرنا کے درمیان بھی فرق قائم رکھا ہے، اصل یہ ہے کہ محدثین کرام کی تدریس کے دو طریقے رہے ہیں، ایک تو یہ کہ استاد پڑھے اور تلامذہ سنیں، دوسرے استاد شاگرد کے ہاتھ میں مجموعۂ حدیث دے دے اور شاگرد پڑھے استاد سنے، حدیث کی صحت و قطعیت میں ان دونوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن بحث یہ ہے کہ پہلی قسم کی حدیثوں کو حدثنا اور دوسری قسم پر اخبرنا کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں؟ امام بخاری وغیرہ کے نزدیک حدثنا کی جگہ پر اخبرنا یا اس کے برعکس کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن محدثین کی ایک جماعت جس میں امام شافعیؒ امام اوزاعیؒ اور امام نسائیؒ جیسے اکابرین داخل ہیں، ان میں تفریق کرتے ہیں، دوسری قسم کی روایتوں کیلئے صرف لفظ اخبرنا رکھا ہے، امام مسلم بھی انہیں لوگوں کے ہم خیال ہیں۔

(۴) روایتوں کے الفاظ کے اختلاف کو اچھی طرح ضبط کرتے ہیں جیسے فرماتے ہیں:
حدثنا فلان و فلان واللفظ لفلان ، قال أو قال احمد حدثنا فلان،
اسی طرح کبھی کسی حرف میں روایتوں کا اختلاف ہوتا ہے جس سے کبھی معنی میں تغیر واقع ہو جاتا ہے اور کبھی اس سے معنی میں تغیر نہیں ہوتا، البتہ یہ تغیر بسا اوقات ایسا پوشیدہ ہوتا ہے کہ جس سے واقفیت کسی ماہر فن ہی کو ہو سکتی ہے، لیکن امام صاحب نے پوری کتاب میں اس کو بیان کرنے کا التزام فرمایا ہے۔

(۵) رواۃ کے سلسلہ میں امام صاحب نے غایت احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے جیسے فرماتے ہیں: عبد الله بن سلمه حدثنا سليمان يعنى ابن هلال عن يحيى وهو ابن سعيد، چونکہ سلیمانؒ و یحیٰی کا نام امام صاحبؒ نے اپنے شیخ سے بقید نسب نہیں سنا تھا، اس لئے اس سلسلہ روایت میں اس کو اچھی طرح واضح کر دیا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ امام صاحب کا ذاتی اضافہ ہے اور یہ اضافہ اس مقصد کے تحت کیا ہے کہ ایک راوی کا دوسرے راوی کے ساتھ التباس نہ ہو سکے۔

(۶) امام صاحب نے مختلف طرق اور تحویل اسانید کو ایجاز کے ساتھ نہایت عمدہ عبارت میں پیش فرمایا ہے۔

(۷) صحیفہ ہمامؒ بن منبہؒ وغیرہ کی احادیث کے مجموعہ کو جو ایک ہی استاد سے مروی ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کے مجموعوں سے متعدد روایتیں نکی جائیں تو بوقت روایت ہر حدیث کیلئے تجدید اسناد کی ضرورت ہوگی یا متحد الاسناد ہونے کی وجہ سے بعد کی دوسری حدیثیں اسی پہلی اسناد پر محمول کر دی جائیں گی، وکیعؒ بن جراح، یحیٰی بن معین وغیرہ کے نزدیک تجدید اسناد کی ضرورت نہیں، لیکن استاذ اسحاقؒ اسفرائنی

جو اصول حدیث کے بڑے امام مانے جاتے ہیں، وہ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں، اور ہر حدیث کو بقید اسناد روایت کرنا ضروری سمجھتے ہیں، امام مسلمؒ کا بھی یہی مسلک ہے، چنانچہ صحیفہ ہمام بن منبہؒ سے روایت کرنے میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

(۸) صحیح مسلم کو جن حیثیتوں سے ایک بے نظیر تصنیف کا خطاب دیا گیا ہے ان میں ایک وصف اس کتاب کی طرز ادا اور حُسن ترتیب ہے، جس سے امام موصوف کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم حدیث کی باریکیوں اور اسرار سے کس قدر واقف تھے، اور اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جس کی نظر ان تمام علوم پر ہو، جس کی ایک محدث کو ضرورت پڑتی ہے۔

(۹) امام صاحبؒ نے اپنی کتاب کو اپنے شہر میں نہایت اطمینان وسکون کے ساتھ تصنیف کیا، اور اس وقت ان کے بہت سے مشائخ باحیات تھے، اس لئے الفاظ کے سیاق وسباق میں نہایت احتیاط و غور وفکر سے کام لیا ہے، اور احادیث مرفوعہ ہی پر اکتفا فرمایا ہے، انکی کتاب میں موقوفات وغیرہ شاذ ونادر ہیں، جو ضمناً پائی جاتی ہیں۔

(۱۰) حدیث کے پورے متن کو یکجا ہی بیان کرتے ہیں اور اس کے پورے الفاظ کو نقل کرتے ہیں اور روایت بالمعنیٰ کے بجائے روایت باللفظ بیان فرماتے ہیں، جو ان کے غایت احتیاط کی دلیل ہے اور اس کو صحابہؓ یا بعد کے لوگوں کے اقوال کے ساتھ ضم نہیں کرتے۔

صحاح ستہ میں صحیح مسلم کا مقام

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں "کتاب اللہ العزیز کے بعد صحیحین بخاری ومسلم کا مرتبہ ہے اور امت نے ان دونوں کتابوں کی تلقی بالقبول کی ہے، البتہ صحیح بخاری اور

دیگر فوائد و معارف کے لحاظ سے سب سے فائق و ممتاز ہے[1]۔"

علامہ جزری لکھتے ہیں: " و رجحان کتاب البخاری علیٰ کتاب مسلم أمر ثابت ادّی الیہ بحث جہابذۃ النقاد واختیارھم[2]۔"

یعنی صحیح بخاری کا امام مسلم کی کتاب پر من حیث الصحۃ راجح و مقدم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف بڑے بڑے ناقدین فن نے بحث و فکر کے بعد کیا ہے۔ پس اسی سے معلوم ہوا کہ صحیح بخاری کے بعد دوسرے درجہ پر صحیح مسلم کو رکھا گیا ہے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

" واقع است اجماع بر تلقی ایں ہر دو کتاب بالقبول والتسلیم زیرا کہ شیخین مقدم اند بر ائمہ عصر مابعد در معرفت علل و غوامض ایں[3]۔"

یعنی صحیح بخاری و مسلم کی صحت پر تلقی بالقبول اور تسلیم عام حاصل ہے کیونکہ امام بخاری و امام مسلم اپنے زمانے اور مابعد کے ائمہ پر احادیث کے علل اور اس کی باریکیوں کی معرفت و تمیز میں سب پر مقدم و فائق تھے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "حسن ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے اس کا مقام بہت بلند ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اسے صحیح بخاری پر بھی اچھالا ہے[4]۔"

غلط فہمی کا ازالہ

حاکم کے شیخ ابو علی نیشاپوری فرماتے ہیں ما تحت ادیم السمأ کتاب أصح من صحیح مسلم[5]۔" اسی طرح بعض مغاربہ

---

[1] مقدمہ نووی ص۱۳ [2] فتح الملہم ص۹۶ [3] اتحاف النبلاء ص۴۵ [4] فتح الملہم ص۹۹

[5] تذکرہ جلد ۲ ص۱۶۵

نے بھی صحیح مسلم کو بخاری پر ترجیح دی ہے، بظاہر ان لوگوں کی ترجیح کا منشایہ ہے کہ امام صاحب کے پیش نظر فقط احادیثِ صحیحہ کا انتخاب ہے، برخلاف امام بخاری کے کہ وہ موقوفات وآثار وغیرہ کو بھی اپنی کتاب میں جگہ دیتے ہیں، اگر یہی ہے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے، چونکہ اس سے صحیح مسلم کا نفسِ صحت میں راجح ہونا لازم نہیں آتا، اور اگر مطلقاً اصح کہنا چاہتے ہیں تو یہ قول ناقابلِ اعتبار ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابو علی وغیرہ کا قول مجمل ہے اس سے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امام بخاری کے سوا مسلم کی کتاب اصح ہے، اور اگر مطلقاً اصح کہنا چاہیں تو البتہ یہ قول ناقابلِ تسلیم ہے، مگر ان کے قول میں یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ بخاری سے اصح تو نہیں ہے البتہ اصحیت میں دونوں کتابوں کے درمیان مساوات ہے، اگر یہی مراد ہے تو یہ قول بھی جمہور امت کے متفقہ فیصلے کے خلاف ہے، حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں، کہ وہ اپنے اس قول میں منفرد ہیں، علامہ ابو سعید علائی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو علی صحیح بخاری سے ناواقف تھے، لیکن یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے بلکہ فی الواقع میرے نزدیک اصح کہنے سے مراد افضل ہے یعنی حسنِ ترتیب وغیرہ میں افضل قرار دیا ہے، بعض نے کہا کہ یہ دونوں کتابیں برابر ہیں، یہ تیسرا قول ہے[1]۔

چونکہ مسلم کی روایت ورواۃ میں بخاری کے مقابلہ میں زیادہ کلام ہے، اسلئے حاصل کلام یہ ہے کہ اعلیٰ مرتبہ صحت میں بخاری اور پھر صحیح مسلم، اس کے بعد ابو داؤد وترمذی ونسائی کو حاصل ہے[2]۔

عبدالرحمٰن شافعیؒ فرماتے ہیں :۔

---

[1] تدریب مختصراً صـ۴۲ [2] لامع صـ۲۱

تنازع قوم فی البخاری ومسلم — لدی وقالوا أی ذین تقدم
فقلت لقد فاق البخاری صحۃ — کما فاق فی حسن الصناعۃ مسلم[1]

تخریج روایت کے شرائط

صحاح ستہ کے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں تخریج کے شرائط نہیں بیان کئے البتہ ان کے مطالعہ کے بعد اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے[2]، جس زمانے میں امام صاحبؒ نے اپنی کتاب کو مرتب فرمایا، اس وقت موضوع وضعیف، صحیح وغلط ہر طرح کی حدیثیں موجود تھیں، اس بنا پر انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں احادیث کی تین قسمیں اور راویوں کے تین طبقے قرار دیئے ہیں، جن سے ان کے شرائط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) وہ احادیث جو بالکل صحیح ہوں اور ان کے رواۃ متقن، ضابط اور ثقہ تسلیم کئے گئے ہوں۔

(۲) وہ احادیث جن کے رواۃ باعتبار ثقاہت اور حفظ واتقان کے پہلے قسم کے راویوں سے کم ہوں۔

(۳) وہ احادیث جن کے رواۃ کو عموماً یا اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہو، امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قسم اول کے بعد قسم ثانی کو کتاب میں درج کرونگا لیکن قسم ثالث کی طرف التفات نہ ہوگا۔[3]

اس لئے اہل علم اس مسئلہ میں مختلف الرائے ہیں کہ اس تقسیم سے کیا مراد ہے، حافظ ابوعبداللہ حاکم اور امام بیہقی کا خیال ہے کہ امام صاحبؒ کی موت نے دوسرے طبقہ کی حدیثوں کی تخریج کا موقع نہیں دیا بلکہ صحیح مسلم میں صرف طبقہ اولیٰ کی روایات ہیں، لیکن

---

[1] بستان ص۱۱۸ [2] شروط الائمہ [3] مقدمہ مسلم ص۱۵

قاضی عیاض نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے، فرماتے ہیں کہ دونوں طبقہ کی حدیثیں موجود ہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ طبقۂ ثانیہ کی روایات متابعت یا شواہد کے طور پر درج ہیں اسی طرح ان ابواب میں بھی آگئی ہیں جن میں طبقۂ اولی کی حدیثیں دستیاب نہ ہوسکیں، اسی طرح ان راویوں کی روایات سے بھی تعرض کیا ہے، جن کو بعض محدثین نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے یا وہ منهم بالبدعة ہیں[۱]، کذالك فعل البخاری۔ غرض یہ کہ تینوں طبقات کی روایات کتاب میں آگئی ہیں، اور امام صاحب کے نزدیک حدیث صحیح کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو اور ابتدا تا انتہا ثقہ راویوں نے روایت کیا ہو، شذوذ و علت سے پاک ہو، جب یہ شرائط کسی حدیث میں پائے جائیں تو وہ بالاتفاق صحیح تسلیم کی جاتی ہے، البتہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے، جب ان شرائط میں کوئی شرط موجود نہ ہو یا ان میں باہم اس شرط کے اشتراط میں اختلاف ہو، زیادہ تر ان روایتوں میں جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے شرائط موجود ہوں اور دوسرے کے نزدیک معدوم مثلاً عکرمہ و عمر بن مرزوق سے امام بخاری روایت کرتے ہیں لیکن امام مسلم ان کو قابل روایت قرار نہیں دیتے[۲]، اس بنا پر امام مسلمؒ نے امام بخاریؒ کے ۴۳۴ راویوں سے اور امام بخاری نے امام مسلم کے ۶۲۵ راویوں سے روایت نہیں کیا ہے[۳]۔

اسی طرح امام مسلم نے ایسے لوگوں سے بھی حدیث کی تخریج کی ہے، جن کی حدیث کو کسی شبہہ کی بنا پر امام بخاری نے ترک کر دیا تھا[۴]، جس کی مثال امام زہری کے تلامذہ ہیں جو اوصاف کی کمی و زیادتی کے لحاظ سے پانچ طبقوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، امام

---

۱ شروط الائمہ صـ ۵۳ و فتح الملہم صـ ۵۷ ۲ فتح الملہم صـ ۵۶ ۳ مقدمہ فتح الباری صـ ۶ ۴ شروط الائمہ صـ ۱

بخاری نے طبقۂ اولیٰ سے اصالۃً اور طبقۂ ثانیہ سے جن کی احادیث پران کو اعتماد ہے ان سے بھی روایت کیا ہے، لیکن بالاستیعاب ایسا نہیں کیا، اور امام مسلم نے دونوں طبقوں کی احادیث کو بالاستیعاب لیا ہے، اسی طرح طبقۂ ثالثہ کی روایات کو امام بخاری نے قبول نہیں کیا ہے، لیکن امام مسلم ان سے بھی کبھی کبھی روایات بیان کرتے ہیں[1]، ابن سید الناس فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد اور مسلم کی شرطیں تقریباً یکساں ہیں مگر جمہور محدثین نے ان کے قول کی تردید کی ہے[2]۔

صحیح مسلم کا سلسلۂ روایت

صحیح مسلم کی شہرت اگرچہ مصنف سے تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہے، لیکن اسکی روایت کا سلسلہ شیخ ابواسحٰق ابراہیم بن محمد بن سفیان نیشاپوری المتوفی ۳۰۸ھ سے قائم رہا، ابراہیم بن سفیان کو امام مسلم سے خاص ربط تھا، اکثر حاضر خدمت رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ امام مسلم نے اس کتاب کی قرأت سے جو انہوں نے ہمارے لئے شروع کی تھی، رمضان ۲۵۷ھ میں فراغت پائی، یوں بلاد مغرب میں امام صاحب کے ایک اور شاگرد ابو محمد بن علی قلانسی سے بھی صحیح مسلم کی روایت کی جاتی ہے، لیکن اس کا سلسلہ مغرب کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکا، جو قبولِ عام ابراہیم نیشاپوری کی روایت کو نصیب ہوا، وہ قلانسی کی روایات کو نہ ہوسکا، علاوہ ازیں صحیح مسلم کا آخری حصہ جو تین جزو کے قریب قریب ہے، ابو محمد جلودی سے روایت کرتے ہیں[3]۔

صحیح مسلم پر بعض شبہات

علامہ نووی فرماتے ہیں کہ صحیحین پر استدراک کیا گیا، بہت سی احادیث کی تخریج میں شیخین کے شرائط پورے

---

[1] تدریب ص۴۲ [2] ایضاً ص۵۶ [3] مقدمہ شرح مسلم از نووی

پورے موجود نہیں ہیں، امام دار قطنی نے اس پر مستقل رسالہ "الاستدراک والتتبع" کے نام سے لکھا، اور تقریباً دو سو (۲۰۰) احادیث پر کسی نوع کا کلام کیا ہے، نیز بعض دیگر علماء نے بھی استدراک کیا ہے[۱]۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہر منصف کے سامنے جو ان احادیث پر غور کریگا، یہ حقیقت واشگاف ہو جائے گی کہ ان اعتراضات کا تعلق موضوع کتاب سے نہیں، پھر وہ احادیث دوسرے اسانید سے بھی مروی ہیں، شیخ ابن صلاح وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس کتاب کی صحت کو امت نے تسلیم کیا ہے لیکن جن جگہوں پر اعتراضات کئے گئے ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں[۲]۔

حافظ ابن حجر نے کہا کہ ان روایات کی تعداد دو سو بائیس (۲۲۰) ہے جس میں ۳۲ میں صحیحین کا اشتراک ہے اور ۷۸ بخاری میں اور ۱۰۰ مسلم میں، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ صحیحین کی جن احادیث کی تضعیف کی گئی ہے ان کی بنا ایسے علل پر ہے جو کچھ حارج نہیں[۳]۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: وھو احترازٌ حسنٌ۔

علامہ ابن تیمیہ صحیحین کے سلسلہ میں فرماتے ہیں جو شخص سات ہزار دراہم کو پرکھے گا اگر چند دراہم اس کے معیار کامل پر نہ اترے تو اس میں کوئی نقص کی بات نہیں[۴]۔

امام مسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو امام ابو زرعہ رازی کے سامنے پیش کیا، جس حدیث میں انہوں نے کسی علت کی طرف اشارہ کیا، میں نے ترک کر دیا، اس سے یہ بات معلوم و متعین ہو گئی کہ شیخین ان احادیث کی تخریج کرتے ہیں جس میں کوئی

---

[۱] مقدمہ شرح نووی [۲] فتح الملہم ص۹۶ [۳] فتح الملہم ص۹۶ [۴] [۵] تدریب ص۷۲

علت نہ ہو یا ایسی علت ہے جو ان دونوں کے نزدیک غیر مؤثر ہے، پس معترضین کا نقض شیخین کی تصحیح کے معارض ہوگا اور شیخین کی تصحیح کو دوسروں کے مقابل میں جو فوقیت ہے وہ معلوم ہے، اس کے بعد حافظ نے اس اجمال کی تفصیل کی ہے[۱]۔

صحیح مسلم کی شروح

صحیح مسلم پر بہت سی شروح وحواشی اور مستخرجات لکھے گئے ہیں، صاحب کشف الظنون نے ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے، ہم یہاں چند مشہور شروح کا تعارف کرا رہے ہیں۔

(۱) المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج، یہ حافظ ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی المتوفی ۶۷۶ھ کی تصنیف ہے۔

(۲) مختصر شرح النووی:۔ شیخ شمس الدین محمد بن یوسف القونوی الحنفی، المتوفی ۷۸۸ھ نے اسی منہاج کا اختصار کیا ہے۔

(۳) اکمال المعلم فی شرح مسلم:۔ علامہ قاضی عیاض المالکی ۵۴۴ھ قاضی صاحب نے علامہ مازری کی شرح کی تکمیل کی ہے۔

(۴) المعلم بفوائد کتاب مسلم:۔ ابوعبداللہ محمد بن علی المازری ۵۳۶ھ اس کی تکمیل قاضی صاحب نے کی ہے، اسی لئے قاضی صاحب نے اپنی شرح کا نام اکمال المعلم رکھا ہے۔

(۵) المفہم لما اشکل فی تلخیص کتاب مسلم:۔ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابی ابراہیم القرطبی ۶۵۶ھ علامہ موصوف نے سب سے پہلے صحیح مسلم کی تلخیص وتبویب کی، اس کے بعد اس کی شرح لکھی، مصنف کا بیان ہے کہ ان کی شرح میں علاوہ توجیہ واستدلال

---

[۱] ایضاً ص۷۶

کے اعراب کے نکات بھی بیان کئے گئے ہیں۔

(۶) اکمال المعلم :۔ امام ابو عبداللہ محمد بن خلیفہ الوشتانی الاُبی، المالکی، المتوفی ۸۲۷ھ مصنف نے قاضی عیاض، علامہ نووی، قرطبی مازری کی شروح سے مدد لی ہے اور بہت سے فوائد کا اضافہ کیا ہے۔

(۷) المفہم فی شرح غریب مسلم :۔ امام عبدالفاخر بن اسماعیل الفارسی، المتوفی ۵۲۹ھ الفاظ غریبہ کی شرح ہے۔

(۸) شرح صحیح مسلم :۔ عماد الدین عبدالرحمٰن بن عبدالعلی المصری، اس شرح کی کیفیت معلوم نہیں۔

(۹) شرح صحیح مسلم :۔ علامہ ابوالفرج عیسیٰ بن مسعود الزاوی، المتوفی ۷۴۴ھ یہ معلم، اکمال، مفہم اور قاضی زین الدین، زکریا بن محمد الانصاری، المتوفی ۹۶۶ھ کی شرح کا مجموعہ ہے۔

علامہ شعرانی کہتے ہیں کہ اس کا زیادہ تر مجموعہ میرے ہاتھ کا لکھا ہے۔

(۱۰) الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج :۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ المتوفی ۹۱۱ھ یہ نہایت لطیف شرح ہے افسوس نایاب ہے۔

(۱۱) وشی الدیباج :۔ علامہ کجبوعی، المتوفی ۱۲۹۸ھ نے علامہ سیوطی کی شرح کی تلخیص کی ہے، جو مصر سے طبع ہو چکی ہے۔

(۱۲) السراج الوہاج :۔ مولانا نواب صدیق حسن خاں صاحب، المتوفی ۱۳۰۷ھ یہ بھی مختصر منذری کی شرح ہے، جو طبع ہو چکی ہے۔

(۱۳) مختصر صحیح مسلم :۔ علامہ عبدالعظیم منذری نے صحیح مسلم کا اختصار کیا اور

تبویب بھی کی ہے، یہ اس کی شرح ہے۔

(۱۴) فتح الملہم :- یہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی المتوفی ۱۳۶۹ھ کی شرح ہے اس کی صرف تین جلدیں مکمل ہوسکیں، غالباً پانچ جلدوں میں یہ مکمل ہوتی، مگر افسوس کہ حضرت مولانا کا وصال ہوگیا، اس لئے کتاب ناقص رہی ہم دعا کرتے ہیں کہ حق تعالےٰ شانہ کسی اپنے بندہ کے ذریعہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے، مصنف نے شروع میں ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے جس میں علم حدیث کے اصول وضوابط اور کتاب کی خصوصیات سے بحث کی ہے، نیز شرح میں خصوصیت سے اسرار حدیث کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، اس مقالہ میں اس سے بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے۔

صحیح مسلم کی شروح و متعلقات کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے جو ملا علی قاری ۱۰۱۶ھ، علامہ قسطلانی ۹۲۳ھ وغیرہ کے قلم سے نکلی ہیں، صاحب کشف الظنون وغیرہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

*

امام ابُوداوٗدؒ

نام ونسب سلیمانؔ نام کنیت ابوداوٗد تھی، والد کا نام اشعث بن اسحٰق تھا، سیستان کے رہنے والے تھے، جو ہراؔت اور سندھؔ کے درمیان بلوچستان کے قریب واقع ہے، سیستاؔن کا معرب سجستاؔن ہے اس لئے وطن کی طرف منسوب ہو کر سجستاؔنی کہلاتے ہیں، اگرچہ ان کے وطن کی تعیین میں قدرے اختلاف ہے۔

ابن خلکاؔن نے کہا ہے کہ سجستاؔن بصرہ کے اطراف میں ایک دیہات کا نام ہے" لیکن شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس کی تردید کی ہے، اور فرمایا ہے کہ یہ ہراؔت وسندھؔ کے درمیان ایک مشہور شہر ہے[1]۔

لیکن وہاں کے جغرافیہ میں اس نام کے شہر کا کہیں پتہ نہیں چلتا، یاقوتؔ حموی نے لکھا ہے کہ یہ خراسان کے اطراف میں ہے اور اس کو سجزؔ بھی کہتے ہیں، اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے[2]۔ اس لئے امام ابوداوٗد سجزی بھی کہلاتے ہیں۔

---

[1] بستان المحدثین [2] معجم البلدان جلد ۵ ص۳۷

پیدائش، وفات

امام موصوف سیستان میں ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ بغداد میں گزارا اور وہیں اپنی سُنن کی تالیف کی، اسی لئے ان سے روایت کرنے والوں کی اس اطراف میں کثرت ہے، لیکن بعض وجوہ سے ۲۷۱ھ میں بغداد کو خیرباد کہا اور زندگی کے آخری چار سال بصرہ میں گزارے جو اس وقت علم وفن کے لحاظ سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا، اور وہیں بروز جمعہ ۲۷۵ھ کو وفات پائی [۱]

تحصیل علم کے لئے سفر

ان کی زندگی کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں، لیکن جس زمانے میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اس وقت علم حدیث کا حلقہ بہت وسیع ہوچکا تھا، اس لئے امام موصوف نے مختلف بلاد کا سفر کیا، اور اس زمانہ کے تمام مشاہیر اساتذہ وشیوخ سے حدیث حاصل کی، صاحب الکمال نے لکھا ہے: قدم بغداد غیر مرۃ، بغداد متعدد بار تشریف لائے، نیز تحصیل علم کے لئے عراق، خراسان، شام، الجزائر وغیرہ مختلف شہروں کی خاک چھانی اور ہر جگہ کے اربابِ فضل وکمال سے استفادہ کیا۔[۲]

اساتذہ وشیوخ

امام ابوداؤدؒ تحصیل علم کے لئے جن اکابر وشیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کا استقصار دشوار ہے خطیب تبریزی فرماتے ہیں کہ: اخذ العلم من لا یحصیٰ [۳]

انہوں نے بیشمار لوگوں سے حدیثیں حاصل کیں، ان کی سنن اور دیگر کتابوں کو دیکھ کر حافظ ابن حجر کے اندازے کے مطابق ان کے شیوخ کی تعداد تین سو [۳۰۰] سے

---

[۱] الکمال ووفیات الاعیان جلد ص ۱۳۸ [۲] اتحاف النبلاء ص ۲۵۷ [۳] الکمال

زائد ہے، وہ امام بخاریؒ کے بہت سے شیوخ میں ان کے شریک ہیں، ان کے اساتذہ میں امام احمدؒ قعنبیؒ ابوالولید طیالسیؒ مسلم بن ابراہیم اور یحییٰ بن معین جیسے ائمۂ فن ہیں[۱]

تلامذہ ان کے تلامذہ کا شمار بھی مشکل ہے، ان کے حلقۂ درس میں کبھی کبھی ہزاروں کا اجتماع ہوتا تھا، علامہ ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ان کے لئے سب سے زیادہ قابلِ فخر بات یہ ہے کہ امام ترمذی اور امام نسائیؒ ان کے تلامذہ میں سے ہیں، اور امام احمدؒ بن حنبل نے بھی حدیثِ عتیرہ کو ان سے سنا ہے اور امام ابوداؤد اس پر فخر کیا کرتے تھے[۲]

زہد وتقویٰ ابوحاتم فرماتے ہیں کہ امام موصوف فقہ و علم اور حفظ حدیث، زہد و عبادت یقین وتوکل میں یکتائے روزگار تھے[۳] ان کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ ان کے کرتہ کی ایک آستین تنگ تھی اور ایک کشادہ، جب اس کا راز دریافت کیا گیا تو بتایا کہ ایک آستین میں اپنے نوشتہ رکھ لیتا ہوں اس لئے اس کو کشادہ بنالیا ہے اور دوسری کو کشادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، نہ اس میں کوئی فائدہ تھا، اس لئے اس کو تنگ ہی رکھا ہے، ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ورع وتقویٰ، عفت وعبادت کے بہت اونچے مقام پر فائز تھے[۴] کہا گیا ہے کہ امام موصوف رفتار وگفتار میں اپنے استاد امام احمدؒ کے بہت مشابہ تھے[۵]

امام موصوف کے فضل کا اعتراف امام موصوف کو علم وعمل میں جو امتیازی مقام حاصل تھا، اس زمانے کے

---

[۱] تذکرہ جلد ۲ ص۱۵۳ [۲] حوالۂ مذکور ایضاً [۳] اتحاف ص۲۵۷ [۴] مرقاۃ جلد ۱ ص۲۲

[۵] مقدمہ بذل المجہود وتذکرہ۔

علماء و مشائخ کو بھی اس کا پورا پورا اعتراف تھا، چنانچہ حافظ موسیٰ بن ہارون فرماتے ہیں کہ امام ابو داؤدؒ دنیا میں حدیث کیلئے اور آخرت میں جنت کیلئے پیدا کئے گئے تھے، میں نے اس سے افضل کسی کو نہیں دیکھا امام ابراہیم حربی کا یہ فقرہ ابو داؤد کے متعلق مشہور ہے کہ حدیث کو ان کیلئے اس طرح نرم کر دیا گیا تھا جیسے داؤد علیہ السلام کیلئے لوہا، حاکم کی رائے یہ ہے کہ امام اهل الحدیث فی عصرہ بلا مدافعۃ امام ابو داؤد بلا شک و ریب اپنے زمانے میں محدثین کے امام تھے۔[1]

ابو داؤدؒ کا مسلک

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان کا مسلک کیا ہے، اور کبار محدثین کے ساتھ ہمیشہ یہ معاملہ ہوتا رہا ہے کہ مختلف مسلک والوں نے ان کو اپنے مسلک کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی یہی معاملہ امام ابو داؤد کے ساتھ بھی ہوا، بستان المحدثین میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ ان کے مسلک میں اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ شافعی تھے، بعض حضرات نے ان کو حنبلی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ نے ان کو شافعی شمار کیا ہے، لیکن مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ نے علامہ ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے ان کو حنبلی فرمایا ہے[2]، مگر ان کی سنن کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل آشکار ہو جاتی ہے کہ امام ابو داؤدؒ حنبلی المسلک ہی تھے، ان کی سنن کے تراجم پر غور کرنے کے بعد اس میں شک کی گنجائش نہیں رہتی، امام موصوف نے اپنی سنن میں بہت سے مقامات پر دوسری ثابت و معروف روایات کے مقابلہ میں ان احادیث کو ترجیح دی ہے جن سے امام احمدؒ کے مسلک کی تائید ہے، مثلاً ترجمہ قائم کرتے ہیں باب کراھیۃ استقبال

---

[1] مقدمہ غایۃ المقصود ص۲ و وفیات الاعیان جلد ۲ ص۱۳۹ [2] فیض الباری

القبلة عند قضاء الحاجة[1]

چونکہ امام احمدؒ کے نزدیک قضائے حاجت کے وقت استدبار قبلہ مطلقاً جائز ہے اس لئے ترجمۃ الباب میں اس کو ترک کر دیا، مزید براں اس کے آگے باب الرخصة فی ذلك، کا ترجمہ قائم کر کے استدبار قبلہ کا جواز ثابت کیا ہے، اسی طرح ترجمہ ہے "باب البول قائمًا" اس میں حضرت ابو حذیفہؓ کی روایت " اتی سباطة قوم فبال قائمًا" ذکر کر کے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی اباحت ثابت کی ہے جو امام احمدؒ کا مسلک ہے، حالانکہ ان کے علاوہ جمہور علماء کے نزدیک بغیر عذر کے مکروہ ہے اور حنفیہ کے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے، اور یہاں دوسری مشہور حدیث ذکر نہیں فرمائی جس سے بیٹھ کر ہی پیشاب کرنے کی تاکید نکلتی ہے، بلکہ اس کو اپنی کتاب میں دوسری جگہ ذکر فرمایا ہے، اسی طرح باب قائم کیا ہے " باب فی ترك الوضوء مما مست النار" اور اس سے اگلا باب باندھا ہے، باب التشديد فی ذلك یعنی آگ سے پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کرنا واجب ہے امام ابو داؤدؒ نے پہلے ترجمۃ الباب سے اشارہ کیا ہے اس بات کی طرف کہ حضرت جابرؓ کی حدیث "كان آخر الامرين من رسول صلے الله عليه وسلم ترك الوضوء مما غيرت النار" کو جمہور نے ناسخ قرار دیا ہے لیکن چونکہ اس حدیث کو مسئلہ وضوء من لحوم الابل میں بھی حنابلہ کے خلاف ائمہ ثلاث نے ناسخ قرار دیا ہے، اسی لئے امام ابو داؤدؒ نے باب التشديد فی ذلك کا باب قائم کر کے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ترك الوضوء مما غيرت النار" حدیث جابرؓ سے منسوخ نہیں بلکہ

---

[1] بذل جلد ۱ ص۲۰

اس کے نسخ کیلئے دوسرے دلائل موجود ہیں[1]، اور مثلاً باب قائم کیا ہے باب فی القطع فی العاریۃ اذا جحدت، اس میں مصنفؒ نے امام احمدؒ کے مسلک کی پوری تائید کی ہے، اس لئے کہ امام احمدؒ کے نزدیک جمہور کے خلاف خائن خیانت کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، حالانکہ اس سے پہلے ہی باب میں "لیس علے الخائن قطع" والی روایت کو ذکر کیا ہے جس سے ائمہ ثلاث کا استدلال ہے[2]، اسی طرح انہوں نے ترجمہ قائم کیا ہے باب الوضوء بفضل طھور المرأۃ[3]۔ اس کے بعد ترجمہ باندھا ہے، باب النھی عن ذلک، ائمہ اربعہ میں سے یہ صرف امام احمدؒ کا مذہب ہے کہ عورت کے غسل یا وضو سے بچے ہوئے پانی کا استعمال مرد کیلئے ناجائز ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب عورت پانی میں ہاتھ ڈال دے اور اس کو استعمال کرے تو بقیہ پانی مرد کے لئے مستعمل ہو گیا ہے[4]۔

غرض یہ ہے کہ اس طرح اگر کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو پوری طرح سے امام موصوف کا حنبلی المسلک ہونا متعین ہو جاتا ہے۔

تصنیفات | سنن، مراسیل، الرد علی القدریۃ، الناسخ والمنسوخ، ماتفرد بہ اہل الامصار، فضائل الانصار، مسند مالک بن انسؓ، المسائل، معرفۃ الاوقات والاخوۃ وغیرہ[5]، کتاب بدء الوحی[6]، جس میں سب سے زیادہ اہم ان کی سنن ہے، جس پر اگلے صفحات میں ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

سنن کا زمانۂ تالیف | کہیں متعین طور سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس سن

---

[1] بذل جلد ۱ ص ۱۱۶ [2] ایضاً ص ۱۰۵ [3] ایضاً ص ۵۰ [4] ایضاً جلد ۵ ص ۱۵

[5] تدریب ص ۲۲۰ [6] تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴۹

امام موصوف سنن کی تالیف سے فارغ ہوئے، لیکن ملا علی قاریؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ جب سنن کی تالیف سے فارغ ہوئے تو اس کو اپنے اساتذہ امام احمدؒ وغیرہ کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اس کو پسند فرمایا،[1] اور امام احمدؒ کا سنہ وفات ۲۴۱ھ ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک تالیف سے فارغ ہوچکے تھے۔[2]

سنن ابو داؤد کی وجہ تالیف

امام ابو داؤدؒ نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں تو انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ فن حدیث میں ایک نئے انداز کی کتاب کی ضرورت ہے جس میں ان احادیث کا استیعاب ہو جن سے ائمہ نے اپنے مذاہب پر استدلال کیا ہے، اس کی خاص وجہ تھی جیسا کہ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث کی ایک جماعت ایسی تھی جس نے ضبط و حفظ میں پوری توجہ کی لیکن اس نے نہ تو مسائل کے استنباط کی طرف توجہ کی اور نہ ان خزانوں سے احکام نکالنے کی کوشش کرتی تھی، جو اس نے محفوظ کر رکھا تھا، اور اس کے بالمقابل ایک جماعت ایسی تھی جس نے اپنی پوری توجہ استنباط مسائل اور اس میں غور و فکر کی طرف رکھی تھی،[3] یہاں تک کہ ناقلین حدیث کی پہلی جماعت جو فتوے دینے سے بھی احتراز کرتی تھی، ان کا مقصد صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو روایت کرنا تھا اور یہ حضرات ائمہ مجتہدین کی فقہی باریکیوں سے ناواقف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے معتقدین میں سے بعد کے کچھ لوگوں نے ائمہ پر نقد شروع کر دیا جیسے حمیدی نے امام ابو حنیفہؒ پر اور احمد بن عبداللہ العجلی نے امام شافعیؒ پر سخت تنقید کی اور کہا کہ وہ قابل اعتماد ہیں لیکن انہیں حدیث سے واقفیت

---

[1] مرقاۃ جلد ۱ ص ۲۲ [2] لامع ص ۱۴ [3] الوابل الصیب جلد ۳ ص ۸۴۳

نہیں ابوحاتم رازی نے کہا کہ" کان الشافعیؒ فقیہًا ولم یکن لہ معرفۃ بالحدیث"[۱] اس لئے امام ابوداؤدؒ خود فرماتے ہیں کہ میری اس کتاب کے اندر مالکؒ، ثوریؒ، شافعیؒ وغیرہ کے مذاہب کی بنیادیں موجود ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسی احادیث کو یکجا کر دیں جس سے فقہاء استدلال کرتے ہیں، اور ان میں مروّج ہیں، اور جن کو علماء بلاد نے احکام کی بناء قرار دیا، اس مقصد کے لئے امام ابوداؤدؒ نے اپنی سنن کو تصنیف کیا[۲]، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایک مجتہد کے لئے یہ کافی ہے، احکام کے استیعاب میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے[۳]۔

سنن کی مقبولیت

اس لئے ہر زمانے میں علماء و فقہاء نے سنن ابی داؤد کی طرف پوری توجہ کی، یہاں تک کہ جب یہ کتاب لکھی گئی اور مصنف نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا تو بہت زیادہ مقبول ہوئی، امام خطابی نے لکھا ہے کہ سنن ابی داؤد جیسی کتاب علم دین کے متعلق ابھی تک نہیں لکھی گئی، علامہ ابن قیمؒ کی رائے ہے کہ امام موصوف نے ایسی کتاب لکھی ہے، جو مسلمانوں کے درمیان حکم ثابت ہوئی اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کُن بن گئی، بعض بزرگوں نے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا جو سنت پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے سنن ابی داؤد پڑھنا چاہیئے[۴]، علماء نے مصنفؒ کی زیارت کے لئے رختِ سفر باندھا، سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ جو اس زمانہ کے اہل اللہ میں سے تھے، مصنفؒ کی زیارت کے لئے آئے تو امام موصوف نے

---

[۱] ماتمس الیہ الحاجۃ [۲] حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۱ صفحہ ۳۵ [۳] تدریب الراوی صفحہ ۵۵

[۴] تہذیب السنن

ان کے حکم سے اپنی زبان مبارک کو نکالا تو انہوں نے بوسہ لیا[۱]۔

سنن ابی داؤد کا صحاح ستہ میں رتبہ

اس کے بعد اب یہاں ہم کو دو حیثیت سے گفتگو کرنی ہے، ایک تو یہ کہ تعلیم کے لحاظ سے صحاح ستہ کے درمیان اس کا کیا مقام ہے؟ دوسرے یہ کہ صحت کے اعتبار سے اس کا کیا درجہ ہے؟

تعلیم کے اعتبار سے صحاح ستہ میں مقام

تعلیم کے لحاظ سے اس کا مقام معلوم کرنے سے پہلے صحاح ستہ کے مقاصد ناظرین کے سامنے آجائیں تاکہ اس کی تعیین آسان ہوجائے، چونکہ صحاح ستہ کے مؤلفین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اپنی کتابوں کا انتخاب کیا ہے، حضرت امام بخاریؒ کے پیش نظر طرقِ استنباط واستخراج مسائل ہے، جو ان کے تراجم ابواب سے ظاہر ہے اہل درس کا مشہور مقولہ ہے کہ "بخاری کی ساری کمائی ان کے تراجم میں ہے"۔ اسی طرح امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں صحیح احادیث کو مختلف اسانید سے یکجا بیان کر دیا ہے، امام ابوداؤدؒ نے ائمہ کے مستدلات کو موضوع قرار دیا، امام ترمذیؒ کا مقصد بیانِ مذاہب اور امام نسائیؒ کی غرض عللِ حدیث پر تنبیہ کرنا ہے، ابن ماجہ نے غیر معروف روایات کو بیان کرنا اپنے پیش نظر رکھا[۲]۔ اوپر کی گفتگو سے ہمارے سامنے ان کتابوں کے اغراض ومقاصد آگئے ہیں اس لئے مشکوٰۃ شریف کے بعد ترمذی شریف کی تعلیم دینی چاہیئے کیونکہ سب سے پہلے طالب علم کو ائمہ کے مذاہب معلوم ہونے چاہیئں، پھر مزید برآں ائمہ کے دلائل جاننے کی ضرورت ہے اس کے

---

[۱] مقدمہ غایۃ المقصود ص۶ وتذکرہ [۲] ماخوذ از لامع ص۲۵ بحوالہ تدریب

لئے سنن ابی داوٗد کا وظیفہ ہے، پھر طرقِ استنباط وطرزِ استدلال معلوم ہونا چاہئے اس کے لئے صحیح بخاری کا وظیفہ ہے، پھر اس کے بعد مزید تائید کے لئے مسلم شریف کو پڑھانا چاہیئے، کیونکہ وہ صحیح احادیث کو مختلف اسانید سے یکجا روایت کرتے ہیں پھر علل حدیث جاننے کے لئے نسائی کا مقام ہے جہاں وہ "ھذا منکر و ھذا صواب" کہتے ہیں وہاں معرکہ پیش آجاتا ہے، پھر کھرے وکھوٹے کے جاننے کے لئے سنن ابن ماجہ کا درجہ ہے، اس گفتگو سے اب یہ بالکل واضح ہوگیا کہ تعلیم کے لحاظ سے سنن ابوداوٗد کا کیا درجہ ہے[۱]

صحاح ستہ میں صحت کے لحاظ سے مقام

یہ بات متفق ہے کہ صحیحین کو سنن اربعہ پر صحت کے لحاظ سے فضیلت حاصل ہے، لیکن اس کے بعد کی ترتیب میں علماء کا اختلاف ہے، بعض حضرات نے نسائی شریف کو تیسرا درجہ دیا ہے اور بعض نے جامع ترمذی کو[۲] حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جہاں کتب حدیث کے طبقات بیان کئے ہیں وہاں سنن ابی داوٗدؒ کو دوسرے طبقے میں شمار کیا ہے[۳]. لیکن صاحب مفتاح السعادۃ نے لکھا ہے کہ سب سے اونچا درجہ بخاری شریف کا ہے، اس کے بعد صحیح مسلم کا اور پھر سنن ابی داوٗد کا درجہ ہے اور یہی زیادہ مناسب ترتیب ہے، کیونکہ علامہ ابن جوزیؒ نے جامع ترمذی کی تیئیس[۳۰] احادیث سنن نسائی کی دس[۱۰] اور سنن ابی داوٗد کی نو[۹] احادیث کو موضوع قرار دیا ہے[۴]، اگرچہ علامہ موصوف نقدِ روایت میں متشدد مانے گئے ہیں اور علماء نے اکثر کا جواب دیا ہے، لیکن اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑے گا، اسلئے بھی سنن اربعہ میں سنن ابی داوٗد کو صحت کے لحاظ سے تقدم حاصل ہے، دوسری

---

[۱] افادات حضرت الاستاذ [۲] عرف الشذی [۳] عجالۂ نافعہ [۴] لامع ص ۶۳

وجہ یہ ہے کہ امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں رجال کے تین طبقات قائم کئے ہیں، جس کے متعلق حاکم وبیہقی نے لکھا ہے کہ انہوں نے صرف پہلے ہی طبقہ کی روایات کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے، لیکن قاضی عیاضؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے طبقۂ ثانیہ کی روایات کو بھی اپنی کتاب میں درج کیا ہے، علامہ نوویؒ نے ان کے قول کی تحسین کی ہے، البتہ طبقۂ ثالثہ کی روایات موجود نہیں ہیں، حضرت گنگوہیؒ نے اپنی تقریر مسلم میں فرمایا ہے کہ طبقۂ ثالثہ کی روایات کو بھی ضمناً واستشہاداً بعض جگہ بیان کر دیا ہے، بہرکیف طبقۂ اولیٰ وثانیہ کی روایات مسلم شریف میں موجود ہیں، اس پر ابن سید الناسؒ نے لکھا ہے کہ امام ابوداؤد نے بھی ضعیف اور ناقابل اعتبار روایات سے گریز کیا ہے، اور جہاں کہیں ضعف شدید ہے تو اس کی وجہ بیان کر دی ہے، نیز قسم اوّل و ثانی کی روایات بکثرت اپنی کتاب میں لائے ہیں، پس معلوم ہوا کہ دونوں کے شرائط ایک ہیں، یعنی مسلم شریف میں صحیح اور حسن دونوں طرح کی روایات موجود ہیں، کیونکہ امام ابوداؤد نے اپنے خط میں جو اہل مکہ کے نام لکھا ہے، اس میں اپنے شرائط کی صراحت کر دی ہے[1]، امام زین العراقی نے اس کو تسلیم نہیں کیا کہ ان دونوں کے شرائط ایک ہیں، کیونکہ امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں صحت کا التزام کیا ہے، ان کی کسی حدیث کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ان کے نزدیک حسن ہے، اس لئے کہ حدیث حسن کا درجہ صحیح سے نیچا ہے، اور امام ابوداؤدؒ کا مشہور قول ہے کہ "ماسکت عنه فهو صالح" جس حدیث سے میں سکوت اختیار کروں وہ قابل استدلال ہے، اس میں حسن وصحیح دونوں کا احتمال ہے، امام ابوداؤدؒ سے کہیں یہ منقول نہیں جس

---

[1] شروط الائمہ ص۵۵

کو میں صالح کہوں وہ صحیح ہی ہے[1]، اس کے علاوہ امام زہریؒ کے تلامذہ کے پانچ طبقات ہیں امام مسلمؒ نے طبقۂ ثانیہ کی روایات کو اصالۃً ذکر کیا ہے، اور ثالثہ کی ضمناً اور امام ابو داؤدؒ طبقۂ ثالثہ کی روایات کو اصالۃً لائے ہیں[2]. ان وجوہ کی بنا پر سنن ابی داؤد کا مقام صحیح مسلم کے بعد ہی رکھا جائے گا، جیساکہ علامہ نوویؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ترتیب قائم کی ہے، بخاری مسلم، پھر سنن ابی داؤد اس کے بعد نسائی پھر ترمذی و ابن ماجہ کا درجہ ہے[3]۔

سنن ابی داؤد کی خصوصیات

کتب ستہ کی علیحدہ علیحدہ کچھ خصوصیات ہیں، اس لئے کہ ہر کتاب کے مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کی کتاب میں کوئی نئی اور کارآمد بات ایسی ہو جو دوسری کتابوں سے اس کو ممتاز کر دے، اس کی تفصیل ہر ایک کے حالات کے ساتھ کی جائے گی فی الحال ہمارے پیش نظر سنن ابی داؤد کی خصوصیات کو بیان کرنا ہے، پورا مضمون اور بالخصوص یہ حصہ حضرت الاستاد مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث کے افادات سے ماخوذ ہے. جو بذل المجہود کی تصنیف میں شروع سے اخیر تک شریک رہے ہیں، اور مزید برآں پینتیس ۳۵ سال تک سنن ابی داؤد کا درس دیا ہے.

(۱) مصنف کبھی ایک ہی سند میں مختلف اسانید کو بیان کر دیتے ہیں، اسی طرح کبھی ایک متن میں مختلف متون کو اکٹھا کر دیتے ہیں، پھر ان میں سے ہر حدیث کے الفاظ کو علیحدہ علیحدہ بیان فرماتے ہیں، جیسے مسدد بن مسرہد نے حماد بن زید و عبدالوارث دونوں ہی سے روایت کیا ہے، تو مصنف نے دونوں کے الفاظ کو علیحدہ علیحدہ

---

[1] تدریب ص۵۶ و شروط الائمہ ص۵۳ [2] تدریب ص۱۰۱ [3] مقدمہ لامع ص۴۷

"عن وارث وعن حماد" کہہ کر بیان کر دیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں کے الفاظ کا اختلاف ظاہر ہو جائے، اور یہ دونوں ہی مسدد کے استاد ہیں[۱]۔

حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد ہے کہ ان کے اصول میں سے یہ ہے کہ جب کسی راوی کے الفاظ میں کوئی زیادتی یا کمی یا تغیر واقع ہوتا ہے یا راوی کا کوئی وصف وغیرہ بیان کرنا چاہتے ہیں، تو اس کو دوسری روایت سے علیحدہ کر دیتے ہیں اور جملۂ معترضہ کے طور پر اثنائے سند یا اثنائے متن میں یا آخر سند میں اسی کو بیان کرتے ہیں، اسی طرح جب دو اسناد ایک راوی پر جمع ہو جاتی ہیں تو اگر ایک نے حَدَّثَنَا کے ساتھ روایت کیا اور دوسرے نے عَنْعَنَہ سے تو پہلے حدثنا والی روایت کو مقدم کرتے ہیں، اور عنعنہ کو مؤخر کرتے ہیں[۲]۔

(۲) اسی طرح امام موصوف نے فرمایا ہے کہ وہ حدیث طویل کو کبھی مختصر بیان کرتے ہیں، کیونکہ اگر پوری حدیث ذکر کر دی جائے تو بعض سننے والے اس کی فقاہت کو سمجھ نہ سکیں گے۔

(۳) انہوں نے فرمایا ہے کہ جب وہ دو یا تین حدیثیں ایک باب میں ذکر کرتے ہیں تو ان کا مقصد کسی خاص نقطۂ نظر کو بیان کرنا ہوتا ہے، جو پہلی روایت میں موجود نہیں یا کسی روایت میں کسی خاص حیثیت سے مزید کلام کی ضرورت ہوتی ہے تو متعدد احادیث کو ایک باب کے تحت لاتے ہیں ورنہ اختصار ہی سے کام لیتے ہیں۔

(۴) انہوں نے فرمایا ہے کہ صرف تیرہ ۱۳ جگہیں ہیں جہاں اقدم کی روایت کو احفظ کی روایت پر مقدم کیا ہے۔

---

[۱] بذل جلد ۱ صفحہ ۳ [۲] ماخوذ از تقریر گنگوہیؒ

(۵) اسی طرح کبھی ایک ترجمہ کے تحت مختلف روایات کو جمع کر دیتے ہیں جیسا کہ باب کراھۃ استقبال القبلۃ عند قضاء الحاجۃ میں استدبار عند الحاجۃ کی روایت بھی لائے ہیں۔

(۶) اور کبھی ترجمۃ الباب اس طور پر قائم کرتے ہیں کہ خود ترجمہ کے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ احادیث سے ثابت شدہ حکم کے اندر یہ چیزیں بھی شامل ہیں جیسے ترجمہ لائے ہیں باب المواضع التی نھی عن البول فیہا، حالانکہ حدیث کے اندر کہیں بول کا تذکرہ نہیں ہے، صرف براز کا تذکرہ موجود ہے لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لئے ترجمہ کے الفاظ سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ دونوں کے اندر علت ممانعت ایک ہے، براز کے ساتھ بول بھی شامل ہے۔

(۷) اسی طرح امام موصوف کی سنن میں ایک حدیث ثلاثی بھی ہے جب کہ سند عالی کی محدثین کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت ہے، چنانچہ امام بخاریؒ کی ثلاثیات بہت مشہور ہیں اور انہیں ان کی کتاب کا ایک اہم باب سمجھا جاتا ہے، وہ حدیث کتاب السنۃ باب الحوض کی آخری حدیث ہے، جو رباعی ہے، مگر درحقیقت ثلاثی کے حکم میں ہے

(۸) امام ابو داؤدؒ نے جس فضا میں آنکھیں کھولیں، دولتِ عباسیہ اپنے شباب پر تھی، اسلامی تہذیب و ثقافت کے آب صاف میں ایرانی تہذیب و ثقافت کی کثافت مل کر اسے گدلا کر رہی تھی، امام صاحب نے کوشش کی کہ امت اسلامیہ عجمی اثرات سے محفوظ رہے، اس مقصد کے پیش نظر اپنی سنن میں کتاب الآداب کو ایک ممتاز درجہ دیدیا۔[1]

---

[1] ابوداؤد کتاب الجنائز جلد ۲ ص ۵۷

تعدادِ روایات

امام ابوداؤدؒ نے پانچ لاکھ احادیث کے مجموعہ میں سے صرف چار ہزار آٹھ سو کا اپنی کتاب میں انتخاب کیا ہے، مزید برآں چھ سو مراسیل بھی ہیں، نیز امام شافعیؒ کے سوا مرسل حدیث جمہور کے نزدیک قابلِ حجت ہے، امام ابوداؤدؒ کے استاد امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

صرف چار احادیث انسان کے دین کیلئے کافی ہیں

امام ابوداؤدؒ نے اتنی روایات میں سے صرف چار کا انتخاب فرمایا کہ انسان کو اپنے دین پر عمل کرنے کیلئے صرف یہ حدیثیں کافی ہیں[1]۔

(۱) انما الاعمال بالنیات (تمام اعمال کی مقبولیت کا دارومدار صرف نیتوں پر ہے)

(۲) من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ (انسان کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے)۔

(۳) لا یکون المؤمن مؤمنا حتی یرضیٰ لاخیہ ما یرضیٰ لنفسہ، مومن اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی بات پسند نہ کرے جس کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(۴) الحلال بین والحرام بین، الخ۔ (حلال وحرام واضح ہیں، مگر ان کے درمیان بعض مشتبہ ومشکوک چیزیں بھی ہیں، جوان سے بچے گا، وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر سکے گا)۔

---

[1] ماخوذ از افادات استاد محترم مولانا محمد اسحاق صاحب مدظلہ

اگرچہ حافظ ابن حجرؒ نے النصح لکل مسلم والی روایت کے متعلق کہا ہے کہ چار بنیادی حدیثوں میں سے اس کو بھی شمار کیا گیا ہے، اور اس کی تائید میں امام احمد بن احمد کا قول پیش کیا ہے[1]۔ لیکن علامہ نوویؒ کی رائے یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کو چار احادیث میں ایک شمار کیا ہے، ان کی رائے صحیح نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ تو سب کی جامع ہے اور اس پر اسلام کا مدار ہے، الغرض امام ابو داؤدؒ نے ان چار حدیثوں کو انسان کے دین کے لئے کافی بتایا ہے، واقعہ ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ زندگی کے سارے معاملات پر حاوی ہیں، چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ کافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دین کے مشہورات وقواعدِ کلیہ جاننے کے بعد جزئیات دین کو معلوم کرنے کے لئے کسی مجتہد کی ضرورت باقی نہیں رہتی، چونکہ حدیث اول عبادات کی درستگی کے لئے کافی ہے، اور حدیث ثانی سے عمر عزیز کے اوقات کی محافظت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، تیسری حدیث سے حقوق کی معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں و متعارفین اور اہل معاملہ کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے، اور چوتھی حدیث ایسے مسائل میں جس میں علماء کو شک و تردد ہے ایک واضح راستہ پیش کرتی ہے غرض یہ کہ یہ چاروں حدیثیں ایک عاقل آدمی کے لئے استاد و شیخ کا درجہ رکھتی ہیں[2]، لیکن فی الواقع امام ابو داؤدؒ سے پہلے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنے صاحبزادہ حمادؒ سے فرمایا تھا کہ میں نے پانچ لاکھ احادیث کے مجموعہ میں سے پانچ احادیث کا انتخاب کیا ہے، اور چار تو وہی ہیں جن کو امام ابو داؤدؒ نے بیان کیا ہے اور پانچویں حدیث یہ ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده الخ،

---

[1] فتح الباری جلد ا صـ۱۰۳ [2] الحطہ صـ۱۰۵ و بستان صـ۱۹۹

چونکہ امام ابوداؤدؒ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے فضل وامامت کے قائل ہیں، چنانچہ ان کا مشہور قول ہے :
رحم اللہ ابا حنیفۃ انہ کان اماماً ، اللہ رحم کرے ابوحنیفہؒ پر وہ امام تھے، ابن عبدالبر نے الانتقاء میں اس کو نقل کیا ہے، اس لئے زیادہ قرین قیاس ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے امام صاحبؒ کے قول کو اپنے سامنے رکھ کر ان چار حدیثوں کا انتخاب فرمایا ہو۔

ماسکت عنہ ابوداؤد کی حیثیت

اس کتاب کے اندر یہ مسئلہ بھی نہایت ہی معرکۃ الآراء ہے جن احادیث پر امام موصوف سکوت اختیار فرمائیں ان کی حیثیت کیا ہوگی کیونکہ انہوں نے دعوے کیا ہے کہ مالم یذکر فیہ شیئاً فھو صالح[۱] ۔جس کے بارے میں وہ سکوت اختیار کریں وہ صالح ہے، یعنی قابل استدلال ہے، اور انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ البتہ ان میں صحت کے اعتبار سے تفاوت ہے، بعض بعض کے مقابل میں زیادہ صحیح ہیں، اب قابل استدلال ہونے میں حسن وصحیح دونوں ہی کا احتمال ہے، لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ حسن ہی قرار دیا جائے، علامہ نوویؒ کا فیصلہ یہ ہے کہ ان پر عمل کرنا جائز ہے بشرطیکہ قابلِ اعتماد محدثین نے بھی سکوت فرمایا ہو[۲]، قاضیؒ شوکانی نے نقل کیا ہے کہ علامہ نوویؒ وابن صلاحؒ وغیرہ حفاظ حدیث نے جن احادیث پر ابوداؤدؒ نے سکوت اختیار کیا ہے عمل کرنا جائز بتایا ہے، البتہ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی جگہ صحت وحسن کے خلاف کوئی چیز ملے گی تو پھر ہم اس پر عمل ترک کر دیں گے اور شیخ ابن صلاحؒ نے کہا کہ جو حدیث ہم ان کی کتاب میں مطلقاً بغیر فیصلہ کے پائیں گے اور اس کی صحت بھی ہمیں معلوم نہیں تو ایسی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ یہ امام

---

[۱] تدریب ص۵۵ [۲] ایضاً

موصوف کے نزدیک حسن ہے، کیونکہ جس سے امام ابو داؤدؒ نے سکوت اختیار فرمایا ہے وہ ان کے نزدیک حسن و صحیح دونوں کا احتمال رکھتی ہے[1]، لیکن ابن مندہ کی رائے یہ ہے کہ ابو داؤدؒ کو جب کسی باب میں ضعیف حدیث کے علاوہ اور کوئی روایت نہیں ملی تو اسی کو لائے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک وہ لوگوں کی رائے سے زیادہ قوی ہے، ان کے استاد امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک تھا کہ لوگوں کی رائے سے زیادہ عزیز حدیث ہے خواہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو، وہ قیاس کا راستہ اس وقت تلاش کرتے تھے، جب کہیں کوئی نص نہ مل سکے[2]، علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کے نزدیک رائے کے مقابل میں حدیث ضعیف کے عزیز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روایت باطل و منکر نہ ہو اور اس میں کوئی ایسا راوی نہ پایا جائے کہ جس سے روایت جائز ہی نہیں، اور فی الواقع ایسی ضعیف حدیث سے استدلال تو امام ابو حنیفہؒ و مالکؒ و شافعیؒ بھی کرتے ہیں[3]، اسی لئے بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ امام ابو داؤدؒ کے قول " فما سکت عنہ فہو صالح " کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث استشہاد و اعتبار کے قابل ہے، اس کو دوسری حدیث کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے، پھر ایسی صورت میں حدیث ضعیف بھی شامل ہو جائے گی۔ مگر علامہ ابن کثیر نے امام ابو داؤد کا قول صریح نقل کیا ہے۔ ماسکت عنہ فہو حسن، جس سے میں نے سکوت اختیار کیا ہے وہ حسن ہے، اس لئے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا[4]، قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ منذری نے پوری توجہ ان احادیث کے نقد کے بارے میں کی ہے، جو سنن ابی داؤد کے اندر مذکور ہیں اور بہت سی مسکوت عنہا احادیث

---

[1] نیل الاوطار جلد ۱ ص ۱۵ [2] تدریب ص ۵۵ [3] اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۲۵ [4] تدریب ص ۵۵

کا ضعف بھی بیان کر دیا ہے۔ پس وہ احادیث اس سے خارج سمجھی جائیں گی اور بقیہ پر عمل کیا جائے گا، پس جب یہ دونوں ہی سکوت اختیار کریں پھر بلاشبہہ وہ حدیث قابل استدلال ہو گی، لیکن چند جگہیں مستثنیٰ ہیں جن کو میں اپنی اس شرح میں بیان کروں گا[1]۔ اسی طرح علامہ ابن قیمؒ نے بھی چند احادیث پر نقد کیا ہے، اس لئے بعض حضرات کا خیال ہے کہ سنن ابی داؤدؒ کی وہ احادیث قابلِ استدلال ہوں گی جن پر منذری وابن قیمؒ دونوں ہی نے سکوت کیا ہو، لیکن سنن ابی داؤد کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا یہ خیال ہے کہ بیشک منذری وابن قیم کی نقد کردہ احادیث کے علاوہ بھی بہت سی حدیثوں کو جن پر ان حضرات نے سکوت کیا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ وہ قابلِ استدلال ہیں، مگر ان سب کے باوجود ہمیں بعض احادیث ایسی بھی ملتی ہیں کہ جن پر ان سب نے سکوت اختیار کیا ہے اور فی الواقع وہ ضعاف ہیں، مثال کے طور پر مصنف نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رأیت ابن عمرؓ اناخ راحلته - الخ[2] اس کے بارے میں امام ابو داؤدؒ نے سکوت اختیار کیا ہے، اسی طرح منذری نے تخریج میں اور ابن قیم نے بھی اس میں سکوت فرمایا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا، حافظؒ نے بھی تلخیص الحبیر میں اس کے متعلق سکوت اختیار کیا، البتہ فتح الباری میں صرف اتنا فرماتے ہیں کہ اس کی تخریج ابوداؤد اور حاکم نے حسن سند سے کی ہے، لیکن ان حضرات کے سکوت پر تعجب ہے، کیونکہ اس کے راوی حسن بن ذکوان کی بہت سے محدثین نے تضعیف کی ہے ابن ابی الدنیا نے کہا کہ لیس ھو القوی عندی، وہ میرے نزدیک قوی نہیں ہے وقال احمد احادیثه أباطیل، اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس

---

[1] نیل الاوطار جلد ۱ ص۱۲ [2] بذل جلد ۱ ص۸

کی حدیثیں باطل ہیں۔ اور یحییٰ بن سعید اور ابو حاتم نے اس کو ضعیف کہا اور ابو حاتم ونسائی کے نزدیک وہ قوی نہیں ہے، عبد الرحمٰن اس سے کبھی روایت نہیں کرتے ہے[1] پس ان وجوہ کی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ جن پر یہ سب حضرات سکوت فرمائیں اس کی مزید تحقیق وجستجو کی ضرورت ہے، اور اس کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

سنن ابی داؤد پر ابن جوزیؒ کی تنقید

علامہ سیوطی کی رائے یہ ہے کہ سنن ابی داؤد کی نو حدیثیں ایسی ہیں، جن کو ابن جوزی نے موضوع قرار دیا ہے، لیکن علامہ موصوف نے چار روایات کا جواب القول الحسن فی الذب عن السنن میں دیا ہے۔ اور بقیہ کا التعقبات علی الموضوعات میں مگر علامہ ابن جوزی نقد روایات میں متشدد قرار دیئے گئے ہیں، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات میں بہت سی ایسی حدیثوں کو موضوع کہہ دیا ہے جن کے موضوع ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ضعیف ہیں، علامہ ذہبی کی رائے ہے کہ ابن جوزی نے بہت سی قوی اور حسن روایات کو بھی کتاب الموضوعات میں داخل کر دیا ہے[2] شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ ابن جوزی کا نقد روایات میں تشدد اور حاکم کے تساہل نے ان دونوں کی کتابوں کے نفع کو مشکل بنا دیا ہے اس لئے کہ ان دونوں کی کتابوں کی ہر حدیث میں تساہل کا امکان ہے پس ناقل کو ان دونوں سے نقل میں احتیاط کی ضرورت ہے، مجرد ان دونوں کی تقلید مناسب نہیں ہے[3]۔

پس معلوم ہوا کہ علامہ موصوف کا ہر حدیث کے متعلق وضع کا فیصلہ نامناسب

---

[1] تدریب ص۱۰۱ [2] تدریب طبع قدیم ص۱۰۱ [3] التعقباب علی الموضوعات ص۱۰۱

ہے، امام ابو داؤدؒ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے اپنی سنن میں جس کو میں نے لکھا ہے کوئی روایت متروک الحدیث راوی سے نہیں لی ہے، اور اگر کہیں حدیث منکر ہے تو میں نے اس کو بیان کر دیا ہے، اسی طرح اگر کسی حدیث میں ضعف شدید ہے تو اس کی بھی وضاحت کر دی ہے[1]، امام موصوف نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی ہے، جس کے ترک پر سب کا اجماع ہو[2]، امام خطابی جو سنن ابی داؤدؒ کے شارح بھی ہیں ان کا ارشاد ہے کہ اس کتاب میں حسن و صحیح دونوں طرح کی روایات ہیں، باقی سقیم روایات تو اس کے متعدد طبقات ہیں، جن میں سب سے بڑا طبقہ موضوع احادیث کا ہے، پھر مقلوب کا اور اس سے کم تر مجہول کا درجہ ہے، لیکن ابو داؤد کی کتاب ان سب سے خالی ہے بلکہ ان کے وجود سے پاک ہے[3]۔

سنن کے نسخے

سنن ابی داؤد کو متعدد حضرات نے امام موصوف سے روایت کیا ہے لیکن ان میں چار حضرات کے نسخے زیادہ مشہور و معروف ہیں:

(۱) ابو علی محمد بن احمد بن عمرو لؤلؤی المتوفی ۳۴۱ھ کا نسخہ، ہندوستان و بلاد مشرق میں اس کو زیادہ شہرت ہے۔ لؤلؤی کے نسخہ کو اس حیثیت سے ترجیح حاصل ہے کہ انہوں نے کتاب السنن کا سماع محرم ۲۷۵ھ میں کیا ہے، جب کہ امام ابو داؤد نے اس کی آخری املا کرائی تھی، کیونکہ اسی سال بروز جمعہ ۱۶ شوال کو امام موصوف نے سفر آخرت اختیار کیا ہے۔

(۲) ابوبکر محمد بن عبد الرزاق بن داسہ المتوفی ۳۴۵ھ کا نسخہ، ابن داسہ اور لؤلؤی

---

[1] شروط الائمہ ص۵۵ [2] مرقاۃ جلد ۱ ص۲۲ [3] الحطہ ۱۱۶

کے نسخوں میں گو ترتیب کے اعتبار سے کچھ تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے لیکن تعداد احادیث کے لحاظ سے یہ نسخے قریب قریب ہیں البتہ احادیث پر امام ابو داؤدؒ نے جو کلام کیا ہے وہ بعض نسخوں میں زیادہ اور بعض میں کم ہے۔

(۳) حافظ ابو عیسیٰ اسحٰق بن موسیٰ بن سعید رملی المتوفی ۳۱۷ھ کا نسخہ، یہ ابن داسہ کے نسخہ کے قریب قریب ہے۔

(۴) حافظ ابو سعید احمد بن محمد بن زیاد المعروف بہ ابن الاعرابی المتوفی ۳۴۰ھ کا نسخہ، ان کے نسخوں میں کچھ حدیثیں کم ہیں، اس میں کتاب الفتن والملاحم اور بعض اور ابواب ساقط ہیں[1]۔

سنن ابی داؤد کی شروح

سنن ابی داؤدؒ کی اہمیت اور اس کی افادیت کے پیش نظر علماء و محدثین نے اس کے ساتھ پورا اعتنا رکیا، اس کی متعدد شرحیں اور حواشی و مستخرجات لکھے گئے، حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً بائیس شروح و حواشی کا اپنے افادات میں ذکر فرمایا ہے، طوالت کے سبب ان کا تفصیلی تعارف کرانا یہاں مشکل ہے، البتہ چند مشہور و متداول شروح و حواشی یہ ہیں، معالم[1] السنن للخطابی، مرقات[2] الصعود للسیوطی اس کی تلخیص علامہ دمنتی نے کی ہے جو درجات[3] مرقات الصعود کے نام سے مشہور اور رائج ہے، المجتبیٰ[4] للمنذری وتہذیب[5] السنن لابن القیم غایۃ[6] المقصود للشیخ شمس الحق ابی الطیب العظیم آبادی، لیکن اس کا جزء اول ہی صرف طبع ہو سکا ہے، اور اس کی تلخیص ان کے بھائی شیخ محمد اشرف نے کی

---

[1] مقدمہ غایۃ المقصود شرح سنن ابی داؤد ص۶ وافادات حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ

ہے، لیکن آخر کتاب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف ہی نے اپنی شرح کی تلخیص کی ہے یہ عون المعبود کے نام سے چار جلدوں میں چھپ گئی ہے، فتح الودود لسندی، والتعلیق المعبود للشیخ فخر الحسن گنگوہی، بذل المجہود یہ شرح حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی ہے، جو اہل علم میں مشہور و معروف ہے، المنہل العذب المورود، یہ جدید شرح حجاز سے آئی ہے جو نہایت مبسوط ہے، دس جلدوں میں کتاب الحج باب التلبید تک مؤلف پہنچے تھے کہ ان کا سانحہ ارتحال پیش آگیا، اور یہ شرح ناتمام رہ گئی۔

*

امام ترمذیؒ

نام و نسب محمد نام اور ابو عیسیٰ کنیت ہے، قبیلہ بنو سلیم سے تعلق رکھتے تھے، آپ کا پورا نسب یوں بیان کیا جاتا ہے:۔ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ابن موسیٰ بن ضحاک سلمی ترمذی بوغی۔

(لیکن سمعانی نے ان کے نسب نامہ میں بوغی کے بجائے شدآد لکھا ہے[1])

بُوغی۔ قریہ بوغ کی جانب منسوب ہے، اور بعض روایتوں کے مطابق امام ترمذیؒ اسی میں آسودۂ خواب ہیں، یہ ترمذ سے چھ فرسخ کی مسافت پر واقع ہے[2]۔

پیدائش و وفات امام موصوف ۲۰۹ھ میں مقام ترمذ ہی میں پیدا ہوئے، یہ ترمذ ایک قدیم شہر ہے جو دریائے جیحون کے ساحل پر واقع ہے[3]، اس کا تلفظ ترمذ اور تُرمُذ تینوں طریقوں سے ہے، لیکن اہل درس کے یہاں ترِمذ (بالکسر) ہی مشہور رہے۔

آپ کا انتقال مشہور روایت کے مطابق ۲۷۹ھ میں یہیں ہوا۔ آپ

---

[1] کتاب الانساب ص۱۰۶ [2] معجم البلدان جلد ۲ ص۳۸۲ [3] مرقاۃ جلد ۱ ص۲۱

نے ستّر سال کی عمر پائی تھی[1]۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جس دَور میں پیدا ہوئے اس زمانے میں علم حدیث شہرت کے درجے کو پہنچ چکا تھا، بالخصوص خراسان اور ماوراء النہر کے علاقے تو مرکزی حیثیت رکھتے تھے، اور امام بخاریؒ جیسے جلیل القدر محدّث کی مسندِ علم بچھ چکی تھی۔

امام موصوف نے جونہی شعور کی آنکھیں کھولیں، انہیں علمِ حدیث کی تحصیل کا شوق دامنگیر ہوگیا، چنانچہ انہوں نے اس کے حصول کے لئے مختلف حصوں، علاقوں اور ملکوں کا سفر کیا، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں "طاف البلاد وسمع خلقا من الخراسانیین والعراقیین والحجازیین[2]"۔

شیوخ امام ترمذیؒ نے اپنے زمانے کے ہر خرمنِ حدیث سے استفادہ کیا اس لئے ان کے شیوخ کا استقصاء دشوار ہے، علامہ ذہبیؒ نے بخاریؒ، مسلمؒ، علی بن حجر مروزی ہناد بن سری، قتیبہ بن سعید، محمد بن بشار وغیرہ کو ان کے اساتذہ میں شمار کیا ہے، امام ابو داؤدؒ بھی ان کے شیوخ میں سے ہیں، البتہ امام احمد سے سماع ثابت نہیں۔

آپ کے شیوخ میں ایسے حضرات بھی ہیں جن سے اکثر اصحاب صحاح نے استفادہ کیا ہے، علامہ موصوف فرماتے ہیں:۔ "امام مسلمؒ اگرچہ امام ترمذیؒ کے استاد ہیں مگر پوری کتاب میں صرف ایک روایت ان سے مروی ہے اور وہ روایت "أحصوا هلال شعبان لرمضان" والی ہے اگرچہ اس کی حیثیت ایسی ہے کہ جیسے اپنے کسی معاصر سے روایت کی جاتی ہے، کیونکہ دونوں کے بہت سے شیوخ میں اشتراک ہے[3]۔

---

[1] اتحاف النبلاء ص ۳۸۷ [2] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۸۸ [3] تذکرہ جلد ص ۲۰۷

امام بخاریؒ سے امام موصوف کو زیادہ استفادہ کا موقع ملا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں "تفقه فی الحدیث بالبخاری"[1] یہاں تک کہ امام بخاریؒ کے مایۂ ناز تلامذہ میں ان کا شمار ہے، حاکم نے موسیٰ بن علک کا یہ مقولہ نقل کیا ہے: "مات البخاری فلم یخلف بخراسان مثل ابی عیسیٰ فی العلم والحفظ والورع والزهد"[1]۔

خود امام بخاریؒ کو بھی اپنے لائق شاگرد پر ناز تھا، انہوں نے ان کے کمال علم کی ان الفاظ میں سند عطا فرمائی تھی: "ما انتفعت بك اکثر مما انتفعت بی"[2]۔

مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہین شاگرد جب استاد سے سوال کرتا ہے تو اس کی نگاہ دیگر علوم کی طرف جاتی ہے"[3]۔

امام بخاریؒ نے دو حدیثیں امام موصوف سے روایت کی ہیں:-

(۱) کتاب التفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث "فی قول اللہ عزوجل ما قطعتم" کے تحت۔

(۲) حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث "یا علی! لا یحل لأحد ان یجنب فی هذا المسجد غیری وغیرك" (فی باب مناقب علیؓ)

اور ان دونوں کی تخریج کے بعد فرمایا کہ سمع منی محمد بن اسمٰعیل[4]۔

شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "ترمذی شاگرد رشید بخاری است و روش ادرا آموختہ و از مسلم و ابی داؤد شیوخ ایشاں نیز روایت دارد و در بصرہ و کوفہ و واسط و رے و خراسان و حجاز سالہا در علم حدیث بسر بردہ"[5]۔

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۸۹ [2] ایضاً [3] عرف الشذی ص ۲۸

[4] مقدمہ تحفہ ص ۱۲۷ [5] بستان ص ۱۲۰

تلامذہ اوپر گزر چکا ہے کہ امام بخاریؒ کے انتقال کے بعد ابو عیسٰی کے ہم پلہ خراسان میں کوئی محدّث نہیں تھا، اس لئے ان کی ذات مرجع خلائق بن گئی ان کے تلامذہ میں خراسان وترکستان کے علاوہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی ملتے ہیں، چند ممتاز تلامذہ کے نام درج ذیل ہیں۔

ابو حامد احمد بن عبد مروزی، ہیثم بن کلیب شاشی، ابوالعباس احمد محمد بن محبوب المروزی جنہوں نے جامع ترمذی کو امام موصوف سے روایت کیا ہے، احمد بن یوسف نسفی، عبد بن محمد النسفی، محمد بن محمود اور داؤد بن نصر بن سہل بزدوی وغیرہ۔

حافظہ حق تعالےٰ شانہ جب کسی سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس کے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے، امام موصوف کو جس طرح اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا ویسے ہی خداداد قوتِ حفظ بھی عطا کی گئی تھی، ابوسعید ادریسی فرماتے ہیں کہ ابو عیسٰی کی قوت حفظ بھی مثالاً بیان کی جاتی تھی[1]، ان کا ایک حیرت انگیز واقعہ رجال کی سب ہی کتابوں میں مذکور ہے کہ انہوں نے ایک شیخ سے دو جزء کے بقدر بواسطہ حدیثیں سنیں اور قلم بند کیں۔ حسن اتفاق سے کچھ دنوں کے بعد ان شیخ سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے شیخ مذکور سے سماع حدیث کی درخواست کی، شیخ نے سنانی شروع کیں اور امام ترمذیؒ سے فرمایا کہ لکھ لو، ترمذی بیاض لے کر بیٹھ گئے، مگر قلم میں روشنائی نہیں لی تھی یوں ہی بیاض پر قلم چلاتے رہے، شیخ کو شبہہ ہوا کہ یہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ یوں ہی قلم پھیر رہے ہیں، اٹھ کر دیکھا تو بیاض سادہ تھی، بے حد خفا ہوئے اور فرمایا:۔ تم مذاق کرتے ہو، امام ترمذی نے عرض کیا، آپ گھبرایئے نہیں!

---

[1] مقدمہ تحفہ ص ۱۶۷

جتنی حدیثیں آپ نے سنائیں ہیں، سب مجھے یاد ہیں، سن لیجئے، چنانچہ تمام حدیثیں فرفر سنادیں، شیخ کو خیال ہوا کہ شاید یہ ان کو پہلے سے یاد تھیں، انہوں نے باور نہیں کیا، امام ترمذیؒ نے عرض کیا، آپ دوسری حدیثیں سنائیے میں ان کو بھی سنادوں گا، چنانچہ شیخ نے اپنے غرائب الحدیث سے چالیس حدیثیں سنائیں جس کو امام ترمذی نے فوراً دہرا دیا، تب شیخ کو ان کی قوت حافظہ کا یقین ہوا[1]۔

زہد وتقوی حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ دہلوی لکھتے ہیں: "تورع و زہد بجدے داشت کہ فوق آں متصور نیست بخوفِ الٰہی بسیار گریۂ وزاری کرد ونابینا شد"، یعنی زہد وتقوے اس درجہ کا حاصل تھا کہ اس سے زیادہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، اورخوف الٰہی سے بکثرت گریہ وزاری کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، بعض حضرات کی رائے ہے کہ وہ مادرزاد اندھے پیدا ہوئے تھے، لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے[2]۔

تنبیہ شروع میں بتایا جاچکا ہے کہ امام موصوف کا نام محمدؐ اور کنیت ابوعیسیٰ تھی، لیکن انہوں نے اپنے نام کے بجائے اپنی کنیت زیادہ استعمال کی ہے، جیسے فرماتے ہیں:۔ قال ابوعیسیٰ الخ۔ مگر بعض علماء نے اسے مکروہ سمجھا ہے، چنانچہ ابن ابی شیبہ اپنی مصنف میں ترجمۃ الباب لائے ہیں: "باب ما یکرہ للرجل ان یکتنی بأبی عیسیٰ"۔ اور باب کے تحت کی روایت سے کراہت ثابت ہے، لیکن اس کے برخلاف امام ابوداؤدؒ نے کتاب الآداب میں اس کا جواز ثابت کیا ہے "باب ما یکتنی بأبی عیسیٰ"۔ اسلئے علماء نے جن روایتوں سے کراہت ثابت کی ہے ان سب کا جواب دیا ہے۔

---

[1] بستان ص۱۲۱ [2] تہذیب جلد ۹ ص۱۸۸

ایک مغالطہ کا ازالہ ترمذی کے نام سے ائمہ میں تین حضرات مشہور ہیں، اسی لئے اکثر لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے، حالانکہ درجات مختلف ہیں۔

(۱) امام ابو عیسیٰ ترمذی صاحب سنن ہیں۔

(۲) ابو الحسن احمد بن حسن ہیں، یہ ترمذی کبیر کے لقب سے مشہور ہیں، اور امام احمد کے تلامذہ میں سے ہیں، نیز امام ترمذی صاحب سنن و امام بخاری و ابن ماجہ کے شیوخ ہیں۔

(۳) حکیم ترمذی صاحبؒ "نوادر الاصول" ہیں۔

شاہ عبد العزیز صاحبؒ بستان میں فرماتے ہیں کہ نوادر کی اکثر روایات ضعاف اور غیر معتبر ہیں[1]۔

تصانیف امام ترمذیؒ نے بکثرت تصانیف کی ہیں، آپ کو فقہ اور تفسیر پر بھی کافی دستگاہ حاصل تھی جو ان کی سنن سے ظاہر ہے، ان کی مختلف کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے (۱) العلل (۲) المفرد (۳) التاریخ (۴) الزہد (۵) الشمائل[2] (۶) الاسماء والکنیٰ[3]، البتہ ابن ندیم نے کتاب التاریخ کا اضافہ کیا ہے[4]۔ اس میں شمائل و علل صغریٰ

---

[1] بستان المحدثین صفحہ ۱۲۰ [2] شمائل میں مصنف نے چار سو حدیثیں جمع کی ہیں، اور چھپن ۵۶ بابوں پر منقسم ہے، اس کی مختلف لوگوں نے شرحیں لکھی ہیں (۱) جمع الوسائل، لملا علی قاریؒ (۲) مواہب لدنیہ للمنادی شیخ ابراہیم بیجوری اور مولانا احمد علی صاحبؒ کا حاشیہ زیادہ مقبول ہیں، اور ان سب شروح اور دیگر کتب احادیث کی شروح کا خلاصہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شمائل کے ترجمہ خصائل نبوی کے حاشیہ پر جمع کر دیا ہے۔ [3] تدریب صفحہ ۲۶۰ [4] فہرست صفحہ ۲۲۵

دونوں مطبوعہ ہیں، البتہ علل کبریٰ نایاب ہے، انہوں نے علل پر بھی دو کتابیں لکھی ہیں۔

جامع الترمذی

حدیث کی جس کتاب میں آٹھ قسم کے مضامین بیان کئے جائیں اس کو جامع کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اور وہ آٹھ قسم کے مضامین جامع یہ ہیں :-

(۱) سیر (۲) آدابِ (۳) تفسیر (۴) عقائد (۵) فتن و (۶) احکام (۷) اشراط (۸) مناقب۔

اور چونکہ "ترمذی" ان آٹھوں قسم کے مضامین پر مشتمل ہے، اس لئے اس کو جامع کہا جاتا ہے اور چونکہ ترتیبِ فقہی کے اعتبار سے بکثرت احکام کی حدیثیں لائے ہیں، اس لئے سنن کا اطلاق بھی ہوتا ہے، چنانچہ پہلے کتاب الطہارت لاتے ہیں اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ پھر زکوٰۃ وصوم وغیرہ۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ حاکم وخطیبؒ نے بھی اسے الجامع کہا ہے، مگر ترمذی کو حاکمؒ کا صحیح کہنا اور نسائیؒ وترمذیؒ کو خطیبؒ کا صحیح کہنا فی الواقع ان کے نزدیک تساہل ہے[1]۔

لیکن فی الواقع اس کو تساہل قرار دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ باعتبارِ اغلب کے صحیح کہا جاسکتا ہے جیسے صحاح ستہ کہنا باعتبارِ اغلبیت کے ہے، نیز امام ترمذیؒ خود بھی اس کو "صحیح" فرماتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں :- صنّفتُ هذا المسند الصحیح (وكذا قال ابن كثير فی تاریخه)۔

سنن ترمذی کے محاسن وفضائل

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کتاب کو لکھ کر میں نے علماءِ حجاز کے سامنے پیش کیا تو

---

[1] تدریب ص۵۴

انہوں نے اس کو بہت پسند فرمایا، اور علماء خراسان کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے بھی داد تحسین دی، پس جس گھر میں یہ کتاب ہو گویا اس میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم گفتگو فرما رہے ہیں[۱]۔

شیخ ابراہیم بیجوری کا یہ مشورہ ہر طالب حدیث کیلئے ہے کہ :- الجامع الصحیح کا مطالعہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ کتاب حدیث و فقہی فوائد اور سلف و خلف کے مذاہب کی جامع ہے پس یہ مجتہد کیلئے کافی ہے اور مقلد کیلئے بے نیاز کرنے والی ہے، میرے خیال میں مجتہد کیلئے تو کافی ہو سکتی ہے لیکن مقلد کیلئے کافی نہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں: "ترمذی کی جامع ان کی کتابوں میں سب سے بہتر تصنیف ہے، بلکہ متعدد وجوہ سے جمیع حدیث سے احسن ہے۔

(۱) اس میں حسنِ ترتیب اور عدم تکرار ہے۔

(۲) فقہاء کے مذاہب کا ذکر ہے، نیز ہر مذہب والوں کے وجوہ استدلال بھی ہیں۔

(۳) حدیث کے انواع صحیح و حسن، ضعیف، غریب، معلل وغیرہ بھی بیان کئے ہیں۔

(۴) اسی طرح راویوں کے اسماء و القاب اور ان کی کنیتیں نیز دیگر فوائد جو علم رجال سے متعلق ہیں اس پر بھی خاصی گفتگو ہے[۲]۔

شیخ ابن صلاح کا فیصلہ ہے :- کتاب ابی عیسٰی اصل فی معرفۃ الحسن[۳]۔

حافظ محمد بن طاہر مقدسی نے ذکر کیا کہ امام ابو اسمٰعیل عبداللہ بن محمد انصاری کے سامنے ہرات میں امام ترمذیؒ اور ان کی کتاب کا ذکر آیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کی کتاب میرے نزدیک بخاری و مسلم سے زیادہ انفع ہے، کیونکہ بخاری و مسلم سے فائدہ صرف عالم متبحر ہی اٹھا سکتا ہے اور ابو عیسٰی کی کتاب سے ہر شخص مستفید ہو سکتا ہے۔

---

[۱] تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۸ [۲] بستان ص ۱۲۰ [۳] تدریب ص ۵۵

ترمذی کی غرض

ہر محدث نے جمع حدیث کیلئے اپنی کتاب میں کچھ خاص چیزیں بطور غرض و مقصد کے پیش نظر رکھی ہیں، امام ترمذیؒ کا مقصودِ اعظم بیان مذاہب ہے، مع الاستدلال۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے فرمایا۔

"ابوعیسیٰ ترمذیؒ نے گویا شیخین کے طریقے کو جو ابہام وتبیین کا راستہ تھا اور ابوداؤدؒ کی راہ جو فقہاء کے مستدلات کا بیان تھا اس کو نہایت عمدگی سے جمع کرکے پیش کیا بلکہ دونوں راستوں کو جمع کر دیا ہے اور مزید براں صحابہؓ وتابعین وفقہاء کے مذاہب کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے، حقیقت میں انہوں نے بہت ہی جامع کتاب لکھی ہے، اسی طرح حدیث کے طرق کو بھی نہایت لطیف طریقہ سے مختصر کیا ہے بس ایک حدیث کو ذکر کر دیا اور اسی باب میں اس کے ماسوا کی طرف اشارہ کر دیا اور ہر حدیث کی حیثیت بیان کر دی کہ آیا صحیح ہے یا حسن ہے، ضعیف ہے یا منکر اور حدیث کے ضعف کو بھی بیان کیا تاکہ طالبِ حدیث کو بصیرت حاصل ہو جائے، قابلِ عمل اور ناقابلِ عمل میں امتیاز ہو جائے، پھر حدیث کا مستفیض وغریب ہونا بھی بیان کیا پھر صحابہؓ وفقہاء امصار کے مذاہب بھی بیان کئے گئے ہیں[1]"

لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذیؒ کا مقصودِ اعظم بیان مذاہب ہے، امام ترمذیؒ کا صحابہؓ وتابعین کے مذاہب کو بیان کرنا احکام کی بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے، اسی طرح امام موصوف نے ان مذاہب کو بھی بیان کیا جو کہ متروک ہو چکے ہیں، جیسے امام اوزاعی، سفیان ثوری، اسحاق بن ابراہیم مروزی وغیرہ کے مذاہب جس سے ترمذی کے واسطہ کے بغیر واقفیت ناممکن ہے[2]۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ صفحہ ۱۲۱ [2] ازافادات مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ

ترمذی کا مسلک

حضرت شاہ صاحبؒ (مولانا انور شاہ کشمیریؒ) نے شافعی کہا ہے[1]، لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ امام بخاریؒ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، اس لئے ان پر بھی مجتہدانہ رنگ غالب ہے، اور حضرت شاہ ولی اللہ محدّث رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :۔ " وکان اھل الحدیث قد ینسب الی احد المذاھب لکثرۃ موافقتہ[2]۔

یعنی محدثین کا کسی امام کی کثرت موافقت کی وجہ سے اسی مذہب کی طرف انتساب کیا جاتا ہے، مطلب یہ کہ انہوں نے ان کے اصول کے مطابق اجتہاد و استخراج مسائل کیا ہو اگر کوئی جزئی اختلاف ہو جائے تو ایسا ممکن ہے اور اس طرح کا اختلاف مسلک شافعی میں داخل ہونے کے لئے قادح نہیں[3]، چنانچہ امام ترمذیؒ نے بھی امام شافعیؒ سے بعض مسائل میں اختلاف کیا جیسے باب تاخیر الظہر فی شدۃ الحرّ اس طرح کی مخالفت ان کے مذہب شافعی کی طرف منسوب کرنے میں قادح نہیں، جب کہ اکثر مسائل میں ان کے مقلّد ہیں، لیکن بعض حضرات نے امام ترمذیؒ کی خاص اصطلاح "عند اصحابنا" سے استدلال کیا ہے کہ وہ مجتہد مطلق تھے اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ " امام فرماتے ہیں :۔ " والعمل علیٰ ھذا عند اصحابنا وعند الشافعی واحمد واسحٰق۔"

اسی طرح "باب المحاقلہ" میں فرمایا :۔ " ھو قول الشافعی واصحابنا۔"
اس سے ثابت ہوا کہ وہ حنبلی و شافعی نہیں تھے، لیکن اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ اس سے محدثین ہی کی ایک جماعت مراد ہے، چنانچہ شیخ سراج اور علامہ سندھی دونوں

---

[1] عرف الشذی ص۴ [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص۱۲۲ [3] لامع ص۲۴

نے محدثین ہی کی جماعت مراد لیا ہے، تو اوپر شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مقولہ گزر چکا ہے کہ محدثین کی جماعت کا کسی نہ کسی امام کی طرف انتساب تھا، اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذیؒ کا مسلک "شافعی" کی طرف انتساب کرنا درست ہے۔

امام ترمذیؒ کی جرح وتعدیل کی حیثیت

آپؒ کا یہ خاص امتیاز ہے کہ وہ روایت پر پوری طرح جرح وتعدیل سے کام لیتے ہیں. کیونکہ اس فن میں انہیں رسوخ حاصل تھا، جیساکہ ان کی کتاب السنن اور "کتاب العلل" کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے لیکن روایت کی تحسین وتصحیح میں بعض جگہ ان سے تساہل واقع ہوا ہے۔

ملا علی قاریؒ نے کہا: "عنده نوع من التساهل فی التصحیح لا یضره"[1] (امام ترمذیؒ تصحیح روایت میں تساہل واقع ہوئے ہیں لیکن فی الواقع یہ کچھ نقصان دہ نہیں)، آگے چل کر ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں واطلق الحاکم والخطیب الصحة علیٰ ما جمع فی سنن الترمذی۔ لیکن علامہ سیوطی نے حاکم اور خطیب کے فیصلہ کو بھی تساہل قرار دے دیا ہے۔

علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں: "ترمذی کا درجہ ابو داؤدؒ اور نسائی کے بعد رکھا جائے گا اس لئے کہ انہوں نے مصلوب وکلبی جیسے لوگوں کی روایات کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے"[2]۔

اسی طرح علامہ موصوف نے کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزنی کے ترجمہ میں لکھا ہے: "قال ابن معین لیس بشئ وقال الشافعی رکن من ارکان

---

[1] مرقاۃ جلد ا صلا ۲۱ [2] تدریب ص۵۶

الکذب وضرب احمد علے حدیثه الخ"۔اس کے باوجود امام ترمذیؒ نے اس کی حدیث کی تخریج کی ہے وہ حدیث یہ ہے :۔" الصلح جائز بین المسلمین " اور اس کی تصحیح کی ہے، لہٰذا علماء ترمذی کی تصحیح پر اعتماد نہیں کرتے، نیز اسی طرح یحییٰ بن یمان کے ترجمہ میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ترمذیؒ نے اس کی تحسین کی ہے حالانکہ اس میں تین رواۃ ضعیف ہیں، وہ حدیث یہ ہے:" ان النبی صلی اللہ علیه وسلم دخل قبرا لیلا فاسرج له سراج "

اس روایت کے ذیل میں علامہ زیلعی فرماتے ہیں :" امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو روایت کر کے اس کو حدیث حسن کہا ہے حالانکہ ان کا یہ فیصلہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس حدیث کا مدار حجاج بن ارطاۃ پر ہے اور یہ مدلس ہے اس نے سماع کا کہیں ذکر نہیں کیا، دوسری وجہ یہ ہے کہ ابن قطان فرماتے ہیں کہ اس کے ایک راوی منہال بن خلیفہ کی ابن معین نے تضعیف کی ہے، اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں" فیه نظر"[1]

اس سے ثابت ہوا کہ امام موصوف نقد روایات میں متساہل واقع ہوئے ہیں، بہرحال ان کے فیصلہ پر تحقیق وجستجو کے بعد ہی عمل کیا جائے گا، لیکن ان کا تساہل حاکم کے تساہل سے مختلف ہے۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:" قیل ان تصحیحه (الحاکم) دون تصحیح الترمذی والدارقطنی بل تصحیحه کتحسین الترمذی واحیانا یکون دونه" یعنی حاکم کی تصحیح ترمذی و دارقطنی کی تصحیح سے کم حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ ترمذی کی تحسین کے درجہ پر رکھی جا سکتی ہے اور کبھی اس سے بھی کم حیثیت دی جائے گی"[2]

---

[1] نصب الرایہ جلد ۱ ص ۳۶۳ [2] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۷۳

علامہ ابنِ حزم کی تنقید کا جواب

امام موصوف کی ثقاہت وجلالت شان کے باوجود بھی بعض محدثین نے ان پر تنقید کی ہے جس میں سب سے زیادہ حیرت انگیز علامہ ابنِ حزم کی تنقید ہے اور کہہ دیا کہ "ترمذی مجہول ہیں"، جس کو جمہور محدثین نے رد کر دیا ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ "ابو عیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے ان کے بارے میں ابن حزم کا یہ قول کہ "وہ مجہول" ہیں ناقابل توجہ ہے، درحقیقت ابن حزم ان کی کتاب جامع وعلل سے واقف ہی نہ تھے"[1]

حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں: "ابن حزم نے کتاب الفرائض من الایصال[عہ] میں محمد ابن عیسیٰ کو مجہول لکھا ہے، لیکن یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس کو حفظ اور تصانیف کی خبر نہ ہو، ابن حزم نے اس قسم کے الفاظ بعض اور ثقات کے متعلق لکھتے ہیں حالانکہ وہ ساری مخلوق میں مسلّم اور مشہور ہیں"[2]

علامہ ذہبیؒ نے سیر النبلاء میں نہایت عمدہ بات لکھ دی ہے کہ ابن حزم نے بہت سی کتب احادیث کا تذکرہ کیا ہے لیکن سنن نسائی اور ابن ماجہ اور جامع ترمذی کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے، کیونکہ یہ کتابیں انہوں نے دیکھی ہی نہ تھیں، ان کی وفات کے بعد اندلس میں داخل ہوئیں، اسی طرح حافظ بیہقیؒ کے پاس بھی یہ کتابیں موجود نہ تھیں[3]

مُلّا علی قاریؒ کا تسامح

علامہ سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں لکھا کہ "سنن

---

[1] میزان الاعتدال جلد ۳ ص۱۱۷ [2] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۳۸۸ [3] ما تمس الیہ الحاجۃ ص۲۵

عہ فی التہذیب "الاتصال" وہو تصحیف۔

ترمذی میں ایک سوا کیاون عنوان کتب ہیں اور ہر کتب کے تحت سیکڑوں ابواب ہیں اور اس کتاب میں ایک روایت ثلاثی بھی ہے" لیکن ملا علی قاریؒ سے یہاں تسامح ہوگیا، مرقاۃ جلد اول صفحہ ۲۱ پر رقم طراز ہیں" جامع ترمذی کو صحاح کے درمیان ایک خصوصیت یہ حاصل ہے کہ اس کی ایک حدیث ثنائی ہے اور وہ یہ ہے" یاتی علی الناس زمان الصابر فیھم علی دینہ کالقابض علی الجمر فاسنادہ اقرب من اسناد البخاری ومسلم وابی داؤد فان لھم ثلاثیات"[1]

امام ترمذیؒ نے اس کو کتاب الفتن میں روایت کیا ہے، پوری اسنادیوں ہے "حدثنا اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری بن ابنۃ السدی الکوفی نا عمر بن شاکر عن انس بن مالکؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخ" آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک تین واسطے ہیں، اسمٰعیل بن موسیٰ، عمر بن شاکر اور انس بن مالکؓ پس اس کی سند ثلاثی ہے نہ کہ ثنائی۔

جامع صحیح کی معمول بہا احادیث

امام ترمذیؒ نے کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۶ پر یہ دعویٰ کیا ہے" میری اس کتاب کی ساری احادیث معمول بہا ہیں اور ہر ایک پر اہل علم میں سے کسی نہ کسی کا عمل ضرور ہے سوائے دو کے۔

(۱) حدیث ابن عباسؓ، أن النبی صلے اللہ علیہ وسلم جمع بین الظھر والعصر بالمدینۃ والمغرب والعشاء من غیر خوفٍ ولا مطرٍ ولا سفرٍ۔

(۲) دوسری حدیث :- عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من شرب الخمر فاجلدوہ فان عاد فی الرابعۃ فاقتلوہ۔

---

[1] مرقاۃ جلد اول ص ۲۱

لیکن فی الواقع ان دونوں حدیثوں پر بھی بعض اہلِ علم کا عمل ہے، حنفیہ حدیث اول کو جمع صوری، اور حدیث ثانی کو سیاست پر محمول کرتے ہیں، اگر امیر المومنین مصلحت سمجھے تو چوتھی بار قتل بھی کر سکتا ہے، غرض یہ ہے کہ احناف کے یہاں ان دونوں پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

جامع ترمذی کی بعض کتابی خصوصیات

تمام محدثین کی کتابوں میں کچھ علیٰحدہ علیٰحدہ خصوصیتیں موجود ہیں، صحاح ستّہ کے مصنفین میں سے ہر ایک نے اپنی جگہ یہ کوشش کی ہے کہ "اس کی کتاب میں کوئی نئی اور مفید بات موجود ہو، جو کہ اسے دیگر کتب سے ممتاز کر سکے"۔

اس کی تفصیل ہر ایک کے حالات کے ساتھ کی جائے گی، فی الحال ہمارے پیشِ نظر امام ترمذیؒ کی سنن کی خصوصیات کا بیان کرنا ہے، جس کا جاننا ایک طالب علم کے لئے ازحد ضروری ہے:۔

(۱) کبھی امام ترمذیؒ ترجمۃ الباب کسی صحابی کی مشہور حدیث سے منعقد کرتے ہیں جس کی سند ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہے اور اس حدیث کی صحاح ستہ کے مولفین نے بھی تخریج کی ہوتی ہے لیکن اس ترجمہ کے تحت اس حکم کو دوسرے صحابی کی حدیث غیر معروف سے ثابت کرتے ہیں اگرچہ اس کی اسناد حدیث منعقد ترجمہ سے کم درجہ کی ہوتی ہے، لیکن اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں فی الباب عن فلان وفلان الخ اور پوری ایک جماعت کا تذکرہ کر دیتے ہیں، جس میں اس صحابی کا نام لے لیتے ہیں جس کی حدیث سے ترجمہ منعقد کیا تھا، اس کا فائدہ یہ ہے کہ حدیث غیر مشہور سے واقفیت بھی ہو جاتی ہے، اور اگر اس میں کوئی علتِ خفیّہ ہے تو اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں، اسی

طرح متن کی کمی وزیادتی کو بھی بیان کر دیتے ہیں[۱]۔

(۲) ان کی عادت یہ ہے کہ فی الباب عن فلان وفلان کہتے ہیں یعنی بہت سے صحابہؓ کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی عن فلان عن ابیہ کہتے ہیں اور اس میں متعدد باتیں ان کے پیشِ نظر ہوتی ہیں، کبھی تو یہ بتانا ہوتا ہے کہ ان صحابی کے صرف بیٹے ہی نے ان سے روایت کی ہے اور کبھی صحابی کے نام میں اختلاف ہوتا ہے تو بیٹے کا نام التباس دور کرنے کیلئے بیان کر دیتے ہیں، لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں کیونکہ صحابی کے غیر معروف ہونے کی وجہ سے بھی ایسا کر دیتے ہیں۔

(۳) عام طور پر جس صحابی کی روایت باب کے تحت لاتے ہیں پھر فی الباب میں اس کا تذکرہ نہیں کرتے مثلاً باب کے تحت اگر حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث لائے تو فی الباب عن ابی ہریرہؓ نہیں کہیں گے، البتہ چند جگہیں مستثنیٰ ہیں مثلاً باب الرکعتین اذا جاء الرجل والامام یخطب۔ اس باب میں حضرت جابرؓ کی روایت نقل کی ہے اور دوبارہ پھر فی الباب عن جابر کہا ہے حافظ عراقی فرماتے ہیں: "ممکن ہے حضرت جابرؓ کی دوسری روایت کی طرف اس باب میں اشارہ کر رہے ہوں[۲]"۔

(۴) اسی طرح حدیث طویل کو مختصر کر کے آخر میں فرماتے ہیں فیہ قصّة و فیہ کلام اکثر من ھٰذا۔

(۵) اسمائے مشترکہ کے درمیان تمیز کرتے ہیں جیسے یزید الفارسی ویزید الرقاشی اسی طرح ان کنیتوں کے درمیان جن میں اشتراک ہوتا ہے اس کے فرق کو بھی ترمذی واضح کر دیتے ہیں، جیسے ابوحازم الزاھد، ابوحازم الاشجعی پہلے کا نام سلمہ

---

[۱] نفع قوت المقتدی جلد ۱ ص۸ [۲] تدریب ص

ابن دینار مدنی اور دوسرے کا نام سلمان کوفی ہے، مطلب یہ ہے کہ جہاں کسی طرح کا غموض وخفاء ہوتا ہے وہاں لازمی طور پر اس کو واضح کر دیتے ہیں۔

(۶) اسی طرح سے باب بلا ترجمہ کے لاتے ہیں اور اس میں کسی حدیث کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں فی الباب عن فلان۔ اس کے ذریعہ سے اس مضمون کی دوسری روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، نیز باب بلا ترجمۃ سے کسی ایسے مسئلہ کی طرف تنبیہ کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق ماقبل کے ترجمۃ الباب سے ہے جیساکہ ان کے شیخ امام بخاریؒ کا طرز عمل اور طریقہ کار ہے۔

(۷) اسی طریقے سے ترجمہ کے تحت حدیث لانے کے بعد کہتے ہیں فی الباب عن فلان یعنی کسی دوسرے صحابی کا یہاں ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد اسی صحابی سے روایت نقل کرتے ہیں جس کی حدیث کی طرف فی الباب میں اشارہ کیا گیا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابی کی یہی حدیث مراد ہے جس کو بعد میں ان سے روایت کر رہے ہیں مثلاً باب زکوٰۃ البقر میں حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کے بعد فرماتے ہیں وفی الباب عن معاذ بن جبلؓ اور پھر اس کے بعد حضرت معاذؓ سے تقریباً اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے جو ابن مسعودؓ کی روایت میں تھا۔

(۸) اسی طرح ترجمہ کے تحت میں کبھی دو مرتبہ وفی الباب عن فلان کہتے ہیں، جیسے باب اکل لحوم الجلالۃ میں پہلے ابن عمرؓ کی روایت کو لے آئے ہیں اور پھر کہا وفی الباب عن ابن عباسؓ اور ابن عباسؓ کی پوری روایت نقل کر دی ہے اور اس کی تصحیح وتحسین کے بعد فرماتے ہیں وفی الباب عن

ابن عمرؓ اور روایت نہیں نقل کی۔ بظاہر دوبارہ فی الباب کہنے سے ان کی غرض یہ ہے کہ حدیث اوّل کے ہم معنیٰ ابن عمرؓ سے دوسری روایت بھی موجود ہے۔ کما فی ابی داؤد وغیرہ۔

(۹) عام طور پر اکثر ابواب میں خصوصاً احکام کی حدیث میں ایک ہی حدیث کے درج کرنے پر اکتفا رکیا ہے اور اس حدیث کے دیگر طرق یا اس باب کی دیگر روایات کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اس لئے احکام کی احادیث کی تعداد ان کی کتاب میں بہت کم ہے لیکن اس کا تدارک فی الباب عن فلاں کے ذریعہ کر دیتے ہیں، یہ ترمذیؒ کی ایسی خصوصیت ہے جس کی محدثین کی نظر میں بہت اہمیت ہے کیونکہ اس کے ذریعہ اس حدیث یا اس مضمون کے روایت کرنے والے صحابہؓ کی تعداد معلوم ہو جاتی ہے اور اس میں ایسا استیعاب کیا ہے جس کی تخریج کے لئے ہزاروں صفحات بھی ناکافی ہوں گے حافظ ابن حجرؒ کی اس میں مستقل تصنیف ہے اللباب فیما یقول الترمذی فی الباب، جو مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس میں مصنف نے تخریج روایات کے علاوہ پوری طرح جرح و تعدیل سے کام لیا ہے، فی الباب سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ امام ترمذیؒ نے جن رواۃ کے اسمار کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لوگ بعینہٖ اسی متن کو روایت کر رہے ہیں۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: "کہ اس سے وہ حدیث معین مراد نہیں ہوتی بلکہ اس کے ہم معنیٰ دیگر روایات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، چنانچہ علامہ عراقیؒ کا کہنا ہے کہ کبھی وہی حدیث معین ہی مراد ہوتی ہے اور کبھی اس مضمون کی دیگر روایات کی طرف اشارہ ہوتا ہے[۱]"

---

[۱] تدریب ص۸۳

(۱۰) کبھی ترجمہ کے تحت احادیث غریبہ کو لاتے ہیں اور اسی باب کی دیگر روایاتِ صحیحہ کی طرف "فی الباب" سے اشارہ کر دیتے ہیں، اگرچہ امام ترمذیؒ کے تخریجِ روایت کی شرطیں شیخین و ابوداؤد اور نسائی سے کم درجہ رکھتی ہیں، لیکن صحت وضعف اور عللِ حدیث پر بھی تنبیہ کرکے اس کی تلافی کر دیتے ہیں۔

حافظ ابن رجب حنبلی نے شرحِ علل ترمذیؒ میں تحریر فرمایا ہے کہ امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں حدیث صحیح وحسن اور غریب کو بیان کیا ہے جن میں بعض مناکیر بھی ہیں، خصوصاً فضائل میں، لیکن ساتھ ہی اس کی صحت وضعف کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں، لیکن علامہ حازمیؒ فرماتے ہیں کہ اگر حدیث ضعیف یا طبقہ رابعہ کی ہوتی ہے تو اس کے ضعف پر تنبیہ کر دیتے ہیں اور اس صورت میں یہ روایت ان روایاتِ صحیحہ فی الباب کے لئے بمنزلہ شاہد ومتابع کے بن جاتی ہیں، اور امام ترمذیؒ کا اعتماد حقیقت میں وہی روایاتِ صحیحہ ہی ہوتی ہیں جو جمہور کے نزدیک بھی صحیح ہیں[۱]۔

(۱۱) امام ترمذیؒ کی عادت ہے کہ عام طور پر دو طرح کے تراجم قائم فرماتے ہیں، ایک ترجمہ سے اہلِ حجاز جس میں عام طور پر امام شافعی مراد ہوتے ہیں ان کے مسلک کی تائید مقصود ہوتی ہے، اور دوسرے ترجمہ سے اہل عراق جس میں عام طور پر امام ابوحنیفہؒ ہوتے ہیں، اس سے ان کے مسلک کی تائید فرماتے ہیں[۲]۔

(۱۲) امام ترمذیؒ حدیث کی صحت اور حسن کا فیصلہ صادر کرنے کے بعد فرماتے ہیں "والعمل علیٰ هذا عند اهل العلم أو اكثر اهل العلم أو عند بعض اهل العلم" اس کے ذریعہ سے فقہاء کے مذاہب کا علم ہو جاتا ہے، اور بعض ایسے فقہاء

---

[۱] شروط الائمہ ص۴۴ [۲] عرف الشذی

کا مسلک معلوم ہوتا ہے جن سے واقفیت امام ترمذیؒ کے واسطہ کے بغیر مشکل ہے۔

(۱۳) اسی طرح امام ترمذیؒ جب کسی حدیث کو حسن یا غریب کہتے ہیں تو عام طور پر ان دونوں میں سے جو وصف غالب ہوتا ہے اس کو مقدم کرتے ہیں، جیسے باب ماجاء فی الاربع قبل العصر[1] اس باب کے تحت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت "رحم اللہ امرءً اصلی أربعًا الخ۔ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں" ھذا حدیث حسنٌ غریبٌ" علامہ عراقی کی رائے ہے کہ حسن وغرابت میں جو وصف غالب ہوتا ہے اس کو مقدم فرماتے ہیں، پس ابن عمرؓ کی یہ حدیث صرف ایک ہی سند سے مروی ہے، لیکن حسن کا وصف غالب ہے، اسی ضابطہ کو مصنف نے یہاں بھی ملحوظ رکھا ہے[2]۔

امام ترمذیؒ کی مشہور اصطلاحات

امام ترمذیؒ نے اپنی کتاب میں بعض ایسی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے جس کا تعلق عام طور پر جرح وتعدیل یا بیانِ مذاہب وغیرہ سے ہے، ہم ان میں سے صرف چند کو بیان کریں گے جس کی کتاب میں زیادہ اہمیت ہے، چنانچہ امام موصوفؒ بکثرت فرماتے ہیں " ھذا حدیث صحیحٌ حسنٌ" کبھی حسنٌ صحیحٌ کہتے ہیں، اور کبھی ھذا حدیث حسنٌ صحیحٌ غریبٌ فرماتے ہیں، حالانکہ کسی ایک حدیث میں ان تینوں اوصاف یا ان میں سے دو کا اجتماع نہیں ہوسکتا، وفی الواقع یہ اشکال اس وقت پیدا ہوگا جب حدیث کی مشہور اصطلاحی تعریف مراد لی جائے، لیکن امام ترمذیؒ خود مجتہد ہیں، چنانچہ حدیث حسن کی تعریف جمہور کے خلاف یوں کی ہے کہ "حسن وہ حدیث ہے جس کا کوئی راوی متہم نہ ہو، وہ روایت شاذ نہ ہو اور متعدد طرق سے

---

[1] جامع الترمذی جلد ۱ ص ۵۷ [2] تدریب ص ۵۵

مروی ہو[۱]۔ لیکن علامہ سیوطیؒ نے ابن سید الناس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ امام ترمذیؒ نے حسن کی محض ایک قسم کی تعریف کی ہے، اور اس کی صراحت امام موصوف نے کتاب العلل میں کردی ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ یہ امام ترمذیؒ کی خاص اصطلاح ہے[۲]۔ بہرکیف جمہور کے قول کے مطابق بھی حسن وصحیح کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ایک حدیث ایک محدث کی تحقیق میں صحیح ہے اور دوسرے کے نزدیک حسن ہے یا اس کے برعکس، اسی طریقے سے ایک شخص کے نزدیک ایک ہی حدیث حسن لذاتہ ہے اور دوسرے کے نزدیک حسن لغیرہ، یا ایک حدیث دو اسانید سے مروی ہے ایک کے اعتبار سے حسن اور دوسرے کے اعتبار سے صحیح ہو[۳]۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں، عموماً ایک حدیث کی سند میں مجتہد کو تردد ہوتا ہے کہ آیا راوی میں شرائط حسن کے ہیں یا صحیح کے ہیں، پس مجتہد نے دونوں بیان کردیا، اور کثرت استعمال کی وجہ سے "أو" گر گیا، اور اصل عبارت یوں ہوگی، حدیثٌ حسنٌ أو صحیحٌ[۴]۔ نیز اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں، بعض لوگوں نے حسن وصحیح کے لغوی معنی مراد لئے ہیں لیکن یہ دونوں باتیں امام ترمذیؒ کی شان سے بعید ہیں[۵]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح حسن وصحیح کے اجتماع میں کوئی دشواری نہیں اسی طرح غریب وحسن کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں، اس لئے کہ امام ترمذیؒ نے حسن کی تعریف میں تعددِ طرق کا لحاظ کیا ہے جو ان کی اپنی اصطلاح ہے پس جہاں وہ حسنٌ غریبٌ کہتے ہیں وہاں ان کی خاص تعریف

۱؎ کتاب العلل ص ۲۴۰ ۲؎ تدریب الراوی ص ۱۵۱ ۳؎ مقدمہ اصول حدیث از شیخ عبدالحقؒ

۴؎ شرح نخبۃ الفکر ص ۲۴ ۵؎ کوکب جلد ۱ ص ۱۱

مراد ہوتی ہے[1]۔

لفظ کراھیۃ وکراھۃ کا مطلب

امام ترمذیؒ کے یہ چند مخصوص الفاظ ہیں، ان دونوں کو بکثرت استعمال فرماتے ہیں۔ چنانچہ باب کراھیۃ الاستنجاء بالیمین، باب فی کراھیۃ الصلوٰۃ بعد العصر وبعد المغرب عام طور پر کراہت سے مکروہ تنزیہی وخلاف اولیٰ ہی مراد لیا جاتا ہے لیکن امام ترمذیؒ نے کبھی اس سے ایک عام معنی مراد لئے ہیں جو تحریمی وتنزیہی دونوں کو شامل ہیں، جیسے ترجمہ ہے باب ما جاء فی کراھیۃ الاقعاء بین السجدتین یہاں اقعاء کی دونوں صورتوں کو مراد لیا ہے، حالانکہ اقعاء کی ایک صورت تحریمی کی ہے اور دوسری تنزیہی کی ہے، اور کبھی کراہت سے کراہت تحریمی ہی مراد لی ہے، جیسے باب ما جاء کراھیۃ ان یبادر الامام فی الرکوع والسجود امام سے مسابقت بالاتفاق حرام ہے، اور کبھی کراہتِ تنزیہی ہی کو مراد لیا ہے، جیسے باب الاذان بغیر اجر یہاں کراہتِ تنزیہی مراد ہے۔

کیونکہ ان دونوں میں تفریق سلف کے نزدیک نہیں تھی، اور عام طور پر لفظ کراہت سے مکروہ تحریمی ہی مراد لیا کرتے تھے، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں " المتقدمون یطلقون الکراھۃ ویریدون کراھۃ التحریم[2]"۔

البتہ دونوں میں تفریق متاخرین فقہاء نے عوام کی سہولت کے پیش نظر قائم کی ہے، علامہ ابن قیمؒ نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے، فرماتے ہیں متاخرین نے مکروہ

---

[1] مقدمہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ [2] عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۳۸۷

تنزیہی وخلاف اولیٰ کی اصطلاح ایجاد کی ہے، اور اب لفظ کراہت سے تنزیہی کے معنی مراد لئے جاتے ہیں[1]۔

بعض اہل کوفہ سے کون لوگ مراد ہیں؟

امام ترمذیؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک صراحت کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا، حالانکہ جہاں اہل کوفہ کا مسلک نقل کرتے ہیں ان کے ساتھ اکثر حنفیہ ہی مراد لیا ہے اس لئے عام طور پر یہ مشہور ہے کہ مصنف نے جہاں کہیں لفظ اہل کوفہ لکھا ہے اس سے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ مراد ہیں، شیخ سراج لکھتے ہیں کہ جہاں کہیں امام موصوفؒ نے اہل کوفہ کا تذکرہ کیا ہے اس سے مراد امام ابوحنیفہؒ ہیں اور ایسا امام صاحبؒ کی شان میں غایت تعصب سے کیا ہے[2]۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ امام ترمذیؒ کو ائمہ مجتہدین کے ساتھ ایک طرح کا تعصب تھا، خصوصاً امام اعظم ابوحنیفہؒ کی ذات گرامی سے اس لئے انہوں نے امام صاحبؒ اور ان کے تلامذہ کی طرف بعض اہل کوفہ سے اشارہ کیا ہے، اور امام صاحبؒ کے اسم شریف کو کہیں کتاب میں صراحۃً ذکر نہیں کیا ہے[3]۔

ان حضرات کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل کوفہ سے حنفیہ ہی مراد ہیں لیکن یہ کلیہ نہیں، کبھی اس کا اطلاق دوسرے علماء کوفہ پر بھی کیا ہے[4]، جیسے باب ماجاء أنه يبدأ بمؤخر الرأس' اس ترجمہ کے تحت فرماتے ہیں قد ذهب اهل الكوفة الى هذا الحديث منهم وكيع بن الجراح -

---

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۲۰۵ [2] شرح جامع الترمذی ص۶۱ [3] شرح سفر السعادۃ

[4] کوکب ص۳۴۷

حضرت مولانا انور شاہؒ فرماتے ہیں "اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ترمذیؒ کو امام صاحبؒ کا مسلک کسی قابلِ اعتماد سند سے نہیں پہنچا تھا، جیسا کہ زعفرانیؒ کے واسطے سے امام شافعیؒ کا قول قدیم پہنچا، مزید برآں یہ اپنے شیخ امام بخاریؒ کی شخصیت سے متاثر تھے[1]"

لیکن امام ترمذیؒ نے ایک روایت امام صاحبؒ سے کتاب العلل میں نقل کی ہے، جو مصری نسخہ میں موجود ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور وہ روایت یہ ہے۔ "حدثنا محمود بن غیلان حدثنا ابو یحییٰ الحمانی قال سمعت أبا حنیفة یقول ما رأیت اکذب من جابر الجعفی ولا افضل من عطاء بن أبی رباح[2]"

نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کو امام ترمذیؒ ائمہ جرح وتعدیل میں سمجھتے ہیں[3]۔

جامع ترمذی پر علامہ ابن جوزیؒ کی تنقید

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ابن جوزیؒ نے جامع ترمذی کی تیس ۳۰ احادیث کو موضوع قرار دیا ہے[4]۔ لیکن علامہ ابن جوزیؒ نقد روایات میں متشدد قرار دیئے گئے ہیں علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب میں بہت سی ایسی احادیث کو موضوع کہہ دیا ہے جن کے موضوع ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ فی الواقع وہ ضعیف ہیں، علامہ ذہبیؒ کی رائے ہے کہ ابن جوزیؒ نے بہت سی قوی وحسن روایات کو بھی کتاب الموضوعات میں داخل کر دیا ہے۔

---

[1] عرف الشذی [2] کوکب جلد ۲ ص ۳۴۷ [3] لامع ص ۶۳ [4] تدریب ص ۱۵۵

شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ کا قول گزر چکا ہے، پس معلوم ہوا کہ علامہ موصوف کا ہر حدیث کے متعلق وضع کا فیصلہ نامناسب ہے، علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب "القول الحسن فی الذب عن السنن" میں ان سب کا جواب دیا ہے جامع ترمذی اور دیگر صحاح وغیرہ پر علامہ ابن جوزیؒ کے اعتراضات وجوابات معلوم کرنے کیلئے "التعقبات علی الموضوعات" (جو چھپ چکی ہے) کا مطالعہ ضروری ہے۔

جامع ترمذی کی شروح

جامع ترمذیؒ کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر علماء ومحدثین نے اس کے ساتھ پورا اعتنا کیا اور اس کی متعدد شرحیں اور حواشی ومستخرجات لکھے گئے، طوالت کے سبب سے ان سب کا تعارف یہاں مشکل ہے، البتہ چند مشہور ومتداول شروح وحواشی یہ ہیں۔

(۱) شروح اربعہ:۔ یہ جامع ترمذی کی چار شرحوں،

۱۔ عارضۃ الاحوذی لابن العربی۔

۲۔ قوت المغتذی للسیوطی۔

۳۔ ابوطیب مدنی المتوفی ۱۱۰۹ھ۔

۴۔ سراج احمد سرہندی۔ کی شرحوں کا مجموعہ ہے۔

اس کی ایک ہی جلد چھپ سکی تھی۔

عارضۃ الاحوذی لابن العربی مالکی (المتوفی ۴۵۶ھ) کی شرح آج مصر سے چھپ کر مکمل آگئی ہے۔

قوت المغتذی جو علامہ سیوطیؒ کی کتاب ہے، اسکی تلخیص علامہ دمنتی نے کی جو

نفع قوت المغتذی کے نام سے کتاب کے ساتھ چھپی ہوئی موجود ہے۔

(۵) حافظ ابوالفتح محمد بن سید الناس الشافعی المتوفی ۷۳۴ھ کی شرح جو مکمل طور پر مدینہ منورہ کے کتب خانے میں موجود ہے اور اس کا کچھ حصہ قلمی ہندوستان کے بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔

(۶) تحفۃ الاحوذی۔ مولانا عبدالرحمٰنؒ مبارکپوری کی یہ کتاب چھپ گئی ہے اور اس کے مقدمہ سے راقم نے بھی اس مضمون میں استفادہ کیا ہے۔

(۷) جامع الترمذی، شیخ احمد محمد شاکر مرحوم نے پوری کوشش کتاب کی تحقیق وتصحیح پر صرف کی ہے، مختصراً تعلیق بھی لکھی ہے، مگر صرف کتاب البیوع تک یہ کام ہو سکا، مصر سے چھپ چکی ہے۔

(۸) العرف الشذی۔ کے نام سے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے افادات ان کے ایک شاگرد نے جمع کئے ہیں۔

(۹) معارف السنن، مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات کی روشنی میں نہایت محققانہ شرح تصنیف فرما رہے ہیں، ابھی اس کی چھ جلدیں کتاب الحج تک طبع ہوئی ہیں۔

(۱۰) الکوکب الدری، حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی، یہ جامع ترمذی پر حضرت مولانا کے افادات ہیں جسے حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کاندھلوی نے مرتب کیا تھا، اور حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے حواشی نے چار چاند لگا دیئے ہیں اور حل کتاب میں اس سے بہتر کوئی کتاب نظر سے نہیں گزری۔

*

امام نسائیؒ

نام ونسب نام احمد ہے اور کنیت ابو عبد الرحمٰن، پورا نسب نامہ یہ ہے احمد بن علی بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار، خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ ہمیشہ سے علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے، تاریخ اسلام کے سیکڑوں نامور فضلاء اس کی خاک سے اٹھے ہیں، امام نسائیؒ بھی اسی خاک کے ایک مایۂ ناز فرزند تھے، نساء خراسان کا ایک شہر ہے جو مرو کے قریب واقع ہے[1]۔ اس کو امام موصوفؒ کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے اور اسی کی طرف منسوب ہو کر آپ نسائی کہلاتے ہیں۔

مؤرخ ابن خلکان رقم طراز ہیں "نسبۃ الی نساء بفتح النون وفتح السین المہملہ وبعدہ ھمزۃ، وھی مدینۃ بخراسان خرج منہا جماعۃ من الأعیان[2]"۔ یہ نساء کی طرف نسبت ہے جس میں نون وسین دونوں مفتوح ہیں اور اس کے بعد

---

[1] مرقاۃ ص۲۳ [2] وفیات جلد ا ص۲۶

ہمزہ واقع ہے، یہ خراسان کا ایک مشہور شہر ہے جہاں سے بہت سے ارباب فن پیدا ہوئے، نسائی ہمزہ کے مد اور قصر دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے[1]۔

پیدائش اور ابتدائی حالات

امام موصوف ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے خود فرماتے ہیں " یشبه أن یکون مولدی فی سنة ۲۱۵" (اندازہ ہے کہ میری پیدائش ۲۱۵ھ میں ہوئی[2])

اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی تھی، لیکن اس زمانہ میں خراسان کا علاقہ علم و فن کا مرکز بن چکا تھا، بہت سے ارباب فضل و کمال موجود تھے، اسی لئے قیاس یہی چاہتا ہے کہ ابتدائی تعلیم امام نسائی نے یہیں سے حاصل کی ہوگی۔

سماع حدیث کیلئے سفر

امام نسائی جس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، اس وقت علم حدیث کیلئے گھر بار چھوڑنا اور دُور دراز ممالک کا سفر کرنا مسلمانوں کا خصوصی شعار بن چکا تھا، آج اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، محدثین کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کی طلب میں ملکوں ملکوں پھرنا سیکڑوں میل پا پیادہ طے کرلینا برّاعظموں اور سمندروں کو پار کرنا اس دور کے علماء کے نزدیک بہت معمولی بات تھی، حافظ ابن حجر نے طلب حدیث کیلئے رحلت کا یہ ضابطہ بیان کیا ہے " وصفة الرحلة بحیث یبتدئ بحدیث اهل بلده فیستوعبه ثم یرحل فیحصل فی الرحلة مالیس عنده[3]" (اور رحلت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے شہر کی حدیثوں سے ابتدا کرے اور جب وہ پورے طور سے حاصل کر چکے

---

[1] بستان ص ۱۲۳   [2] تہذیب جلد ۹ ص ۳۸   [3] شرح نخبۃ

تو پھر اور شہروں کا سفر کرے اور اس سفر میں ان روایات کو حاصل کرے جو اس کے پاس نہ ہوں)۔

اسی ضابطہ کے بموجب امام نسائیؒ اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کے بعد ۲۳۰ھ میں سب سے پہلے قتیبہ بن سعید کی خدمت میں حاضر ہوئے[1]۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں" رحل الیٰ قتیبۃ ولہ خمس عشرۃ فقال أقمت عندہ سنۃ و شھرین[2]" (سب سے پہلے امام قتیبہ کی خدمت میں سفر کرکے گئے جب کہ عمر شریف پندرہ سال کی تھی اور ان کے پاس ایک سال دو ماہ قیام رہا)

ان کے علاوہ دوسرے شیوخ و اساتذہ سے استفادہ کیلئے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کا سفر کیا، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں" رحل الی الآفاق واشتغل بسماع الحدیث والاجتماع بالأئمۃ الحذ ق" (نیز جن مشائخ سے بالواسطہ حدیثیں سنی تھیں ان سے مشافہتہً بھی روایت کیا[3])

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں" انہوں نے بہت سے شہروں کے شیوخ و اساتذہ سے استفادہ کیا، خراسان، عراق، حجاز، جزیرہ، شام و مصر وغیر ذلک[4]" اس کے علاوہ بھی اس سے سفر کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے، اس کے بعد امام صاحب نے مصر کو اپنے علوم کی نشر و اشاعت کا مرکز بنایا، علامہ ذہبی نے ابن یونس کا قول نقل کیا ہے" قَدِم مصر قدیما وکتب بھا وکتب عنہ[5]"

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں" در مصر مسکن داشت

---

[1] بستان ص ۱۳۲ [2] تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۵ [3] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۱۶۳

[4] بستان ص ۱۳۳ [5] تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۲

وتصانیف اودرون دیار منتشر است و مردم بسیار از واخذ وتحمل حدیث کردہ اند پس از مصر بدمشق آمد[1]" (مصر میں مستقل طور سے سکونت اختیار کی، ان کی تصانیف اسی اطراف میں پھیلیں اور بہت سے لوگوں نے امام صاحب سے اخذ وروایت حدیث کیا ہے، آخری زندگی ذلقعدہ ۳۰۲ھ میں مصر سے دمشق آ گئے تھے[2])

شیوخ واساتذہ ان کے شیوخ واساتذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں " سمع من خلائق لا یحصون[3] "

اوپر گزر چکا ہے کہ سب سے پہلے قتیبہ بن سعید المتوفی ۲۴۰ھ کی خدمت میں سفر کیا، علامہ ذہبیؒ نے ان کو شیخ الحفاظ، محدث خراسان کے لقب سے یاد فرمایا ہے، بلخ کے رہنے والے تھے[4] ان کے شیوخ میں اسحاق بن راہویہ، محمد بن بشار، امام ابو داؤد سجستانی وغیرہم ہیں، امام بخاریؒ کو بھی حافظ ابن حجرؒ نے امام نسائی کے اساتذہ میں شمار کیا ہے، ابوزرعہ رازی، ابوحاتم رازی سے امام نسائی کا روایت کرنا ثابت ہے۔

تلامذہ امام نسائی کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبان حدیث کے لئے مرجع بنا دیا تھا ان کے تلامذہ میں دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی ملتے ہیں، خود امام صاحبؒ کے صاجزادے عبدالکریم، ابوبکر بن احمد بن محمد ابن اسحاق ابن السنی م ۳۶۳ھ، ابو علی کنانی م ۳۵۷ھ، ابوالحسن محمد بن عبداللہ بن زکریا بن حیویہ، محمد بن معاویہ بن الاحمر، محمد بن قاسم الاندلسی المتوفی ۳۲۸ھ، علی

---

[1] اشعۃ اللمعات جلد ا ص ۱۷ طبع قدیم [2] تہذیب التہذیب ص ۱۲۳ [3] تہذیب جلد ا ص ۳۷ [4] تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۳

ابن جعفر طحاوی، احمد بن محمد بن مہندس، ان حضرات نے آپ کی کتاب السنن کی روایت بھی کی ہے[1]۔

ان کے علاوہ ان کے تلامذہ ابوبشر دولابی، ابوجعفر طحاوی وغیرہم ہیں حافظ ابن حجرؒ نے ایک طویل فہرست بیان کی ہے اور فرمایا "وأممٌ لا یحصون[2]" ان رواۃ مذکورین میں امام علی بن ابی جعفر طحاوی المتوفی ۳۵۱ھ اکابر حنفیہ میں سے ہیں اور بڑے پایہ کے محدث گزرے ہیں، یہ مشہور امام وقت ابوجعفر طحاوی کے صاحبزادے ہیں، جن کی کتاب "شرح معانی الآثار" علم حدیث کی ایک بے نظیر کتاب مشہور و متداول ہے۔

امام نسائیؒ کا زہد و تقویٰ

زہد و تقویٰ میں یکتائے روزگار تھے کان ورعًا متورعًا[3] جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اتنے بلند مقام تک پہنچایا، یصفون من اجتہادہ فی العبادۃ باللیل والنہار و مواظبتہ علی الحج والجہاد واقامۃ السنن الماثورۃ واحترازہ عن مجالس السلطان وان ذلک لم یزل دابہٗ الیٰ ان استشہد[4]۔

صوم داؤدی کے پابند تھے، ایک روز روزہ رکھتے تھے اور دوسرے روز افطار کرتے تھے[5] حافظ محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ میں نے مصر میں اپنے مشائخ سے سنا کہ وہ بیان کرتے تھے کہ امام نسائیؒ کے دن و رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزرتا تھا، اکثر حج کیا کرتے تھے، جہاد کا جذبہ بھی تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۷ [2] ایضا جلد ۱ ص ۳۷ [3] اکمال

[4] تہذیب جلد ۱ ص ۳۸ [5] وفیات جلد ۱ ص ۶۵

میں شرکت بھی کی تھی، ان کی شجاعت و بہادری کے لوگ معترف ہو گئے، انہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو قائم کیا، بادشاہوں کی مجالس سے ہمیشہ گریز کیا، اس کے باوجود کھانے پینے میں ہمیشہ کشادہ دست رہے، تاشہادت ان کی زندگی اسی پر قائم رہی[۱] سنت کی اشاعت، بدعت سے نفرت پر ان کی شہادت کا واقعہ خود ایک واضح دلیل ہے، نیز اس سے امام صاحبؒ کی حق گوئی و بیباکی کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو مردانِ خدا کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے، کچھ دنوں تک حمص کے قضا ر کے عہدہ پر بھی فائز رہے[۲]۔

علماء و معاصرین کا اعتراف

مؤرخ ابن خلکان نے ان الفاظ سے خراج عقیدت پیش کیا ہے: "کان امام عصرہ فی الحدیث[۳]"

ابو سعید عبدالرحمٰن نے اپنی "تاریخ مصر" میں یہ الفاظ لکھے ہیں: "کان اماماً فی الحدیث ثقۃ ثبتًا حافظا" (وہ حدیث میں امام، ثقہ، معتبر اور حافظ تھے[۴])

امام دار قطنی فرماتے ہیں: "ابو عبد الرحمٰن النسائی مقدم علے کل من یذکر بھٰذا العلم من اھل عصرہ (ابو عبد الرحمٰن نسائی اپنے زمانہ کے تمام محدثین سے (شیخین کے بعد) بلند و اونچے تھے[۵])۔

حاکم نے دار قطنی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے ان سے سنا کہ امام نسائی جرح رواۃ، فنِ حدیث، فنِ تنقید، اور احتیاط میں اپنے معاصرین سے کہیں فائق تھے[۶]۔

---

[۱] تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۸ [۲] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۱۲۳ [۳] ابن خلکان جلد ۱ ص ۸۱

[۴] وفیات جلد ۱ ص ۵۹ [۵] تہذیب [۶] ایضاً

ابوبکر حداد نے باوجود کثیر الحدیث ہونے کے صرف امام نسائی سے روایت کی، فرماتے تھے کہ میں نے اس کو اپنے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے درمیان حجت بنایا ہے[1]۔

حافظ ابو علی نیشاپوری کا قول ہے "ھو الامام فی الحدیث بلا مدافعة" (وہ بغیر کسی تقابل حدیث میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں[2])۔

حافظ ابن حجرؒ، علامہ ذہبی اور ابن کثیر وغیرہ نے بہت سے اہل علم کے اقوال نقل کئے ہیں، جنہوں نے امام نسائیؒ کی رفعتِ شان وفضل کا اعتراف کیا ہے،

صاحب مجمع بحار الانوار فرماتے ہیں " وکان احد الائمة الحفاظ واعلام الدین وأرکان الحدیث امام اھل عصرہ وعمدتھم وقدوتھم و جرحه وتعدیله معتبر بین العلماء"

ناقدین فن کی ایک جماعت نے جلالتِ علمی کے لحاظ سے امام نسائی کا پایہ امام مسلم سے بڑھا ہوا بیان کیا ہے۔

علامہ تاج الدین سبکی طبقات الشافعیة الکبریٰ میں لکھتے ہیں " میں نے اپنے شیخ حافظ ابو عبداللہ ذہبی سے سوال کیا کہ آیا امام مسلم بن حجاج حدیث کے زیادہ حافظ ہیں یا امام نسائی؟ فرمایا امام نسائی، پھر شیخ امام۔۔۔ (حافظ تقی الدین سبکی اللہ ان پر رحمتیں نازل فرمائے) سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اس سے موافقت کی[3]"

حافظ شمس الدین ذہبی سیر اعلام النبلاء میں امام نسائی کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ " ھو احذق بالحدیث وعلله ورجاله من مسلم والترمذی

---

[1] ایضاً جلد ۱ ص ۶۶ [2] ایضاً جلد ۱ ص [3] طبقات الشافعیہ جلد ۲ ص ۸۲

وابوداوٗد هو جار فی مضمار البخاری وابی زرعۃ"[1] (یہ مسلم، ترمذی، ابوداوٗد سے حدیث علل حدیث اور علم الرجال میں زیادہ ماہر ہیں اور بخاری وابو زرعہ کے ہمسر ہیں)۔

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ رقم طراز ہیں" قدمہ قوم من الحذاق فی معرفۃ ذلک علےٰ مسلم بن حجاج وقدمہ الدار قطنی وغیرہ فی ذلک علےٰ امام الائمۃ ابی بکر بن خزیمۃ صاحب الصحیح"(فن رجال میں ماہرین کی ایک جماعت نے امام مسلم بن حجاج پر بھی فوقیت دی ہے، اور دارقطنی وغیرہ نے ان کو اس فن میں اور دیگر علوم میں امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ صاحب الصحیح پر بھی مقدم رکھا ہے[2])

گو یہ قول جمہور کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہے تاہم اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ امام نسائیؒ کا پایہ بہت بلند تسلیم کیا گیا ہے۔

امام نسائیؒ پر دورِ ابتلاء ووفات

امام صاحب کو مصر میں جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اس کی بناء پر حاسدین نے حسد کیا اس لئے انہوں نے ذلقعدہ ۳۰۲ھ میں مصر کو خیرباد کہا اور وہاں سے فلسطین کے ایک مقام رَملہ آ گئے تھے، چونکہ شام میں بنی امیہ کی طویل حکومت کے سبب سے خارجیت وناصبیت کا زور تھا، عوام حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بدگمان تھے اس لئے امام نسائیؒ دمشق تشریف لے گئے اور جامع دمشق میں ممبر پر چڑھ کر کتاب خصائصِ علیؓ سنانی شروع کی، ابھی تھوڑی ہی سی پڑھی تھی کہ کسی سائل نے سوال کیا کہ آپ نے امیر معاویہؓ کے فضائل پر بھی کوئی کتاب لکھی ہے، فرمایا کہ معاویہؓ کیلئے یہی کافی ہے کہ برابر سرابر چھوٹ جائیں، دوسری روایت

---

[1] توضیح الافکار جلد ۱ ص ۲۲ [2] ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ص ۸

ہے جو فی الواقع اقرب معلوم ہوتی ہے کہ مجھ کو ان کے مناقب میں بجز اس حدیث کے "لا اشبع اللہ بطنہ"۔ اور کوئی حدیث نہیں پہنچی اس پر عوام نے مشتعل ہو کر امام صاحب پر تشیع کا الزام لگا کر زدوکوب شروع کر دی، امام صاحبؒ کے نازک مقام پر چند سخت چوٹیں آئیں جن کے سبب سے امام صاحب نیم جاں ہو گئے ایسی حالت میں لوگ مکان پر لائے، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھ کو مکہ مکرمہ لے چلو تاکہ میرا انتقال مکہ معظمہ میں ہو، بالآخر ایسی حالت میں وہ اپنے خدا سے جا ملے، اور مکہ مکرمہ میں امام صاحبؒ کا انتقال ۱۳ صفر ۳۰۳ھ بروز دوشنبہ ہوا، صفا و مروہ کے درمیان تدفین ہوئی بعض روایتوں میں ہے کہ رملہ ہی میں سپرد خاک کئے گئے اور ماہ شعبان میں وفات ہوئی، انتقال کے وقت عمر ۸۸ سال کی تھی[1]

امام نسائی پر تشیع کا شبہہ غلط ہے

اوپر گزر چکا ہے کہ شام میں خارجیت کا زور تھا، حضرت علیؓ کے مخالفین بڑی تعداد میں موجود تھے، اس لئے امام صاحبؒ نے کتاب خصائص علیؓ لکھی تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ ہدایت دے اور بر ملا حق کا اظہار کیا، اس لئے لوگوں نے تشیع کا الزام لگایا۔

حیرت ہے ابن خلکان نے بھی نقل کیا ہے کہ کان یتشیع اور ابن کثیر نے بھی تحریر کیا ہے فیہ شئ فی التنشیع یعنی کچھ شیعیت کا اثر تھا، اور متاخرین تک اسی نقل در نقل کا سلسلہ چلتا رہا، مگر حافظ ابن حجر عسقلانی، اور علامہ ذہبی ان دونوں نے اس سے سکوت کیا ہے، بلکہ یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ اس کے بعد امام صاحبؒ نے

---

[1] وفیات الاعیان جلد ا ص ۵۹ و بستان ص ۱۲۳ و تذکرہ جلد ۲ ص ۶۶

فضائلِ صحابہؓ پر مستقل ایک تصنیف فرمائی، جس سے خود بخود تشیع کا شبہہ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے، البتہ اس کا احتمال ہو سکتا ہے کہ حالات کے پیش نظر حضرت علیؓ واہل بیت کے دفاع میں کچھ تشدد پیدا ہو گیا ہو، ورنہ ان کی سنن کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بالکل واشگاف ہو جاتی ہے کہ خلفاء راشدین میں امام نسائیؒ اسی ترتیب کے قائل ہیں جو جمہور اہلِ سنت والجماعت کا مسلک ہے، مثلاً باب امامة اهل العلم والفضل میں یہ حدیث نقل کی ہے، لمّا قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم قالت الانصار منا اميرٌ ومنكم اميرٌ فأتاهم عمرؓ فقال ألستم تعلمون ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد امرا بابكر ان يصلى بالناس فايكم تطيب نفسه ان يتقدم أبابكر قالوا نعوذ بالله ان نتقدم أبابكر۔[1]

امام نسائیؒ کا مسلک

دیگر محدثین کی طرح امام نسائیؒ کے فقہی مسلک کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کس کے مسلک کی طرف ان کا انتساب ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں "اور شافعیؒ المذہب بود، چنانچہ مناسکِ او برآں ولالت می کند"[2]

نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی تائید کی ہے اور امام نسائیؒ کو شوافع میں شمار کیا ہے۔[3]

فی الواقع حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک بھی ان کا انتساب مسلک

---

[1] سنن نسائی جلد ا صـ۷۹ [2] بستان صـ۱۲۳ [3] ابجد العلوم صـ۸۱۰

شافعیؒ کی جانب مناسب ہے[1]، لیکن حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کشمیری کا قول فیض الباری میں ہے کہ " امام ابوداؤد والنسائی حنبلیان صرح به الحافظ ابن تیمیه وزعم آخرون انهما شافعیان ولکن الحق أنهما حنبلیان[2]۔"

اور ان کی سنن کے مطالعہ کے بعد بظاہر ان کا حنبلی ہونا معلوم ہوتا ہے، مثال کے طور پر امام احمدؒ کے نزدیک جمعہ کی نماز قبل الزوال جائز ہے، چنانچہ باب وقت الجمعة ترجمہ قائم کیا ہے اور باب کے تحت کی روایات جن سے حنابلہ کا استدلال ہے صرف انہیں کو نقل کیا ہے اور جمہور ائمہ ثلاث کی دلیل حضرت انسؓ کی صریح روایت کان یصلی الجمعة حین تمیل الشمس[3]۔ کو ترک کر دیا ہے۔

اسی طرح ترجمہ قائم کیا ہے، باب اغتسال الرجل والمرأة من اناء واحد[4]، جمہور کے نزدیک شوہر وبیوی ایک ساتھ غسل جنابت کر رہے ہوں تو دونوں کا غسل بالاتفاق ہو جائے گا، لیکن اگر عورت مرد سے پہلے غسل کرے تو اس کے غسل سے بچے ہوئے پانی سے شوہر کو غسل کرنا امام احمدؒ کے نزدیک ناجائز ہے اور ائمہ ثلاث کے نزدیک جائز ہے چنانچہ امام نسائیؒ نے اس ترجمہ کے تحت حضرت عائشہؓ کی روایت کو نقل کیا ہے جس سے ان کا حضورؐ کے ساتھ ساتھ غسل کرنا ثابت ہے[5]۔ اس کے بعد دوسرا ترجمہ باب الرخصة فی ذلك قائم کیا ہے جو فی الواقع جمہور کا مستدل بیان کرنے کیلئے ہے، لیکن اس کیلئے جو روایت نقل کی ہے وہ جمہور کے مسلک پر صریح دلالت نہیں کرتی، حالانکہ حضرت میمونہؓ کی مشہور روایت[6] جمہور کا

---

[1] الانصاف فی بیان سبب الاختلاف ص۸۰ [2] فیض جلد ۱ ص۵۸ [3] معارف السنن ص۲۲

[4] ترمذی ص۶۶ [5] سنن نسائی ص۴۳ [6] ترمذی ص۲

مستدل ہے اس کو اس باب میں ترک کر دیا ہے۔

حلیہ شریف امام نسائیؒ کو حق تعالیٰ نے حُسن سیرت کے ساتھ حسنِ صورت بھی عطا کیا تھا۔ امام صاحب بڑے وجیہ وشکیل تھے، چہرہ نہایت پر شکوہ اور روشن تھا رنگ نہایت سرخ وسفید تھا، یہاں تک کہ بڑھاپے میں بھی حسن و تازگی میں فرق نہیں آیا تھا۔

لباس نہایت نفیس استعمال کرتے تھے، رنگین وقیمتی لباس بھی زیب تن فرماتے تھے بہترین غذائیں کھاتے، مرغ خرید کر پالتے اور خوب فربہ کر کے کھاتے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ روزانہ مرغ کھانے کے بعد نبیذ (شربت) پیتے تھے، چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں، البتہ ان کے اولاد میں صرف صاحبزادہ عبدالکریم کا نام معلوم ہے۔

تصنیفات امام صاحبؒ نے مختلف موضوع پر کتابیں لکھیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے وہ درج ذیل ہیں "السنن الکبریٰ، والصغریٰ، خصائص علیؓ، مسند علی، مسند مالک، الکنیٰ، عمل یوم ولیلۃ، اسماء الرواۃ والتمیز بینہم، الضعفاء والمتروکین (فی رواۃ الحدیث) ۱۳۲۳ھ میں امام بخاری کی کتاب المضردات والوحدان کے ساتھ طبع ہو چکی ہے، والاخوۃ ما اغرب شعبہ علی سفیان وسفیان علی شعبہ، مسند منصور بن زاذان وغیر ذلک[1]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے کتاب الجمعہ اور استاد خولی نے کتاب المدلسین کا تذکرہ کیا ہے[2]۔ ان تمام مذکورۂ بالا کتب میں کتاب الضعفاء والمتروکین

---

[1] تدریب طبع جدید ص۵۱۶ [2] بستان ص۱۲۵ ومفتاح السنۃ ص۱۵۳

طبع ہوچکی ہے، اس میں انہوں نے بہت سے ثقات کو ضعیف کہہ دیا ہے، ممکن ہے امام نسائیؒ کے نقد رجال میں تشدد سے فائدہ اٹھاکر بعض لوگوں نے الحاقی عبارتوں کا اضافہ کر دیا ہو جیسا کہ میزان الاعتدال میں امام صاحبؒ کا ذکر الحاقی ہے[1]۔

سنن کی تالیف

امام نسائیؒ کی تالیفات میں سنن کے نام سے ان کی دو کتابیں ہیں، سنن کبریٰ، سنن صغریٰ، لیکن صحاح ستہ میں سنن صغریٰ شامل ہے، جس کا دوسرا نام المجتنیٰ ہے یا المجتبیٰ دونوں لفظ قریب المعنیٰ ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ جب سنن کبریٰ کی تالیف سے فارغ ہوئے تو اس کو امیر[2] رملہ کی خدمت میں پیش کیا، امیر موصوف نے امام ممدوح سے دریافت کیا کہ اس میں جو کچھ ہے سب صحیح ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا نہیں! اس پر امیر نے فرمائش کی کہ میرے لئے صرف صحیح روایات کو جمع کر دیجئے، تب امام صاحب نے ان کیلئے سنن صغریٰ تصنیف فرمائی[3] اس واقعہ کا ذکر علامہ ابن اثیر نے بھی جامع الاصول میں کیا ہے ملا علی قاری نے بھی اس کو مرقاۃ میں سید جمال الدین کے حوالہ سے نقل کیا ہے[4]۔ لیکن علامہ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء کے اندر امام نسائیؒ کے ترجمہ کے تحت اس واقعہ کی تصریح یوں کی ہے کہ "ان ھذہ الروایۃ لم تصح بل المجتبیٰ اختصار ابن السنی تلمیذ النسائی" بے شبہ یہ روایت صحیح نہیں ہے بلکہ مجتبیٰ ابن السنی کا اختصار ہے جو نسائی کے شاگرد ہیں[5]، اسلئے

---

[1] ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۴۷ [2] رملہ فلسطین بیت المقدس سے ۱۸ میل پر واقع ہے، حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کا دارالسلطنت تھا اور اب غیر آباد ہے (معجم البلدان) [3] بستان ص ۱۲۳ [4] مرقاۃ جلد ص ۲۳ [5] توضیح الافکار جلد ا ص ۲۲۱

مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کے نزدیک سنن صغریٰ ابن السنی کا اختصار ہے اور انہیں کا مرہون قلم ہے، مگر امام نسائی کا خود اپنا بیان جس کو ان کے شاگرد ابن الاحمر نے نقل کیا ہے کہ "کتاب السنن أی الکبریٰ کلہ صحیح وبعضہ معلول الا انہ یبینہ والمنتخب المسمی بالمجتبیٰ صحیح"، پوری کتاب السنن (الکبریٰ) کا بیشتر حصہ صحیح ہے، اور بعض حدیثیں معلول ہیں تو ان کی علت کو بیان کر دیا اور اس کا انتخاب جو المجتبیٰ کے نام سے موسوم ہے وہ تمام تر صحیح ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن صغریٰ کا اختصار ابن السنی[1] نے امام نسائی کے زیر نگرانی رہ کر کیا ہے، یمکن حملہا علیٰ ان یکون ابن السنی باشر اختصارہا بامر النسائی فلنحمل علیہ ہذہ الروایۃ ولا یجترأ علیٰ شق عصا الجماعۃ بقول محتمل[2]۔

سنن نسائی کی غرض

امام نسائی زمانہ کے لحاظ سے صحاح ستہ میں سب سے مؤخر ہیں، اور امام بخاری کی شخصیت سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں، اسلئے انہوں نے اپنی کتاب میں امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے طریقے کو جمع کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور علل حدیث کا بیان اس پر مستزاد ہے، اسکے ساتھ حُسنِ ترتیب اور جودت تالیف میں بھی ممتاز ہے، چنانچہ حافظ ابوعبداللہ ابن رشد المتوفی ۷۲۱ھ فرماتے ہیں "انہ أبدع الکتب المصنفۃ فی السنن تصنیفاً واحسنہا ترصیفا وھو جامع بین طریقی

---

[1] امام نسائی کے سنن الکبریٰ کے راوی ابن الاحمر ہیں جن کی کنیت ابوبکر اور نام محمد بن معاویہ المتوفی ۳۵۸ھ ہے اور سنن صغریٰ کا راوی ابن السنی ہے ان کی کنیت ابوبکر نام احمد بن محمد بن اسحاق دینوری المتوفی ۳۶۴ھ ہے مشہور کتاب عمل الیوم واللیلۃ اور دیگر کتابوں کے مصنف ہیں ۸۰ سال کی عمر پائی تھی (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۵۱) [2] الیانع ص ۵۳

البخاری و مسلم مع حظ کثیر فی بیان العلل[1]" (یہ کتاب علم سنن میں جتنی کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان سب میں تصنیف کے لحاظ سے انوکھی اور ترتیب کے لحاظ سے بہترین ہے اور بخاری ومسلم دونوں کے طریقہ کی جامع ہے نیز عللِ حدیث کے ایک خاص حصہ کا بیان بھی اس میں آگیا ہے)۔

سنن کے محاسن و فضائل

حافظ محدث ابوالحسن معافری المتوفی ۴۰۳ھ جو امام دارقطنی اور حاکم کے معاصر ہیں فرماتے ہیں کہ" اذا نظرت الی ما یخرجه اهل الحدیث فما خرجه النسائی أقرب الی الصحة مما خرجه غیرہ[2]" (جب تمام محدثین کی جمع کردہ حدیثوں پر نظر ڈالوگے تو جس حدیث کی امام نسائی نے تخریج کی ہوگی وہ دوسروں کی روایت کردہ حدیث کی بہ نسبت صحت سے زیادہ قریب ہوگی اسی لئے بعض مغاربہ صحیح بخاری پر اس کی ترجیح کے قائل ہیں)۔

علامہ سخاوی تحریر فرماتے ہیں " صرح بعض المغاربة بتفضیل کتاب النسائی علی صحیح البخاری[3] (بعض مغاربہ نے صراحت کی ہے کہ امام نسائی کی کتاب کو صحیح بخاری پر فضیلت حاصل ہے)۔

محدث ابن الاحمر نے اپنے بعض مکی شیوخ سے نقل کیا ہے " انه اشرف المصنفات کلها وما وضع فی الاسلام مثله[4]" (یہ اس فن کی تمام مصنفات

---

[1] مقدمہ زہرالربیٰ ۵ - - - - - - - [2] فتح المغیث ص ۱۲ [3] ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں شذ بعض المغاربة نفضله علی کتاب البخاری ولعله لبعض الحیثیات الخارجة من کمال الصحة واللہ اعلم۔ (مرقاة ص ۲۳) [4] فتح المغیث ص ۳۳ مقدمہ فتح الباری۔

سے افضل ہے اور اسلام میں اس کے مانند کوئی کتاب نہیں لکھی گئی)

مگر یہ گفتگو صحیحین کے علاوہ دیگر کتابوں سے تقابل کے طور پر کہی جاسکتی ہے کیونکہ صحیح بخاری کے بارے میں تو خود امام نسائی کا یہ قول حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ "مافی ھٰذہ الکتب کلھا اجود من کتاب البخاری"(ان تمام کتابوں میں بخاری کی کتاب سے زیادہ خوب کوئی کتاب نہیں)۔

اس کے بعد حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں " والنسائی لا یعنی بالجودۃ الا اجودۃ الاسانید " (نسائی کی مراد جودت اسانید ہے[1])۔

امام نسائی کے شرائط

مقدسی نے امام صاحبؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب میں نے کتاب السنن کے جمع کرنے کا ارادہ کیا ہے تو میں نے اللہ تعالےٰ سے ان شیوخ سے روایت کرنے میں استخارہ کیا جن کے متعلق میرے قلب میں کسی طرح کا شبہہ تھا، چنانچہ بہتر یہ معلوم ہوا کہ ان سے روایت نہ کروں، لہٰذا بہت سی ایسی روایتیں جنہیں میں عالی سند سے بیان کرسکتا تھا ان کو اسی وجہ سے سند نازل سے نقل کیا ہے[2]، اس کے بعد حافظ مقدسی لکھتے ہیں کہ میں نے امام ابو القاسم سعد بن علی زنجانی سے مکہ معظمہ میں ایک راوی کا حال دریافت کیا تو انہوں نے اس کی توثیق کی، میں نے عرض کیا کہ امام عبدالرحمٰن نسائی نے تضعیف کی ہے اس پر امام موصوف نے فرمایا کہ " یا بُنیّ ان لابی عبد الرحمٰن فی الرجال شرطا اشد من شرط البخاری و مسلم " (بیٹا رجال کے بارے میں ابو عبدالرحمٰن نسائی کی شرط بخاری و مسلم کی شرط سے زیادہ سخت ہے[3])۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری [2] شروط الائمہ ص۱۸ [3] ایضاً ص۱۸ از ابو الفضل بن طاہر مقدسی۔

فی الواقع نسائی کی شرط ایسے لوگوں کی روایات کی تخریج ہے جن کے ترک پر اجماع نہ ہو (مراد خاص اجماع) بشرطیکہ اس حدیث کی سند متصل ہو اور انقطاع و اتصال نہ پایا جائے، اس کے باوجود امام نسائی نے بہت سے ایسے رجال سے جن سے ابوداؤد و ترمذی روایت کرتے ہیں اجتناب کیا ہے، بلکہ صحیحین کے بہت سے رجال سے بھی روایت نہیں کی ہے۔ ولذلك قیل ان لابی عبد الرحمٰن النسائی شرطا اشد من شرط البخاری ومسلم[1]، اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ امام نسائی نے شیخین یا دونوں میں سے ایک کے بہت سے رواۃ کو کتاب الضعفاء والمتروکین میں داخل کیا ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ امام نسائی کا یہ فیصلہ ان دونوں کتابوں کے وجود میں آنے کے بعد تھا اس لئے کوئی حرج نہیں ہے، لیکن شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں، امام صاحبؒ نے شیخین کے رجال پر کلام اگر اپنے اجتہاد سے یا کسی معاصر سے نقل کیا ہے تو یہ جواب دیا جاسکتا ہے، البتہ اگر اپنے کسی پیشرو سے نقل کر رہے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ کسی مرجح کی بنا پر اس سے روایت کر رہے ہوں جس سے اس کمی کی تلافی ہو رہی ہو[2]، اس لئے شرط النسائی اشد من شرط البخاری ومسلم کہنا کسی طرح قابل قبول نہیں[3]، ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ خطیب وحاکم وغیرہ کا کہنا یہ ہے کہ کل ما فیہ صحیح اس قول میں صریح تساہل ہے[4]، البتہ جیسا کہ علامہ سیوطی زہر الربی کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں کہ "وبالجملة فكتاب السنن بعد الصحيحين اقل حديثا ضعيفا ورجلا مجروحا ويقاربه كتاب ابی داؤد وكتاب الترمذی" علامہ حازمی نے بھی یہی

---

[1] مقدمہ زہر الربی [2] تدریب ص ۶۵ [3] لامع ص ۴۱ [4] مرقاۃ ص ۲۳

فیصلہ فرمایا ہے کہ امام زہری کے تلامذہ کا طبقہ ثالثہ جو ابو داؤد کی شرط ہے یہی امام نسائی کی بھی شرط ہے[1]۔

علامہ حازمی اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے نزدیک صحیحین کے بعد اس کا تیسرا درجہ ہے[2]، اگرچہ اس میں اختلاف بھی کیا گیا ہے جس کو ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔

سنن کی ایک اہم خصوصیت

امام نسائیؒ امام ترمذی کی طرح رواۃ کے اسماء وکنی کا پوری تشریح سے تعارف کراتے ہیں، اس کے علاوہ ان کی خصوصی توجہ علل حدیث پر تنبیہ کرنے پر پوری ہوتی ہے اور بعض مقامات پر اپنا فیصلہ بھی صادر فرماتے ہیں، جب قال ابو عبد الرحمٰن ھٰذا منکر وھٰذا صواب کہتے ہیں، اس وقت نہایت معرکہ پیش آجاتا ہے پھر وہ بحث کافی غور وفکر کی طالب بن جاتی ہے۔

سنن کے تراجم الابواب

کسی محدث کے تفقہ کا اندازہ اس کے تراجم الابواب سے لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے فقہ البخاری فی ترجمہ، حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں (۱) وہ مسائل فقہ جن کو مصنف نے اختیار کیا ہے وہ تراجم سے ظاہر ہوجائیں گے (۲) اس سے صاحب کتاب کے تفقہ، ذہانت اور دقتِ نظر بھی معلوم ہوجاتی ہے، اس حیثیت سے بخاری کے تراجم نہایت اہم ہیں جن کو سمجھنے کیلئے بڑی دقّتِ نظر وتفقہ کی ضرورت ہے اور اس کے بعد ابو عبد الرحمٰن نسائی کے

---

[1] شرط الائمہ ص۴۴ [2] معارف السنن ص۱۶

تراجم ابواب ہیں مگر بہت سی جگہوں پر دونوں کتابوں کے تراجم حرفاً حرفاً موافق ہیں، ایسی صورت میں توارد پر محمول کرنا مشکل ہے، میرا خیال ہے کہ اس کو مصنف نے اپنے شیخ امام بخاریؒ سے لیا ہے اور یہ احتمال قوی ہے جب کہ امام بخاری ان کے شیوخ میں ہیں، اس کے بعد علی الترتیب ابوداؤد ترمذی کے تراجم ہیں مگر سب سے آسان ترمذی کے تراجم ہیں اوران کا سمجھنا بھی کچھ دشوار نہیں اور مسلم کے تراجم مصنف نے بذات خود قائم نہیں کئے ہیں بلکہ بعد میں علامہ نوویؒ نے قائم فرمائے ہیں مگر بخاری کے تراجم سے اسے کوئی نسبت نہیں[۱]

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تقریر سے معلوم ہوا کہ سننؒ نسائی کے تراجم نہایت مہتم بالشان ہیں، امام نسائیؒ نے امام بخاریؒ کے طرز پر تراجم قائم کئے ہیں مثلاً امام بخاری کبھی مختصر روایت نقل کرتے ہیں اور حدیث کے ایسے جزء سے ترجمہ پر استدلال فرماتے ہیں جو اس باب کے علاوہ دوسری جگہ کتاب میں ہے، اس سے مقصود تشحیذ اذہان ہے اسی طرح امام نسائیؒ نے ترجمہ قائم کیا ہے " باب الاقامۃ لمن یصلی وحدہ[۲] اس باب میں یہ حدیث نقل کی ہے عن رفاعۃ بن رافع ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بینما ھو جالس فی صف الصلوٰۃ (الحدیث) اس حدیث سے ترجمہ ثابت نہیں ہو رہا ہے مگر ص۱۸۳ پر روایت آرہی ہے، یعنی اعرابی والی حدیث اس کے بعض طرق میں فتشھد وأقم کا لفظ موجود ہے جس سے ترجمہ ثابت ہے۔

سننؒ کے تراجم ابواب امام نسائیؒ کے تفقہ و دقتِ نظر کا واضح ثبوت ہیں اس لئے امام صاحب کے بارے میں ابن یونس کا ارشاد ہے " کان اماماً ثقۃ ثبتاً حافظاً

---

[۱] معارف السنن ص۲۳ [۲] سنن نسائی جلد ا ص۱۱۲

فقہاء[1]

امام اعظمؒ اور امام نسائیؒ

حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ حافظ ابوالشیخ ابن حیان نے اپنی کتاب السنۃ میں اور ابن عدی نے اپنی کامل میں اور خطیب نے تاریخ بغداد میں اور ان سے پہلے دوسرے لوگوں نے جیسے ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور امام بخاری و نسائی نے ائمہ مجتہدین کے بارے میں جو کلام کیا ہے، میں ان ائمہ کو اعتراضات سے برتر سمجھتا ہوں کیونکہ ان کے مقاصد نہایت اعلے تھے، اس لئے ان معترضین کی پیروی سے اجتناب کرنا چاہیئے[2]

جب امام نسائیؒ مصر آئے تو وہاں امام طحاوی سے مذاکرے رہے شاید اسی زمانہ میں ایک روایت امام اعظمؒ سے بھی کی ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائیؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ پر جو نقد کیا تھا اس سے رجوع کرلیا تھا۔[3]

وہ روایت یہ ہے۔ حدثنا علی بن حجر ثنا عیسٰی ھو ابن یونس عن النعمان یعنی ابا حنیفۃ عن عاصم عن ابی رزین عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال لیس علےٰ من اتی بھیمۃ حدٌّ۔

یہ حدیث ابن السنی کی روایت میں نہیں ہے، لیکن ابن الاحمر، ابوعلی الاسیوطی اور مغاربہ کے نسخوں میں موجود ہے[4]۔

ایک لطیفہ

سنن نسائی اپنی اہمیت کے باوجود امام بیہقی کے پاس نہیں تھی، علامہ ذہبی فرماتے ہیں" لم یکن عندہ سنن النسائی ولا

---

[1] المنتظم جلد ۶ ص۱۳۱ [2] الاعلان بالتوبیخ ص۶۵ [3] ماتمس الیہ الحاجۃ ص۳۳

[4] تہذیب التہذیب ترجمہ امام ابوحنیفہؒ۔

جامع الترمذی ولا سنن ابن ماجۃ[1] اسی طرح حاکم صاحب مستدرک کو بھی سنن کا سماع حاصل نہیں تھا، چنانچہ اس کا انہوں نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں تذکرہ بھی کیا ہے[2]۔

شروح وتعلیقات

سنن نسائی، صحاح ستہ کا رکن عظیم ہے مگر افسوس اس کے تعلیقات کی طرف وہ توجہ علماء نے نہیں کی جو دیگر کتب کی طرف کی گئی، چھ صدی گزرنے کے بعد علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے اس پر تعلیق لکھی چنانچہ مقدمہ زہر الربی علی المجتبیٰ میں لکھتے ہیں کہ جس طرح صحیحین، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی پر میں نے تعلیقات لکھی ہیں اسی طرح سنن نسائی پر تعلیق لکھی ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی چونکہ اس کی تصنیف پر چھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کی کوئی شروح وتعلیق مشہور نہیں ہے، اور علامہ سیوطی نے اپنی تعلیق کا نام زہر الربی رکھا ہے، مصنف کی دیگر تعلیقات کی طرح یہ تعلیق بھی بہت سی خوبیوں کی حامل ہے، دوسری تعلیق یا حاشیہ محمد بن عبد الہادی سندی المتوفی ۱۱۳۸ھ کا ہے، یہ حاشیہ سیوطی کی تعلیق سے زیادہ مفصل ہے اس میں متن کے ضروری مقامات کا حل اور اعراب کی تحقیق اور الفاظ غریبہ کی تشریح کی گئی ہے یہ دونوں حاشیے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

شرح[3] ابن الملقن:۔ مصنف کا اصل نام عمر بن علی بن محمد ہے، کنیت ابو حفص، لقب سراج ہے، المتوفی ۸۰۴ھ انہوں نے صحاح کی شروح لکھی ہیں، اس سلسلے میں زوائد النسائی علی الاربعہ بھی ایک جلد میں مرتب کی تھی، اس میں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۸۳

سنن نسائی کی ان احادیث کی شرح ہے جو بخاری ومسلم، ترمذی اور ابوداؤد میں نہیں ہیں[1]۔ مگر یہ نایاب ہے، مولوی وصی احمد حنفی کانپوری کی بھی اس پر تعلیق ہے اور اردو میں روض الربیٰ کے نام سے اس کا ترجمہ مولوی وحیدالزماں لکھنوی نے کیا ہے، مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی نے اس پر حاشیہ لکھا ہے۔

تعلیق[۴] حضرت الاستاذ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرت مولانا گنگوہیؒ وحضرت مولانا خلیل احمدؒ، اور حضرت مولانا محمد یحییٰ وغیرہم کے افادات کا مجموعہ ہے، اس کے علاوہ زہر الربیٰ، حاشیہ سندی وغیرہ دیگر شروح کو سامنے رکھ کر مرتب فرمایا ہے، اس میں مشکل مقامات کا حل، اغلاط طباعت کی تصحیح اور امام نسائی کے "ھذا منکر وھذا صواب" پر محققانہ بحث ہے، اور اس کتاب کی خصوصیات وتراجم پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے، سنن نسائی کی یہ مختصر شروح علم حدیث کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے، مگر افسوس کہ ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی، راقم نے حضرت الاستاذ کے صحاح ستہ پر افادات کے مجموعوں کے ساتھ اس کو بھی نقل کیا ہے!۔

*

---

[1] کشف الظنون جلد ۲ ص ۳۶

امام ابن ماجہؒ

نام ونسب

سلسلۂ نسب یہ ہے :- ابو عبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ ابن ماجہ الرابعی بالولار القزوینی[1] کنیت ابوعبداللہ، نام محمد، الربعی القزوینی نسبت اور ابن ماجہ عرف ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان کے دادا کا نام عبداللہ لکھا ہے، ماجہ کے بارے میں اختلاف ہے شاہ صاحبؒ کے نزدیک یہ آپ کی والدہ کا نام ہے، فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ ماجہ آپ کی والدہ تھیں، اس لئے ابن میں الف لکھنا چاہیئے تاکہ معلوم ہوجائے کہ ابن ماجہ محمد کی صفت ہے نہ کہ عبداللہ کی[2] مگر عجالۂ نافعہ میں شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ "ماجہ لقب پدر ابو عبداللہ است نہ لقب جد او نہ نام مادر[3]" علامہ ابن کثیر نے حافظ خلیل قزوینی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ماجہ یزید کا لقب ہے[4]، چونکہ قبیلۂ ربیعہ سے انکا رشتۂ موالات تھا، اس لئے ان کو ربعی اور مولیٰ ربیعہ کہا جاتا ہے، جس طرح امام بخاریؒ کو جعفی کہا گیا ہے۔

قزوینی قزوین کی طرف نسبت ہے جو ایران کا مشہور شہر ہے، اسی کو امام صاحبؒ

---

[1] وفیات الاعیان جلد ٢ ص ٣٠٥ [2] بستان ص ١١٣ [3] عجالۂ نافعہ ص ٢٨ [4] البدایہ والنہایہ جلد ٢ ص ٥٢

کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

پیدائش وابتدائی حالات

امام ابن ماجہ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے[1] انہوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں اس وقت قزوین میں بڑے بڑے علمار مثلاً علی بن محمد ابوالحسن طنافسی المتوفی ۲۳۳ھ عمرو بن رافع ابوحجر بجلی (المتوفی ۲۳۷ھ) اسماعیل بن ابوسہل قزوینی (المتوفی ۲۴۷ھ) ہارون بن موسیٰ تمیمی (المتوفی ۲۴۸ھ) محمد بن ابی خالد قزوینی[2] وغیرہ مسند درس و افتار پر جلوہ افروز تھے، امام صاحبؒ نے پہلے ان سے استفادہ کیا، افسوس ہے کہ امام صاحب کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے، بظاہر ابتدار عمر سے سماع حدیث کا آغاز کیا ہوگا۔

سماع حدیث کیلئے سفر

قیاس ہے کہ امام صاحب نے ۲۳۰ھ کے بعد سفر کا آغاز کیا ہوگا، اس وقت عمر کا اکیسواں (۲۱) سال تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ علم حدیث انتہائی عروج پر تھا، امام صاحب نے طلب حدیث میں مختلف شہروں کی خاک چھانی۔

مؤرخ ابن خلکان کا بیان ہے: "ارتحل الی العراق والبصرة والکوفة وبغداد ومکة والشام ومصر والری لکتب الحدیث[3]" (حدیث لکھنے کیلئے عراق بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ، شام ومصر اور رے کا سفر کیا)۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "سمع بخراسان والعراق والحجاز ومصر والشام وغیرھا من البلاد[4]" (خراسان، عراق، حجاز، مصر وشام اور دیگر بلاد میں سماع

---

[1] بستان ص۱۱۲ [2] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۵۳۱ [3] وفیات [4] تہذیب۔

حدیث کیا)۔

"وغیرھا من البلاد" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور شہروں کا سفر بھی کیا تھا جس کا ثبوت ان کے شیوخ کے ناموں سے بھی ملتا ہے۔

شیوخ وتلامذہ

ان کے شیوخ کا استقصار دشوار ہے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ جبارہ بن المغلس و ابراہیم بن المنذر و ابن نمیر و ہشام بن عمار اور اس طبقہ کے دوسرے حضرات سے علم حدیث حاصل کیا، خصوصیت سے ابوبکر بن شیبہ سے استفادہ کیا[1]، ان کے شیوخ میں امام مالک اور لیث کے تلامذہ بھی ہیں[2]، ان کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے، علی بن سعید بن عبداللہ العسکری، ابراہیم بن دینار الجرشی الہمدانی احمد بن ابراہیم قزوینی جد ابویعلی خلیلی، ابوطیب احمد بن روح شعرانی، اسحٰق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، حسین بن علی، سلیمان بن یزید قزوینی، محمد بن عیسیٰ اصفار، ابوالحسن علی بن ابراہیم بن سلمہ قزوینی، ابوعمرو احمد بن مدنی اصبہانی و آخرون یعنی ان کے علاوہ اور بھی ہیں[3]۔

علمار کا اعتراف کمال

امام صاحبؒ کے فضل وکمال اور جلالتِ شان، حفظ حدیث کا اعتراف ہر دور کے علمار و تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔

مؤرخ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ "کان اماماً فی الحدیث عارفا بعلومہ وجمیع ما یتعلق[4]"

علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ "ھو ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ

---

[1] بستان ص۱۲۵ [2] مرقاۃ جلد ۱ ص۲۳ [3] تہذیب بحوالہ مذکور [4] وفیات جلد ۳ ص۳۰۸

صاحب کتاب السنن المشھورۃ وھی دالۃ علی عملہ وعلمہ وتبحرہ و اطلاعہ واتباعہ للسنۃ فی الاصول والفروع[1]۔"

محدث ابویعلیٰ خلیلی کے الفاظ ہیں" ابن ماجہ ثقۃ کبیر متفق علیہ محتج بہ لہ معرفۃ بالحدیث وحفظہ[2]۔"

علامہ ذہبیؒ کی رائے ہے۔" قد کان ابن ماجہ حافظاً صدوقاً واسع العلم[3]۔"

مسلک امام صاحبؒ کا مسلک متعین طور پر معلوم نہیں ہو سکا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک امام احمدؒ کے مسلک کی طرف میلان تھا[4]، مگر مولانا انور شاہ کی تحقیق ہے کہ شاید امام ابن ماجہ شافعیؒ تھے[5]، علامہ طاہر جزائری فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ وغیرہ علماء وائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے[6]، بلکہ ائمہ حدیث امام شافعیؒ، احمدؒ اسحاقؒ اور ابو عبیدہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے یعنی اہل عراق کے مذہب کے مقابل میں اہل حجاز کی طرف زیادہ مائل تھے[7]، جس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے۔

وفات حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ میں نے قزوین میں امام ابن ماجہ کی تاریخ کا نسخہ دیکھا تھا، جو عہد صحابہؓ سے لے کر ان کے زمانہ تک رجال اور امصار کے حالات پر مشتمل ہے، اس تاریخ کے آخر میں امام صاحبؒ کے شاگرد جعفر بن ادریس کی یہ تحریر ہے کہ ابوعبداللہ محمد بن یزید نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اور سہ شنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو دفن کئے گئے میں نے خود ان سے سنا

لہ البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۵۲ ۔ ۲ہ تہذیب ۔ ۳ہ سیر اعلام النبلاء ۔ ۴ہ التقریب ۔ ۵ہ الانصاف

۶ہ معارف السنن جلد ۱ ص ۲۲ ۔ ۷ہ توجیہ النظر ص ۱۸۵

ہے، وہ فرماتے تھے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا تھا، اس حساب سے وفات کے وقت ان کی عمر چونسٹھ ۶۴ سال کی تھی، ان کی وفات پر علماء نے مرثیے لکھے۔

تصنیفات | مورخین نے امام صاحبؒ کی بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے، التفسیر و التاریخ والسنن۔ تفسیر کے متعلق ابن کثیر لکھتے ہیں "لابن ماجہ تفسیر حافل" علامہ سیوطی نے الاتقان میں اس کو تفسیر ابن جریر کے طرز کی تصنیف بتایا ہے، التاریخ، اس کو ابن خلکان نے تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیر نے تاریخ کامل سے تعبیر کیا ہے۔

سنن ابن ماجہؒ اور اس کی خصوصیات

ان میں سنن ابن ماجہ سب سے اہم کتاب ہے، جس پر ہم آئندہ صفحات میں تفصیل سے گفتگو کریں گے، اس کتاب کی افادیت واہمیت پر علماء محدثین کا اتفاق ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں "وکتابہ فی السنن جامع جید[1]" (ان کی کتاب سنن (احکام) میں ایک عمدہ جامع ہے)۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہایت مفید ہے اور مسائل فقہ کے لحاظ سے اس کی ترتیب وتبویب ہے[2]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس اجمال کی یہ تفصیل فرمائی ہے "وفی الواقع از حسن ترتیب وسرد احادیث بے تکرار واختصار آنچہ ایں کتاب دارد ہیچ از کتب ندارد[3]"

۲- اس کی "دوسری" نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت سی ایسی نادر حدیثوں پر

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۵۳۱ [2] الباعث الحثیث ص ۹۰ [3] بستان ص ۱۲۵

مشتمل ہے جن سے صحاح خمسہ خالی ہیں، علامہ ابوالحسن سندی فرماتے ہیں کہ مصنف نے بہت سے ابواب میں ایسی حدیثوں کو نقل کیا ہے جو پانچوں مشہور کتابوں میں نہیں ہیں اگرچہ وہ ضعاف ہیں، لیکن اسی مضمون کی دوسری حدیثیں بھی ہیں جن کو دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

۳۔ مصنف نے مختلف شہروں کی مخصوص روایات کی نشان دہی بھی کی ہے، ہے، مثلاً "باب کل مسکر حرام" کے تحت دوؔ روایتوں کو نقل کیا ہے:-

(۱) حدثنا یونس بن عبدالاعلیٰ ثنا ابن وھب اخبرنا ابن جریج عن ایوب بن ھانی عن مسروق عن ابن مسعودؓ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال کل مسکر حرام الخ

اس کے بعد فرماتے ہیں "ھذا حدیث المصریین" (یہ مصریوں کی حدیث ہے)

(۲) حدثنا علی بن میمون الرقی ثنا خالد بن عیان عن سلیمان بن عبداللہ بن الزبرقان عن یعلی بن شداد بن اوس سمعت معاویۃ یقول کل مسکر حرام، ھذا حدیث الرقیین، (یہ رقہ والوں کی حدیث ہے)

۴۔ مختلف احادیث کے ذیل میں بعض ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے حدیث نبوی سے اس عہد کے مسلمانوں کے تعلق ۔۔ چلتا ہے، مثلاً۔ "باب ماجاء فیما یستحب من التطوع بالنہار" میں حبیب بن ثابت کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس حدیث کے راوی ابواسحاق سبیعی کو مخاطب کرکے فرمایا "ما احب ان لی بحدیثك ھذا ملاء مسجدك ذھبًا" (مجھ کو تم نے جو حدیث سنائی اس کے بدلے میں تمہاری مسجد کے برابر بھرا ہوا سونا لینا بھی پسند نہیں کرتا)۔

۵ - (پانچویں) خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پانچ ثلاثی حدیثیں بھی ہیں جب کہ امام مسلم وامام نسائی کی سب سے عالی روایات رباعیات ہیں جو سنن ابن ماجہ میں بکثرت موجود ہیں، البتہ صحیح بخاری میں بائیس[۲۲] اور سنن ابی داؤد وجامع ترمذی میں ایک ایک ہے۔

یہ پانچوں روایات ایک ہی سند سے مروی ہیں، اگرچہ امام ابن ماجہ کے طبقہ کے لحاظ سے بہت عالی ہیں، مگر سند کے اعتبار سے ان کا کوئی خاص وزن نہیں ہے، اس کے ایک راوی کثیر بن سلیم پر محدثین نے جرح کی ہے، وہ روایات حسب ذیل ہیں۔

(۱) حدثنا جبارة بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم سمعت انس بن مالك یقول قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من احب ان یکثر اللہ خیر بیته فلیتوضا اذا حضر غداءه واذا رفع "باب الوضوع عند الطعام"

(۲) حدثنا جبارة بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم عن انس بن مالك قال ما رفع من بین یدی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فضل شواء قط ولا حملت معه طنفسة۔[۱]

(۳) حدثنا جبارة بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم عن انس بن مالك قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخیر اسرع الی البیت الذی یغشی من لشفرة الی سنام البعیر۔[۲]

(۴) حدثنا جبارة بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم سمعت انس بن مالك یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما مررت بلیلة اسری بی بملاء الا قالوا امر امتك بالحجامة۔[۳]

(۵) حدثنا جبارة بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم عن انس بن مالك قال قال رسول

---

[۱] باب الشواء [۲] باب الضیافة [۳] باب الحجامة

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ھذا الامۃ مرحومۃ عذابہا بایدیہا فاذا کان یوم القیامۃ دفع الیٰ کل رجل من المسلمین رجلاً من المشرکین فیقال ھذہ فداءک من النار[1]۔

سنن ابن ماجہؒ کے متعلق امام ابوزرعہؒ رازی کا ارشاد

عبداللہ بن عبدالکریم ابن فروخ رازی، المتوفی ۲۶۴ھ علم حدیث کے مشہور امام ہیں، جن کے متعلق امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ابوحاتم، ابوزرعہ، ابوداره، یہ تین رتے میں ایسے اشخاص ہیں جن کی نظیر اس وقت روئے زمین پر موجود نہیں[2]۔

علامہ ذہبی، ابوزرعہ کے متعلق خود فرماتے ہیں " کان من افراد الدھر حفظا وذکاءً ودینا وعملاً وعلماً"[3] (یہ حفظ حدیث، ذکاوت، دین داری اور علم و عمل کے لحاظ سے ان لوگوں میں سے تھے جو یکتائے زمانہ ہوئے) انہوں نے سنن ابن ماجہ کو دیکھ کر یہ سند عطا فرمائی " اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو فن حدیث کی اکثر جوامع اور مصنفات بیکار و معطل ہو کر رہ جائیں گی[4]"۔

حافظ ابوزرعہ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی، آج ہمارے سامنے بہت سی حدیث کی کتابیں ہیں، جو صحت و قوت اسناد کے لحاظ سے اس سے کہیں فائق ہیں مگر ان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں جو سنن ابن ماجہ کو ملی جیسے صحیح ابن حبان، جس کے متعلق مؤرخ ابن العماد حنبلی نے تصریح کی ہے کہ " واکثر النقاد علی ان صحیحہ اصح من سنن ابن ماجہ[5]" اور اکثر ناقدین حدیث کا خیال ہے کہ صحیح ابن حبان سنن ابن ماجہ

---

[1] باب صفۃ امت محمد صلے اللہ علیہ وسلم [2] تذکرہ جلد ۲ ص ۳۰ [3] تذکرہ جلد ۲ ص ۳۰

[4] بستان ص ۱۲۲ [5] شذرات ترجمہ ابن حبان۔

سے اصح ہے)۔

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں شمار

حافظ ابن السکن نے اسلام کی بنیادی کتابیں چار بتائی ہیں، حافظ مندہ نے بھی مخرجین صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد اور امام نسائی ہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، بعد میں ابوطاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چار کتابوں کے ساتھ شمار کیا اور فرمایا کہ ان پانچوں کتابوں پر علماء مشرق و مغرب کا اتفاق ہے[1]۔ شیخ ابن صلاح م ۶۴۳ھ اور علامہ نووی م ۶۷۶ھ تک نے ان ہی پانچ کتابوں کے مصنفین کی وفیات بیان کی ہیں[2]، ان دونوں بزرگوں نے امام ابن ماجہ کو نظر انداز کر دیا ہے، اس لئے علامہ سیوطی نے علامہ نووی پر تدریب الراوی میں استدراک کیا ہے کہ

"لم یدخل المصنف سنن ابن ماجه فی الاصول وقد اشتهر فی عصر المصنف وبعده جعل الاصول ستة بادخاله فیها[3]"۔ (مصنف (علامہ نووی) نے سنن ابن ماجہ کو بنیادی کتابوں میں داخل نہیں کیا ہے، حالانکہ خود مصنف کے عہد میں اور ان کے بعد سنن ابن ماجہ کا چھ بنیادی کتابوں میں شمار مشہور ہو چکا تھا[4]) سب سے پہلے حافظ ابوالفضل محمد بن طاہر مقدسی ۵۰۷ھ ہیں، جنہوں نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں داخل کیا، ان کے بعد تمام مصنفین نے ان کی پیروی کی ہے[5]، ان کے بعد حافظ عبدالغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے الاکمال فی اسماء الرجال میں چھ کتابوں

---

[1] شروط الائمہ [2] مقدمہ ابن صلاح ص ۳۸۷ [3] تدریب ص ۳۰ [4] تدریب ص ۴۹ طبع جدید۔ [5] تدریب ص ۴۹ طبع جدید۔

کے رجال کو یکجا کیا۔

اس کے بعد حافظ بن طاہرؒ کے معاصر محدث زرینؒ م ۵۲۵ھ نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ کے ساتھ سنن ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالکؒ کی حدیثوں کو درج کیا اور انہیں کی اقتدا علامہ ابن الاثیر جزری م ۶۰۶ھ نے جامع الاصول میں کی ہے، اس کے برخلاف علامہ ابوسعید خلیلؒ بن کیکلدی العلائی م ۷۶۱ھ نے جو سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے سننؒ دارمی کو چھٹی کتاب قرار دیا ہے، شیخ محمد عابدؒ سندی نے شیخ علائی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ" انه قال لو قدم مسند الدارمی بدل ابن ماجه فكان سادسا لكان اولیٰ"[1] یعنی اگر سنن ابنؒ ماجہ کے بجائے سنن درامی کو چھٹی کتاب قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا، حافظ ابن حجرؒ نے بھی شیخ علائی کی ہمنوائی کی، علامہ سیوطی لکھتے ہیں " قال شیخ الاسلام ولیس ای الدارمی دون السنن الاربعة فی الرتبة بل لو ضم الی الخمسة فكان اولیٰ من ابن ماجه فانه امثل منه بكثير" شیخ الاسلام حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ دارمی کی کتاب رتبہ میں سنن اربعہ سے کم نہیں ہے، بلکہ اگر اس کو کتب خمسہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو ابن ماجہ کی بہ نسبت یہ اولیٰ ہے، کیونکہ وہ سنن ابنؒ ماجہ سے کہیں فائق ہے[2]، محدث عبدؒ الغنی نابلسی ... اپنی کتاب ذخائر المواریث فی الدلالۃ علیٰ مواضع الاحادیث میں لکھتے ہیں کہ چھٹی کتاب کے متعلق اختلاف ہے، پس اہل مشرق کے نزدیک ابوعبداللہ محمد ابنؒ ماجہ قزوینی کی کتاب کتاب السنن ہے، اور اہل مغرب کے نزدیک امامؒ مالکؒ ابن انس کی موطا ہے۔

---

[1] لامع ص ۲۲ [2] تدریب

لیکن علامہ سندی کا فیصلہ ہے کہ عام طور پر علماء متاخرین سنن ابن ماجہ کو حدیث کی چھٹی کتاب مانتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ جہاں تک قوت وصحت کا تعلق ہے، مؤطا کا مقام اس سے بہت بلند ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تو صحیحین پر اس کو ترجیح دی ہے، سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کرنے کی وجہ اس کی افادیت ہے، اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو مؤطا میں نہیں ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں " درج اھل العلم بالأثر والمتقدمون فیھم وکثیر من محققی المتاخرین ولما راہ بعضھم کتابا مفیدا اقوی النفع فی الفقہ ورای من کثرۃ زوائدہ علی المؤطا ادرجہ علی وھنہ علی الاصول"۔[1]

اسی طرح مسند دارمی کی اہمیت جو بھی ہو لیکن صحاح ستہ کی جگہ مدت ہوئی سنن ابن ماجہ سے پر ہو چکی ہے، مؤرخ ابن خلکان ۶۸۱ھ امام ابن ماجہ کے ترجمے میں لکھتے ہیں " وکتابہ فی الحدیث احد الصحاح الستۃ"[2] (حدیث میں ان کی کتاب صحاح ستہ میں ایک ہے)۔

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں مرتبہ

امام ابوالقاسم رافعی المتوفی ۶۲۳ھ فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث امام ابن ماجہ کی کتاب کو صحیحین یا سنن ابوداؤد وسنن نسائی کے برابر سمجھتے ہیں اور اس کی روایات سے سند لاتے ہیں،[3]

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں " کلھا جیاد سوی الیسیرۃ"[4] (سب حدیثیں اچھی

---

[1] الیانع الجنی بر حاشیہ کشف الاستار [2] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۵۴ [3] ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۳۳۵ [4] البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۵۵

ہیں سوائے چند کے)۔

علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ سنن ابن ماجہ بہت اچھی کتاب ہے، کاش اس میں چند واہی حدیثیں نہ ہوتیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے[۱]۔

ابوزرعہ کا بیان ہے کہ میں نے ابوعبداللہ ابن ماجہ کی کتاب کا مطالعہ کیا، اس میں چند معمولی احادیث پر کلام ہے، جن کی تعداد دس[۱۰] سے زیادہ نہ ہو گی[۲] باقی کتاب میں کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے۔

مگر علامہ ذہبیؒ نے ابوزرعہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس میں شاید تیس[۳۰] حدیثیں ایسی ہوں جن کی اسناد میں ضعف ہے[۳]، اس طرح امام ابوزرعہ کے دو قول ہو گئے ایک دس[۱۰] کا دوسرا تیس[۳۰] کا۔

ممکن ہے ان تیس[۳۰] حدیثوں سے مراد وہ حدیثیں ہوں جن کو علامہ ابن الجوزیؒ نے کتاب الموضوعات میں داخل کیا ہے، جس پر "التعقبات علی الموضوعات" میں تفصیلی بحث ہے، علامہ سیوطی نے ابوعبداللہ رُشیدؒ کے واسطے سے یہ نقل کیا ہے کہ امام ابن ماجہ نے ایسے لوگوں کی حدیثوں کی تخریج کی ہے جو کذب سے متہم ہیں، ان کی بعض احادیث صرف ان ہی کے واسطے سے مروی ہیں، شارح ابن ماجہ اپنی شرح میں فرماتے ہیں "وبالجملة فهو دون الكتب الخمسة فى المرتبة[۴]"

سنن ابن ماجہؒ کے متعلق ایک اہم غلط فہمی

سنن ابن ماجہؒ کی ان ضعیف روایتوں کی وجہ سے یہ کلیہ مشہور ہو گیا ہے جیسا کہ حافظ منیری نے فرمایا[۵] "کل ما انفرد به ابن

---

[۱] تذکرہ جلد۲ ص۱۸۹ [۲] شروط الائمہ ص۱۶ [۳] تذکرہ جلد۲ ص۱۸۹ [۴] الیانع الجنی ص۵۷

ماجه فهو ضعيف"۔ حافظ ابن حجر نے بھی تصریح کی ہے" فی السنن جامع جید کثیر الابواب والغرائب وفیه احادیث ضعیفة جدًا[1] "۔ مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس کلیہ سے اتفاق نہیں کیا ہے" ولیس الامر فی ذلک علی اطلاقه باستقرائی و فی الجملة ففیه احادیث کثیرة منکرة"۔ یعنی میرے استقراء کے مطابق یہ حکم علی الاطلاق نہیں لگایا جاسکتا ہے، اگرچہ فی الجملہ اس میں منکر احادیث کی تعداد زیادہ ہے، اور مزی کی تصریح کو رجال پر محمول کرنا اولیٰ ہے، حدیثوں پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے[2]۔

جن روایات میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور حسن بھی، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی تحقیق میں رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا، اور اپنی کتاب ابن ماجہ وعلم حدیث میں اسکو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

ان وجوہ کی بناپر ابن ماجہ کا مرتبہ سب سے اخیر میں رکھا گیا ہے، علامہ ابوالحسن سندی شارح ابن ماجہ اپنی شرح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں "وبالجملة فهو دون الکتب الخمسة فی المرتبة"

تنبیہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں" ودریں کتب آنچہ اقسام حدیث است از صحاح وحسان وضعاف ہمہ موجود است وتسمیہ آں بصحاح بطریق تغلیب است"۔ (جلد ۱)[3] "ان کتابوں (صحاح ستہ) کی جتنی حدیثیں موجود ہیں ان پر صحاح کا اطلاق تغلیباً کیا جاتا ہے، یہ واضح رہے کہ صحاح ستہ میں صحت کے لحاظ سے فرق مراتب مجموعی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے، یہ مطلب نہیں کہ صحاح خمسہ کی ہر حدیث سنن ابن ماجہ کی ہر روایت پر صحت میں فوقیت رکھتی ہے۔

---

[1] تہذیب التہذیب [2] تہذیب التہذیب [3] مسک الختام جلد اص۱ از نواب صدیق حسن خان۔

تعداد ابواب واحادیث

سنن ابن ماجہ میں ۳۲ ستبیس کتابیں، ۱۵۰۰ پندرہ سو ابواب اور ۴۰۰۰ چار ہزار حدیثیں ہیں[1]، جو چند کے سوا سب کی سب عمدہ ہیں[2]۔

سلسلہ روایت

ابن ماجہ کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، اور متعدد لوگوں نے اس کتاب کو امام صاحبؒ سے روایت کیا ہے، لیکن سب سے زیادہ جس کی روایت کو حسن قبول حاصل ہوا، وہ شیخ ابوالحسن قطان ہیں ان کے نسخے میں بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے بھی منقول ہیں، مطبوعہ نسخوں میں قال ابوالحسن حدثنا سے یہی مراد ہیں، یہ اپنے زمانے کے بڑے عالم اور محدث تھے، ان کی ولادت ۲۵۴ھ اور وفات ۳۴۵ھ میں ہوئی، سنن ابن ماجہ کی اہمیت کی بنا پر مختلف زمانے کے علماء نے اس کی جانب اعتنا کیا، اس کی شرحیں، حواشی اور دوسرے متعلقات پر کتابیں لکھیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

شروح ومتعلقات

(۱) شرح ابن ماجہ :- امام حافظ علاء الدین مغلطائی ابن قلیج بن عبداللہ الحنفی م ۷۶۲ھ سب سے پہلی شرح ہے جو جامعیت کے باوجود نامکمل رہ گئی، صرف ایک حصہ کی شرح پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۲) شرح ابن رجب حنبلی م ۷۹۵ھ۔

(۳) ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ، شیخ سراج الدین عمر بن علی الملقن م ۸۰۴ھ یہ صرف زوائد یعنی ان روایات کی شرح ہے جو کتب خمسہ میں موجود نہیں ہیں۔

---

[1] تذکرہ ص ۱۸۹ [2] بستان المحدثین ص ۱۲۵

(۴) الدیباجہ :- شیخ کمال الدین محمد موسیٰ دمیری م ۸۰۸ھ، یہ شرح پانچ جلدوں میں ہے۔

(۵) نور مصباح الزجاجہ :- شیخ علی بن سلیمان مالکی مغربی، علامہ سیوطی کی شرح مصباح الزجاجہ شرح سنن ابن ماجہ کا اختصار کیا ہے، مصر میں طبع ہو چکی ہے۔

(۶) شرح ابن ماجہ :- ابو الحسن محمد بن عبد الہادی حنفی المتوفی ۱۱۸۲ھ اس میں ضبط الفاظ، حل غریب اور بیانِ اعراب پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔

(۷) انجاح الحاجہ شرح سنن ابن ماجہ۔ شیخ عبد الغنی بن ابی سعید مجددی م ۱۲۹۵ھ یہ ایک مختصر تعلیق ہے۔

(۸) حاشیہ بر سنن ابن ماجہ۔ مولانا فخر الحسن گنگوہی، یہ مشہور و متداول حاشیہ ہے اس میں علامہ سیوطی اور مولانا عبد الغنی مجددی دونوں کی شرحوں کو مع مزید اضافہ کے جمع کیا ہے۔

(۹) مفتاح الحاجہ، شیخ محمد علی۔ یہ حاشیہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

(۱۰) المجرد فی اسماء الرجال ابن ماجہ کلہم سوی من اخرج منہم فی احد الصحیحین۔ امام ذہبی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔

(۱۱) ماتمس الیہ الحاجہ اور ابن ماجہ و علم حدیث۔ یہ دونوں کتابیں مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی کی تصنیف ہیں، ان میں علم حدیث اور سنن ابن ماجہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے حدیث کے طالب علموں کے لئے ان کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

*

امام طحاویؒ

امت نے جن محدثین کے مجموعوں کو صحاح ستہ کا درجہ دیا ہے، ان کے ہم عصر امام طحاویؒ بھی ہیں، جو علم وتحقیق میں مجددانہ شان رکھتے ہیں، حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں۔" وهو امام مجتهد ومجدد کما قال ابن الأثیر الجزری" اس کا مطلب یہ ہے کہ شرح حدیث اور اس کے محامل وغوامض اور بحث وتحقیق کے لحاظ سے ان کو مجدد کہا گیا ہے متقدمین اپنی کتابوں میں بحث وتحقیق کے بغیر روایات نقل کرتے چلے آتے ہیں، امام طحاویؒ نے بحث وتحقیق کی جدید راہ کھولی[1]

ان کی کتاب شرح معانی الآثار اپنی خصوصیات وفوائد کے لحاظ سے ان تمام کتابوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ محدثین عظام کی بزم میں امام طحاویؒ اور ان کے کارنامے کا مختصر اُتعارف کرایا جائے۔

---

[1] معارف السنن جلد ا صـ۱۱۵

نام ونسب احمد نام ابو جعفر کنیت، الآزدی الحجری المصری الطحاوی نسبت ہے شجرۂ نسب یہ ہے۔

ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ الازدی الحجری المصری الطحاوی۔

جمہور محدثین و مورخین کا اس نسب نامے پر اتفاق ہے [۱]

امام موصوف کا تعلق چونکہ یمن کے مشہور قبیلہ آزد کی شاخ حجر سے تھا اس لئے اس کی طرف منسوب ہو کر آزدی و حجری کہلاتے ہیں، چونکہ امام صاحبؒ کے آباؤ اجداد فتح اسلام کے بعد مصر آکر آباد ہو گئے تھے [۲] اس لئے مصر کی طرف بھی نسبت کی گئی ہے۔

طحاوی طحا صعید مصر میں ایک گاؤں ہے جس کی طرف منسوب ہو کر طحاوی کہلاتے ہیں [۳]، اگرچہ صاحب معجم البلدان کی تحقیق یہ ہے کہ امام موصوف طحا کے باشندہ نہیں تھے، بلکہ اس کے قریب ہی ایک مختصر آبادی جو تقریباً دس مکانات پر مشتمل تھی جس کو طحطوط کہتے ہیں، اس کو امام صاحبؒ کے وطن عزیز ہونے کا شرف حاصل ہے، مگر امام صاحبؒ نے طحطوطی نسبت کو پسند نہ فرمایا، بلکہ اپنے وطن سے قریبی آبادی طحا کی طرف نسبت کی [۴]

پیدائش، وفات سن پیدائش میں قدرے اختلاف ہے، ۲۳۸ھ و ۲۲۹ھ بتایا گیا ہے، مگر مؤرخ ابن خلکان نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے [۵]۔ علامہ ذہبی نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے، کیونکہ خود امام طحاوی سے یہی روایت ہے، سن وفات کے متعلق جمہور کی رائے ۳۲۱ھ ہے، تاریخ ولادت مصطفیٰ ۲۲۹ مدت عمر محمد ۹۲، اور تاریخ وفات محمد مصطفیٰ ۳۲۱، قبر مبارک مصر میں امام شافعیؒ کے مزار کے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ص۲۹ و ص۳۰ ولسان المیزان جلد ۱ ص۱۷۵ [۲] الجواہر المضیئہ [۳] الحاوی ص۸

[۴] معجم البلدان جلد ۶ ص۶۰ [۵] وفیات الاعیان جلد ۲ ص۵۳ والفوائد السنیۃ ص۳۸ والبدایۃ والنہایہ جلد ۱۳ ص۱۷۴

پہلے واقع ہے۔

مصر ضروری معلوم ہوا کہ امام صاحبؒ نے جس علم و دین کے گہوارے میں شعور کی آنکھیں کھولی تھیں اس کی علمی و دینی مرکزیت کو بیان کیا جائے، مصر وہ سرزمین ہے، جہاں تین سو صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے مبارک قدم آئے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے الدر السحابہ فی من دخل مصر من الصحابہ[1] میں ان سب کا تذکرہ لکھا ہے، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ مصر کو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں فتح کیا تھا۔ صحابہ کرامؓ کی ایک خلقت یہاں آکر سکونت گزیں ہوئی اور تابعین کے زمانہ میں یہاں علم کی کثرت رہی پھر عمرو بن الحارثؒ یحییٰ بن ایوب، حیوۃ بن شریح، لیث بن سعد، ابن لہیعہ کے دور میں اور زیادتی ہوئی جو ابن وہب، امام شافعیؒ، ابن القاسم اور ان کے تلامذہ کے زمانے تک باقی رہی، اس کے بعد فرماتے ہیں " وما زال بہا علم جم الیٰ ان ضعف ذلک باستیلاء العبیدین الرافضۃ علیہا سنۃ ۳۵۸ھ ثمان و خمسین وثلث مأۃ " (اور وہاں برابر خوب علم رہا تا آنکہ ۳۵۸ھ میں عبیدی رافضیوں کے استیلار کی بنا پر اس میں ضعف آگیا) امام شافعی کے مذہب جدید کی تدوین یہیں ہوئی[2]۔ حضرت نافعؒ جو عبداللہ ابن عمرؓ کے تلمیذ رشید ہیں اور تیس ۳۰ سال ان کی خدمت میں رہے ہیں، انہیں حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اپنے دورِ خلافت میں مصر معلم بنا کر بھیجا تھا اور لیث بن سعد یہیں کے رہنے والے تھے، جن کے متعلق امام شافعیؒ فرماتے ہیں " اللیث افقہ من مالکؒ الا انہ ضیعہ اصحابہ" (لیث امام مالکؒ سے زیادہ افقہ تھے پر ان کے شاگردوں نے انہیں

---

[1] اس رسالہ کو حسن المحاضرہ میں بتمام و کمال نقل کر دیا ہے [2] الاعلان بالتوبیخ للسخاوی ص ۱۳۹

ضائع کر دیا) حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں، ضائع کر دینے سے امام شافعیؒ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مالکؒ وغیرہ کے تلامذہ نے ان کی فقہ کو مدون کیا امام لیث کے شاگردوں نے نہیں کیا۔[1]

چونکہ اکثر قضاۃ وہاں کے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر تھے، اس لئے فقہ حنفی کی بھی کافی شہرت تھی۔

تحصیل علم

امام موصوف علم کی طلب میں مصر آئے اور وہاں اپنے ماموں ابراہیم مزنی جو امام شافعیؒ کے اجل تلامذہ میں سے تھے، ان سے پڑھتے رہے، اس لئے ابتداءً امام شافعیؒ کے مقلد تھے، مگر چند سالوں کے بعد جب احمد ابن ابی عمران حنفی مصر کے قاضی بن کر آئے تو ان کی صحبت میں بیٹھے اور ان سے علم حاصل کیا، حتیٰ کے ان کے علم وفضل سے متاثر ہو کر فقہ شافعی کے بجائے فقہ حنفی کے متبع ہو گئے۔[2] محمد بن احمد شروطی نے امام طحاوی سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے ماموں کی کیوں مخالفت کی اور کیوں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کو اختیار کیا؟ تو فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ ماموں ہمیشہ امام ابوحنیفہؒ کی کتابوں کو مطالعہ میں رکھتے تھے، پس اسی لئے میں بھی اس کی طرف منتقل ہو گیا۔[3] علامہ کوثری نے اس روایت کو بالتفصیل نقل کیا ہے کہ امام طحاوی نے اپنے ماموں مزنی کو دیکھ کر خود امام صاحبؒ کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا، وہ فرماتے ہیں کہ ان کتابوں نے مجھے مذہب حنفی کا گرویدہ بنا لیا، جس طرح میرے ماموں مزنی کو بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرف مائل کر دیا تھا، جیسا کہ مختصر مزنی سے ظاہر ہے کہ بہت

---

[1] الرحمۃ الغیثیہ فی الترجمۃ اللیثیہ از حافظ ابن حجر ص۶ [2] معجم البلدان جلد ۶ ص۳۱ [3] الفوائد البہیہ ص۳۸

[4] وفیات الاعیان جلد ۲ ص۵۳۔

سے مسائل میں امام شافعیؒ سے اختلاف کیا ہے[۱]۔ چونکہ یہ خود امام طحاوی کا اپنا بیان ہے، اس لئے یہی صحیح و معتبر ہے، اس سلسلے میں جو بہت سے واقعات لسان المیزان وغیرہ میں نقل کئے گئے ہیں وہ سب بے سند و خلاف درایت ہیں۔

سماع حدیث کیلئے سفر

امام صاحبؒ نے امام مزنی کے علاوہ مصر کے دیگر محدثین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر فقہ و حدیث کو حاصل کیا جس میں چند کے نام یہ ہیں :- یونس بن اعلیٰ المتوفی ۲۶۴ھ جن کے متعلق ذہبیؒ کے شاندار الفاظ یہ ہیں "عالم الدیار المصریۃ الامام الحافظ المقرئ" اور ہارون بن سعید ایلی، محمد بن عبداللہ بن عبدالحکیم، بحر بن نصر، عیسیٰ بن شرود، ان کے علاوہ ابن عیینہ اور ابن وہب کے تلامذہ اور اس طبقہ کے دیگر مشائخ سے استفادہ کیا، اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کے بعد ۲۶۸ھ میں ملکِ شام کا رخ کیا، جہاں ابو حازم قاضی دمشق سے ملاقات کی اور ان سے فقہ حاصل کی، اس کے بعد ۲۶۹ھ میں مصر واپس تشریف لائے[۲]۔

علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ جو شخص امام طحاوی کے شیوخ کے تراجم پر نظر ڈالے گا تو اسے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ان کے شیوخ میں مصری، مغاربہ، یمنی، بصری، کوفی، حجازی، شامی، و خراسانی مختلف ممالک کے حضرات نظر آئیں گے جن سے امام موصوف نے اخبار و آثار کا علم حاصل کیا، مصر اور اس کے علاوہ دیگر شہروں کے شیوخ سے تحصیل علم کیلئے بادیہ پیمائی کی، یہی نہیں بلکہ مصر میں ہر وارد ہونے والے محدث و عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے، یہاں تک کہ وہ علوم جو مختلف اشخاص کے

---

[۱] الحاوی ص۱۶ [۲] لسان المیزان جلد ۱ ص۲۷۵

پاس پراگندہ تھے، ان سب کو امام موصوف نے سمیٹ لیا[1]۔

شیوخ واساتذہ

ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، ان کے ناموں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس دور کے ہر خرمنِ حدیث سے خوشہ چینی کی، جن میں امام بخاریؒ و امام مسلمؒ کے شیوخ بھی ہیں، کیونکہ امام بخاریؒ کا سنِ وفات ۲۵۶ھ ہے۔ اس وقت امام طحاوی ۲۷ سال کے تھے، اسی طرح امام مسلمؒ نے ۲۶۱ھ میں وفات پائی ہے جب کہ امام طحاویؒ ۳۲ سال کے تھے[2]۔ امام مالکؒ و امام محمدؒ کے اور تینوں کے واسطے سے امام اعظمؒ کے تلمیذ ہیں[3]، وہ ایسے مشائخ سے بھی روایت کرتے ہیں جن میں دیگر اصحابِ صحاح شریک ہیں، ان کی تعداد ۳۶ ہے تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ امانی الاحبار۔

تلامذہ

ان کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبانِ حدیث وفقہ کا مرجع بنا دیا تھا، اس لئے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، ان کی ایک مختصر فہرست پیش ہے۔

احمد بن قاسم خشاب، ابو الحسن محمد بن احمد اخمیمی، ویوسف میانجی، ابو بکر بن المقرئ طبرانی، احمد بن عبد الوارث زجاج، عبد العزیز بن محمد جوہری، قاضی صعید، محمد بن بکر ابن مطروح اور ان کے علاوہ دیگر حضرات ہیں[4]۔

علمی مرتبہ

حفظِ حدیث کے ساتھ وہ فقہ واجتہاد میں بہت بلند مقام رکھتے تھے، ملا علی قاریؒ نے ان کو طبقۂ ثالثہ کے مجتہدین میں شمار کیا ہے[5]

---

[1] الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص۹ [2] الحاوی ص۹ [3] معارف السنن جلد ۱ ص۱۱۴

[4] لسان المیزان جلد ۲ ص۲۷۵، بستان المحدثین ص۹۶۔

فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ مجتہدین ہیں جو ان مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں جس میں صاحبِ مذہب سے کوئی روایت منقول نہ ہو جیسے خصاّب، ابوجعفر طحاوی، ابوالحسن کرخی، شمس الائمہ سرخسیؒ فخرالاسلام بزدوی، فخرالدین قاضی خان اور ان جیسے حضرات ہیں، یہ لوگ امام صاحبؒ سے اصول و فروع میں مخالفت نہیں کرتے، البتہ حسب اصول و قواعد ان مسائل میں احکام کا استنباط کرتے ہیں جس میں صاحبِ مذہب سے کوئی نص نہ ہو[1] مگر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مختصر طحاوی دلالت کرتی ہے کہ (امام طحاوی) مجتہد منتسب تھے، محض امام ابوحنیفہؒ کے مقلد نہ تھے، کیونکہ بہت سے مسائل میں ان کے مذہب سے اختلاف کیا ہے[2]، اس لئے مولانا عبدالحی صاحبؒ نے امام ابویوسفؒ وامام محمدؒ کے طبقے میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں کہ ان کا مرتبہ ان دونوں سے کم نہیں تھا[3]۔

فنِ جرح وتعدیل اور امام طحاویؒ

فنِ رجال وجرح وتعدیل میں امام طحاویؒ کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اس فن میں مستقل کتابیں بھی لکھی تھیں، تاریخ کبیر اور نقض المدلسین جو کرابیسی کے رد میں ہے، اسی طرح ابوعبید کے کتاب النسب پر مستقل تردید لکھی ہے، ان کے تلامذہ میں بھی ابن یونس وطبرانی ابن عدی جیسے ائمہ جرح وتعدیل گزرے ہیں، مگر افسوس، ان حضرات کی کتابیں آج ناپید ہیں، اب مشکل الآثار میں جہاں رواۃ پر اور معانی الآثار میں جہاں احادیث متعارضہ پر کلام کرتے ہیں، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، البتہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتابیں اس فن پر موجود مطبوع ہیں مگر انہوں

---

[1] مقدمہ امانی بحوالہ ذیل الجواہر المضیئہ [2] بستان ص۹۶ [3] التعلیقات السنیہ ص۳۸۔

نے امام طحاویؒ کا ذکر نہ ان کے جلیل القدر شیوخ کے حالات میں کیا اور نہ ہی اعلیٰ درجہ کے تلامذہ میں درج کیا ہے، البتہ لسان المیزان وتہذیب میں بوقت ضرورت جرح وتعدیل میں امام طحاوی کا قول نقل کر دیا ہے، رجال حنفیہ کے متعلق اس طرزِ عمل کا شکوہ ان کے شاگرد حافظ سخاوی نے بھی کیا ہے، حافظ صاحب کے متعلق جو شکایت امام سخاوی کو ہے اسی طرح علامہ سبکی شافعی کو علامہ ذہبیؒ سے ہے۔[1]

قاضی ابن شحنہ، شرح ہدایہ کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں "حتی قال السبکی انہ لاینبغی ان یوخذ من کلامہ ترجمۃ شافعی ولاحنفی وکذا لاینبغی ان یوخذ من کلام ابن حجر ترجمۃ حنفی متقدم ولامتأخر" یہاں تک کہ علامہ تقی الدین سبکی فرماتے ہیں کہ (ذہبیؒ) کے کلام سے کسی شافعی وحنفی کا ترجمہ لینا بھی مناسب نہیں، (قاضی ابن شحنہ فرماتے ہیں) کہ اسی طرح حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے کسی متقدم ومتاخر حنفی کا ترجمہ لینا بھی مناسب نہیں ہوسکتا۔[2]

امام طحاوی کے کمالات کا اعتراف

امام صاحبؒ کے فضل و کمال، تفاہت و دیانت کا اعتراف ہر دور کے محدثین ومؤرخین نے کیا ہے، جیسے متقدمین میں طبرانی ابوبکر خطیب، حمیدی، ابن عساکر وغیرہ، اور متاخرین میں ابی الحجاج مزی، حافظ ذہبی علامہ ابن کثیر وغیرہ ہیں، واقعہ یہ ہے کہ امام طحاوی قرآن وحدیث سے استنباط وتفقہ میں

---

[1] الطبقات الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۹۷ [2] ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۲۷

(نوٹ) ذہبی کے میزان کے حاشیے پر امام صاحب کا ترجمہ الحاقی ہے کیونکہ مصنف نے مقدمہ میں خود صراحت کر دی ہے کہ ائمۂ متبوعین کے حالات انکی عظمت وجلالت کی وجہ سے بیان کرنیکی ضرورت نہیں (غیث الغمام ص ۴۶)

اپنے معاصرین و مابعد کے علماء میں نظیر نہیں رکھتے، انہیں اعلم الناس بمذہب الامام ابی حنیفہؒ[1] کہا گیا ہے۔

علامہ ابن عبدالبر مالکی فرماتے ہیں "کان الطحاوی من اعلم الناس بسیر الکوفیین واخبارھم وفقہہم مع مشارکتہ فی جمیع المذاہب[2]" امام طحاوی کوفیین کے سیر واخبار و فقہ کے بڑے عالم تو تھے ہی ساتھ ہی دیگر مذاہب سے بھی واقف تھے۔

ابن حماد حنبلی نے ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے "شیخ الحنفیۃ الثقۃ الثبت برع فی الحدیث والفقہ[3]"

ابن تغری نے احد الاعلام و شیخ الاسلام کا خطاب دیا، فرماتے ہیں کہ امام طحاوی تو فقہ و حدیث و اختلاف علماء و احکام ولغت ونحو وغیرہ علوم میں نظیر نہیں رکھتے تھے اور انہوں نے بہترین کتابیں تصنیف کیں[4]۔

علامہ ابن جوزیؒ نے یہ شاندار الفاظ استعمال کئے ہیں "کان ثبتا فہما فقیہا عاقلا[5]"

امام طحاوی کے ناقدین

امام طحاویؒ کی جلالتِ شان و ثقاہت کے باوجود بعض متاخرین علماء نے اعتراضات کئے ہیں، جو متقدمین کے اعتراف و توثیق کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے، مثال کے طور پر علامہ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں حدیث رَدِّ شمس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ طحاویؒ کے نقد حدیث کا معیار اہل علم سے مختلف تھا، شرح معانی الآثار میں احادیث مختلفہ

---

[1] عرف الشذی [2] لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۷۵ [3] شذرات الذہب۔

[4] النجوم الظاہرہ جلد ۳ ص ۲۳۹ [5] المنتظم جلد ۶ ص ۲۵۰

کو بیان کیا ہے، اور ان میں اس کو راجح قرار دیا جس کو از روئے قیاس حجت سمجھا ہے، ان کو دوسرے اہل علم کی طرح اسناد کی معرفت حاصل نہیں تھی، اگرچہ کثیر الحدیث وفقیہ اور عالم ہیں[۱]، ان کو علامہ ابن جوزیؒ کے کلام سے دھوکہ ہوا کیونکہ انہوں نے موضوع کہا ہے اور ان کا تشدد اس باب میں مشہور ہے، اس حدیث کی تصحیح بہت سے علمار نے کی ہے، حافظ ابن الفتح ازدی نے صحیح قرار دیا اور ابوزرعہ وابن العراقی نے حسن کہا، حافظ ابن حجرؒ نے ابن جوزی کی رائے کو خطا قرار دیا، یہ حدیث تعدد طرق سے مروی ہے، اس لئے امام طحاوی وخفاجی نے صحیح قرار دیا[۲]۔ علامہ سیوطیؒ نے بھی اللآلی المصنوعۃ میں اس کو صحیح بتایا ہے[۳]۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے مسلمہ بن قاسم اندلسی کے اعتراض کو لسان المیزان میں نقل کیا ہے، حالانکہ مسلمہ نے اسی طرح کا اعتراض جب امام بخاری پر کیا تو تہذیب التہذیب میں اس کی تردید کی ہے اور مسلمہ کو مجہول قرار دیا ہے۔

تصانیف مؤرخین کے اجمالی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ نے مختلف فنون پر تصانیف کی ہیں، متاخرین علمار سے زیادہ متقدمین نے ہمیشہ اسے قدر کی نظر سے دیکھا ہے، افسوس اس میں اکثر غیر مطبوع ہیں، اس کی فہرست پیش ہے:۔

(۱) معانی الآثار:۔ اس کا تفصیلی تعارف آئندہ کے صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔

(۲) مشکل الآثار:۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ آخری تصنیف[۴] ہے،

---

[۱] الفوائد البہیہ [۲] المقاصد الحسنہ ص۱۰۰ [۳] ظفر الامانی [۴] الفوائد البہیہ ص۳۸

اس میں مصنف نے احادیث کے تضاد کو رفع کیا ہے، اور ان سے احکام کا استخراج کیا ہے حیدر آباد سے جو چار جلدیں طبع ہوئی ہیں، وہ غالباً پوری کتاب کے نصف سے بھی کم حصہ ہے، قاضی ابن رشد نے بعض اعتراضات کے ساتھ اس کا اختصار کیا ہے۔ علامہ عینی کے شیخ قاضی جمال الدین یوسف بن موسیٰ ملطی نے اس اختصار کا بھی اختصار کیا ہے جو المعتصر من المختصر کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔

(۳) اختلاف العلماء ۳۰ جزء حدیثی اختلاف میں بیان کی جاتی ہے۔

(۴) کتاب احکام القرآن:- ۲۰ جزء میں ہے۔

(۵) کتاب الشروط الکبیر:- ۴۰ جزء میں ہے۔

(۶) کتاب الشروط الاوسط۔ (۷) کتاب الشروط الصغیر

(۸) مختصر الطحاوی۔ حیدر آباد سے چھپ کر مشہور و متداول ہو چکی ہے۔

(۹) نقض کتاب المدلسین۔ ۵ جزء میں کرابیسی کی کتاب المدلسین کا بہترین رد ہے۔

(۱۰) الرد علی ابی عبید (۱۱) التاریخ الکبیر

(۱۲) کتاب فی النحل واحکامہا (۱۳) عقیدۃ الطحاوی

(۱۴) سنن الشافعی۔ اس میں وہ سب حدیثیں جمع کر دی ہیں جو امام مزنی کے واسطے سے امام شافعیؒ سے سنی تھیں۔

علامہ عینی نے کہا ہے کہ (مسند شافعیؒ) کو روایت کرنے والے اکثر امام طحاوی کے واسطہ سے ہیں، اس لئے سننِ شافعی کو سنن طحاوی بھی کہا گیا ہے۔

(۱۵) شرح المغنی (۱۶) النوادر الفقہیہ:- ۱۰ جزء میں ہے۔

(۱۷) النوادر والحکایات:۔ تقریباً ۲۰ جزر میں ہے۔

(۱۸) جزر فی حکم ارض مکۃ
(۱۹) جزر فی قسم الفئ والغنائم۔
(۲۰) کتاب الاشربۃ
(۲۱) الرد علی عیسٰی بن ابان۔
(۲۲) جزر فی الرزیۃ
(۲۳) شرح الجامع الصغیر للامام محمدؒ۔
(۲۴) شرح الجامع الکبیر لہٗ
(۲۵) کتاب المحاضر والسجلات۔
(۲۶) کتاب الوصایا
(۲۷) کتاب الفرائض
(۲۸) اخبار ابی حنیفہ واصحابہ
(۲۹) کتاب التسویۃ بین حدثنا واخبرنا
(۳۰) کتاب صحیح الآثار
(۳۱) اختلاف الروایات علی مذہب الکوفیین۔
(۳۲) کتاب العزل
(۳۳) مناقب ابی حنیفہؒ۔

شرح معانی الآثار

شرح معانی الآثار کو معانی الآثار بھی کہا گیا ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ امام صاحب کی پہلی تصنیف ہے[1]۔ مگر ان کی کتابوں میں نہایت اہم ومشہور ومتداول ہے، علماء نے خصوصیت سے اس کی طرف اعتنا کیا ہے حافظ سخاویؒ نے جن کتبِ حدیث کے مطالعے کا خصوصی مشورہ دیا ہے اس میں شرح معانی الآثار بھی ہے۔

علامہ امیر اتقانی فرماتے ہیں "فانظر شرح معانی الآثار هل ترى له نظيرا في سائر المذاهب فضلا عن مذهبنا هذا"[2] شرح معانی الآثار پر غور کرو، کیا تم ہمارے اس مذہب حنفی کے علاوہ دیگر مذاہب میں بھی اس کی نظیر پا سکتے ہو؟ علامہ عینی نے برسوں اس کا درس دیا ہے۔[3]

---

[1] الفوائد البہیہ ص ۳۸ [2] فتح المغیث ص ۳۲۹ [3] الفوائد البہیہ ص ۱۸

معانی الآثار کا کتب حدیث میں مقام

علامہ عینیؒ نے اس کو دوسری بہت سی کتب پر ترجیح دی ہے، فرماتے ہیں کہ سننِ ابی داؤد و جامع ترمذی و سننِ ابن ماجہ وغیرہ پر اس کی ترجیح اس قدر واضح ہے، کہ اس میں شک کوئی ناواقف ہی کرے گا۔[1]

علامہ ابنِ حزم نے اپنے جمود و تشدد کے باوجود اس کو سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے درجہ پر رکھا ہے[2]، علامہ ابنِ خلدون، امامِ دارقطنی وغیرہ کی تقلید میں لکھ گئے کہ طحاویؒ کے شرائط متفق علیہ نہیں ہیں کیونکہ مستور الحال وغیرہ سے بھی روایت کی ہے اسلئے اس کا مرتبہ صحیحین و سنن کے بعد ہے[3]۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک امامِ طحاویؒ کی کتاب شرحِ معانی الآثار کا مرتبہ سننِ ابی داؤد کے قریب ہے کیونکہ اس کے رواۃ معروف ہیں، اگرچہ بعض متکلم فیہ بھی ہیں، اس کے بعد ترمذی، پھر سنن ابن ماجہ کا درجہ ہے[4]

معانی الآثار پر امام بیہقی کے اعتراض کا جواب

امام بیہقیؒ نے امامِ طحاوی اور ان کی کتاب معانی الآثار پر اعتراض کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ علم حدیث امام طحاوی کا فن نہیں تھا بلکہ انہوں نے کچھ حاصل کر لیا تھا، مگر انہیں اس میں رسوخ و اتقان حاصل نہیں، آگے چل کر فرماتے ہیں کہ شرحِ معانی الآثار میں انہوں نے بہت سی ضعیف حدیثوں کو اپنی رائے سے صحیح کہہ دیا، اور بہت سی صحیح کو ضعیف کہہ دیا۔

---

[1] الحاوی ص۱۲ [2] مقدمہ التعلیق الممجد [3] الحطہ ص۳۴ [4] فیض الباری جلد ا ص۵۷ و ص۵۸

شیخ عبدالقادر نے الجواہر المضیئہ میں اس پورے اعتراض کو نقل کر کے جواب دیا ہے کہ میں نے امام طحاوی کی کتاب کی شرح لکھی ہے، اور اس کی اسانید پر کلام بھی کیا ہے، صحاح ستہ، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ اور دوسری کتب حدیث سے مطابقت کر کے پرکھا بھی ہے، مگر حاشا وکلاّ! امام بیہقی نے جو اعتراض کیا ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے، اس شرح کا نام الحاوی فی بیان آثار الطحاوی' رکھا ہے، امام بیہقیؒ کے جواب میں قاضی القضاۃ علاء الدین ماردینی نے الجواہر النقی فی الرد علی البیہقی لکھی ہے، جس میں تمام اعتراضات کا جواب دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ جو اعتراض امام طحاوی پر کر رہے ہیں، اس کے مرتکب وہ خود ہیں، الجواہر النقی شائع ہو چکی ہے، اور سننِ بیہقی کے ساتھ بھی چھپ چکی ہے۔

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ جس طرح کے اعتراضات معانی الآثار پر کئے گئے ہیں اس طرح کے بلکہ اس سے زیادہ سخت اعتراضات تو سننِ اربعہ پر کئے گئے ہیں، اور یہ کتاب سنن بیہقی و سنن دارمی اور سنن دارقطنی سے بدرجہا فائق ہے[1]۔

معانی الآثار کی خصوصیات

اب ہم چند کتابی خصوصیات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو مقدمہ امانی الاحبار۔

(۱) اس میں بکثرت ایسی حدیثیں موجود ہیں جس سے دیگر کتب خالی ہیں۔

(۲) ایک حدیث کی مختلف اسانید جمع کر دیتے ہیں، جس سے ایک محدث کو بہت سے نکات و فوائد کا علم ہوتا ہے۔

---

[1] الفوائد البہیہ

(۳) غیر منسوب رواۃ کی نسبت اور مبہم راوی کا نام، مشتبہ کی تمیز، مجمل کی تفسیر، اضطراب وشکِ راوی سب کو نہایت وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

(۴) صحابہؓ وتابعین کے آثار، فقہاء کے اقوال اور ائمہ کی جرح وتعدیل بھی بیان کرتے ہیں، جس سے ان کے معاصرین کی کتابیں خالی ہیں۔

(۵) کبھی ترجمہ الباب کسی فقہی مسئلہ پر قائم کرتے ہیں اور باب کے تحت کی روایت سے ایسے دقیق استنباطات کرتے ہیں جس کی طرف اذہان کم منتقل ہو سکتے تھے۔

(۶) کتاب کو فقہی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا ہے، کبھی معلوم ہوتا ہے کہ باب کے تحت کی روایت بظاہر ترجمہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی مگر نہایت لطیف طریقے سے ترجمہ سے مناسبت پیدا کرنے کیلئے اس کی روایت کرتے ہیں مثلاً باب المیاہ کے تحت ان المسلم لا ینجس اور اعرابی کے مسجد میں بول والی حدیث ذکر کی ہے، یہ مقامات نہایت دقیق ہیں۔

(۷) ادلۂ احناف کے ساتھ دوسرے ائمہ کے دلائل بھی بیان کرتے ہیں اور اس پر نظر قائم کر کے پوری طرح محاکمہ کرتے ہیں جس سے تفقہ کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

شروح ومتعلقات

(۱) الحاوی فی تخریج معانی الآثار للطحاوی (للحافظ عبد القادر القرشی)

(۲) مبانی الاخبار (للعینی) چھ جلدوں میں موجود ہے جس میں رجال پر کلام نہیں نہیں کیا۔

(۳) نخب الاخبار فی رجال معانی الآثار (للعینی) علامہ عینی نے شرح

حدیث کے ذیل میں رجال پر بھی مفصل گفتگو ہے، یہ عمدۃ القاری شرح بخاری کے مثل ہے۔

(۴) معانی الاخبار فی رجال معانی الآثار (للعینی) اس کی تلخیص کشف الاستار کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔

ان کے علاوہ ابن عبد البر[5] اور علامہ زیلعی[6] نے معانی الآثار کی تلخیص کی ہے محمد باہلی کی کتاب تصحیح[7] معانی الآثار کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

حافظ قاسم بن قطلو بغا نے بھی طحاوی کے رجال پر ایک مستقل تصنیف الایثار فی رجال[8] معانی الآثار کے نام سے کی ہے۔

حافظ ابن حجر[9] عسقلانی نے بھی اتحاف المہرۃ میں جن دس[10] کتابوں کے اطراف جمع کئے ہیں ان میں معانی الآثار للطحاوی بھی شامل ہے۔

(۱۰) امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار۔ حضرت مولانا محدث الداعی الی دین اللہ والیٔ دار السلام محمد یوسف نور اللہ مرقدہٗ کی گرانقدر و معرکۃ الآرا شرح ہے، فی الواقع یہ تمام شروح سابقہ کا بہترین خلاصہ ہے، اس کتاب میں حضرت مولانا کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ اکثر متقدمین (حافظ و عینی کے پیشرو) علماء کے اقوال نقل کئے جائیں۔ جب متقدمین کا کوئی قول نہیں ملتا تو متاخرین کے اقوال علی الترتیب نقل کئے ہیں، اس شرح میں طحاوی کے مشکل مقامات کا حل پیش کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ شرح کی تکمیل نہ ہو سکی، حضرت مولانا کی زندگی میں صرف دو ہی جلدیں چھپ کر شائع ہو سکیں، کہ اچانک حضرت نور اللہ مرقدہٗ کا سانحۂ

وصال بیش آیا ؎

نہ سمجھے تھے کہ اس جانِ جہاں سے یوں جدا ہوں گے
یہ سنتے گو چلے آتے تھے اک دن جان جانی ہے

پہلی جلد کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں طحاوی کے شیوخ کی ایک مبسوط فہرست بھی پیش کی گئی ہے، اس مقالہ میں اس سے پوری طرح استفادہ کیا گیا ہے۔

(وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین)

کتاب کے اہم مصادر و مراجع کی اجمالی فہرست

اتحاف النبلاء المتقین :۔ نواب صدیق حسن خان

الادب المفرد :۔ امام بخاریؒ

احکام فی اصول الاحکام :۔ حافظ ابن حزم

اوجز المسالک فی شرح مؤطا مالک :۔ مولانا محمد زکریا

الانصاف فی سبب الاختلاف :۔ شاہ ولی اللہؒ

ابجد العلوم :۔ نواب صدیق حسن خان

اعلام الموقعین :۔ حافظ ابن قیمؒ

اختصار علوم الحدیث :۔ حافظ ابن کثیرؒ

القول المسدد فی الذب عن المسند :۔ حافظ ابن حجرؒ

اقوم المسالک :۔ محدث محمد زاہد کوثری

الاستقصار :۔ حافظ ابن عبد البر مالکی

امانی الاحبار :۔ مولانا محمد یوسفؒ

اشعۃ اللمعات :۔ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ

الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ :۔ حافظ ابن حجرؒ

الاکمال فی اسماء الرجال :۔ شیخ ولی الدین خطیب

الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ :۔ حافظ سخاوی

البدایہ والنہایہ :۔ حافظ ابن کثیرؒ

بستان المحدثین :۔ شاہ عبد العزیزؒ

بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع :۔ علامہ کاسانیؒ

بذل المجہود فی حل ابی داؤد :۔ مولانا خلیل احمدؒ

الباعث الحثیث :۔ حافظ ابن کثیرؒ

بلوغ الامانی :۔ محدث کوثریؒ

تدریب الراوی :۔ حافظ سیوطیؒ

تذکرۃ الحفاظ :۔ حافظ ذہبیؒ

تہذیب التہذیب :۔ حافظ ابن حجرؒ

التعقبات علی الموضوعات :۔ حافظ سیوطیؒ

تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی :۔

تزیین الممالک بمناقب امام مالک :۔ حافظ سیوطیؒ

تہذیب سنن ابی داؤد :۔ حافظ ابن قیمؒ

التلخیص الحبیر :۔ حافظ ابن حجرؒ

تفسیر ابن جریر :۔ طبری

تدوین حدیث :۔ مولانا مناظر احسن گیلانی

توجیہ النظر :۔ شیخ طاہر جزائریؒ۔

تلقیح فہوم اہل الاثر :۔ حافظ ابن جوزیؒ

التعلیق الممجد :- مولانا عبدالحئ لکھنوی فرنگی محلی

توالی التاسیس :- حافظ ابن حجرؒ

تانیب الخطیب :- محدث کوثریؒ

تقریب التہذیب :- حافظ ابن حجرؒ

الاتقان فی علوم القرآن :- حافظ سیوطیؒ

تاریخ الاسلام :- حافظ ذہبیؒ

توضیح الافکار :- امیر یمانیؒ

تہذیب الکمال :- حافظ مزی

تہذیب الاسماء واللغات :- امام نوویؒ

تنویر الحوالک :- علامہ جلال الدین سیوطیؒ

تعجیل المنفعۃ :- حافظ ابن حجرؒ

التعلیقات السنیۃ :- مولانا عبدالحئ فرنگی محلی

ترتیب المدارک :- مدارک :- قاضی عیاض

تاریخ بغداد :- خطیب بغدادی

تبییض الصحیفہ :- حافظ سیوطی

جامع بیان العلم :- حافظ ابن عبدالبر مالکی

جامع الاصول :- علامہ ابن الاثیر جزری

الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی :- علاء الدین ماردی

الجواہر المضیئۃ :- حافظ عبدالقادر قریشی

حجۃ اللہ البالغہ :- شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

حسن التقاضی :- محدث کوثریؒ

حسن المحاضرہ :- حافظ سیوطیؒ

الحطہ بذکر الصحاح الستہ :- نواب صدیق حسن خان

حلیۃ الاولیا :- حافظ ابونعیم اصبہانی

الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی :- محدث کوثری

الخیرات الحسان :- حافظ ابن حجر مکی

الدرر المنیفہ فی اولۃ مذہب الامام ابی حنیفہ۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی

الرحمۃ الغیثیہ :- حافظ ابن حجرؒ

الرسالہ :- امام شافعیؒ

زہر الربیٰ علی المجتبیٰ :- علامہ سیوطی

زاد المعاد :- حافظ ابن قیم

سنن بیہقی وسنن دارمی :- مسند دارمی

سنن دارقطنی :-

سیر اعلام النبلاء :- حافظ ذہبی

سیرۃ النعمان (اردو) مولانا شبلی نعمانی

السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی :- دکتور مصطفیٰ السباعی

سیرۃ النبی (اردو) مولانا شبلی نعمانی و مولانا سید سلیمان ندوی

شرح معانی الآثار :- امام طحاویؒ

شذرات الذہب :۔ علامہ ابن العماد حنبلی

شروط الائمۃ الخمسۃ :۔ حافظ ابوبکر حازمی

شروط الائمۃ الستہ :۔ حافظ مقدسی

شرح نخبۃ الفکر :۔ حافظ ابن حجر

شرح سفر السعادۃ (فارسی) شیخ عبدالحق دہلوی

شرح سنن ابن ماجہ :۔ علامہ سندی

شرح زرقانی علی مؤطا مالک

شروح اربعہ بر جامع ترمذی

شرح مسلم :۔ امام نووی

صحاح ستہ

طبقات ابن سعد

طبقات الشافعیۃ الکبریٰ :۔ علامہ تاج الدین سبکی

طبقات الفقہاء :۔ علامہ شیخ ابو اسحٰق شیرازی

ظفر الامانی :۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی

عجالۂ نافعہ :۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی

عقود الجمان فی مناقب ابی حنیفۃ النعمان :۔
حافظ محمد بن یوسف دمشقی

عون المعبود شرح ابی داؤد

عمدۃ القاری شرح بخاری :۔ علامہ عینی

غایۃ المقصود فی حل ابی داؤد :۔ شمس الحق عظیم آبادی

غایۃ المقصود فی زوائد المسند :۔ حافظ نورالدین ہیثمی

فتح الباری :۔ حافظ ابن حجرؒ

فتح المغیث :۔ حافظ سخاوی

فیض الباری :۔ مولانا انور شاہ

فتح الملہم :۔ مولانا شبیر احمد عثمانی

الفوائد البہیۃ :۔ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی

الفہرست :۔ لابن الندیم

فتح القدیر :۔ شیخ ابن ہمام

قرۃ العینین :۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

القاموس المحیط :۔ علامہ مجدالدین فیروز آبادی

منتخب کنز العمال :۔ شیخ علی متقی

الکوکب الدری :۔ حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا
محمد زکریا صاحب

کتاب العلل :۔ امام ترمذی

کتاب الاستغاثۃ :۔ حافظ ابن تیمیہ

کشف الظنون :۔ ملا کاتب چلپی

الکفایہ :۔ خطیب بغدادی

کلمات طیبات :۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

لامع الدراری :- مولانا محمد زکریا صاحب

لسان المیزان :- حافظ ابن حجر

الموافقات :- امام شاطبی

المستدرک :- امام حاکم

الملل والنحل :- ابن حزم ظاہری

مناقب مالک :- امام رازی

مصفیٰ (فارسی) :- شاہ ولی اللہ

مسند احمد :- امام احمد

منیۃ الالمعی :- قاسم بن قطلوبغا

منہاج السنۃ :- حافظ ابن تیمیہ

معارف السنن :- مولانا محمد یوسف بنوری

میزان الاعتدال :- علامہ ذہبی

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ :- ملا علی قاری

ما تمس الیہ الحاجۃ :- مولانا عبدالرشید نعمانی

المقاصد الحسنۃ :- حافظ سخاوی

معجم البلدان :- یاقوت حموی

مناقب للامام الاعظم :- صدر الائمہ موفق بن احمد مکی

المیزان الکبریٰ :- امام عبدالوہاب شعرانی

مقدمہ ابن صلاح

مسک الختام :- نواب صدیق حسن خان

مجمع بحار الانوار :- شیخ طاہر پٹنی

مفتاح السنۃ :- استاذ خولی

المنتظم :- علامہ ابن جوزی

نصب الرایہ :- علامہ زیلعی

نیل الاوطار :- قاضی شوکانی

نیل الفرقدین :- مولانا انور شاہ کشمیری

الوابل الصیب :- حافظ ابن قیم

وفیات الاعیان :- لابن خلکان

الیانع الجنی فی اسانید شاہ عبدالغنی

(نوٹ) مندرجہ بالا کتب کے علاوہ دیگر مراجع کو اختصار کے پیش نظر ترک کر دیا گیا۔

پندرھویں صدی ہجری کے لئے مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ العالی کا ایک عظیم تحفہ
ایک حیات آفریں پیغام

تاریخ دعوت وعزیمت

(چھ حصّوں میں)

حصّہ اوّل: پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ؛ نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ۔

حصّہ دوم: جس میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی سوانح حیات، ان کے صفات و کمالات، ان کی علمی و تصنیفی خصوصیات، ان کا تجدیدی و اصلاحی کام اور ان کی اہم تصنیفات کا مفصل تعارف اور ان کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے حالات۔

حصّہ سوم: حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے سوانح حیات، صفات و کمالات، تجدیدی و اصلاحی کارنامے، تلامذہ اور منتسبین کا تذکرہ و تعارف۔

حصّہ چہارم: یعنی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۹۷۱ھ-۱۰۳۴ھ) کی مفصل سوانح حیات۔ ان کا عہد اور ماحول، ان کے عظیم تجدیدی و انقلابی کارنامے کی اصل نوعیت کا بیان، ان کا اور ان کے سلسلے کے مشائخ کا اپنی اور بعد کی صدیوں پر گہرا اثر اور ان کی اصلاحی و تربیتی خدمات۔

حصّہ پنجم: تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ، احیائے دین، اشاعت کتاب و سنت، اسرار و مقاصد شریعت کی توضیح و تنقیح۔ تربیت و ارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تشخص کے بقا کی ان عہد آفریں کوششوں کی روداد، جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف و خلفا کے ذریعے ہوا۔

حصّہ ششم: حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے مفصل سوانح حیات، آپ کے اصلاحی و تجدیدی کارنامے اور غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد و تنظیم، اصلاح و تجدید اور احیائے خلافت کی تاریخ۔
(دو جلدوں میں مکمل)

ناشر: فضلِ ربّی ندوی
مجلسِ نشریاتِ اسلام ۱-کے-۳ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸